مطالعہ تہذیب

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

(سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی)

قرطاس

يَلُوحُ الخطُّ في القِرطَاس دهراً
وكاتبهٗ رَميمٌ في الترابِ

[تحریر کاغذ (قرطاس) میں عرصہ تک چمکتی رہتی ہے
جب کہ اسے لکھنے والا مر کر مٹی میں بوسیدہ ہو جاتا ہے]

مطالعہ تہذیب

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

(سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی)

قرطاس

فہرست مضامین

پیش گفتار

مختلف تہذیبوں کا مطالعہ جتنا دلچسپ موضوع ہے اتنا ہی نظر انداز کیا گیا ہے۔ نظر انداز ان معنوں میں کہ ہمارے مصنفین نے اس موضوع پر کم سے کم لکھا ہے۔ تہذیبی تاریخ خواہ مسلمانوں کی ہو یا دیگر اقوام کی، جتنی مالا مال ہے اُتنا ہی بہ زبان اردو اس پر مواد کم ہے۔ اردو کے آغاز کو زمانہ گذر گیا ہے، لہٰذا اس کی 'کم سنی' کو بھی جواز نہیں بتایا جاسکتا، یہ ہماری کم ہمتی، سستی اور کوتاہی ہے کہ اس اہم موضوع پر لکھنے والے پوری ''اردو دنیا' میں شاید چند سے زیادہ نہیں، پھر یہ بھی کہ اسلامی تہذیب پر اگر لکھا گیا تو لکھنے والے عموماً خاص دینی اور مسلکی زاویۂ نظر سے لکھتے رہے یا تبلیغی اور دعوتی مقاصد کے پیش نظر۔ اسے تاریخی اور سماجی بحثوں کے ساتھ لکھنے کی ضرورت آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

راقمہ شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی سے ۱۹۸۷ء سے دسمبر ۲۰۱۴ء یعنی تقریباً اٹھائیس برس وابستہ رہی اور کئی برسوں تک ایم۔ اے فائنل کے طلبہ و طالبات کو 'اسلامی تہذیب وتمدن' کا مضمون پڑھاتی رہی، اس حوالے سے مواد کی دستیابی کا مسئلہ ہمیشہ طلبہ کو درپیش رہا۔ زیر نظر کتاب، اسی نصابی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی، جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا، ۲۰۰۷ء میں دوسرا ایڈیشن چند ابواب کے اضافے کے ساتھ شائع ہوا، جس پر اس کتاب کو صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔ دوسرا ایڈیشن بھی چار سال پہلے ختم ہوگیا اور اس کے تیسرے ایڈیشن کا

مطالبہ ہونے لگا۔ اب تیسرا ایڈیشن دو مزید ابواب ''اسلام کا عدالتی نظام'' اور ''شریعتِ اسلامی کے مآخذ'' کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ پوری کتاب پر ایک ناقدانہ نظر ڈال کر ضروری تصحیحات بھی کر دی گئی ہیں۔

امید ہے یہ کتاب عام قارئین کے ساتھ ساتھ شعبہ اسلامی تاریخ کے طلبہ کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔

نگار سجاد ظہیر

۲۶ رمئی ۲۰۱۶ء

کراچی

پہلا باب:

انسان کی تاریخ

پہلے انسان کے بارے میں سائنس ابھی تک کوئی حتمی اور شافی جواب فراہم نہیں کر سکی ہے۔ اولین انسان تو رہا ایک طرف، سائنس ابھی تک اولین جرثومہ حیات کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ یورپ، امریکہ اور جدید علوم وفنون کے ماہر ممالک ابھی تک پہلے انسان کی بابت تلاش میں سرگرداں ہیں، وہ کون تھا؟ اس کی پیدائش کیسے عمل میں آئی؟ اور کب یہ واقعہ یا حادثہ یا اتفاق رونما ہوا؟

سائنس کے اس عقدہ لاینحل کو قرآن چودہ سو سال قبل آشکار کر چکا ہے۔ لہٰذا پہلے انسان اور اس کی تخلیق کے بارے میں ہماری معلومات نہایت واضح اور مکمل ہیں۔ پہلا انسان آدم تھا۔[1] جنہیں اسی وجہ سے "ابوالبشر" کہا جاتا ہے اور جو خلیفۃ اللہ فی الارض اور پہلے نبی تھے۔

جنات اور ملائکہ کی تخلیق آدم سے قبل ہو چکی تھی۔ آدم کا قالب خشک گارے کی سیاہ مٹی سے تیار کیا گیا تھا جو ہر طرح کا تطوّر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور پھر پختہ ہونے پر اس میں اللہ کی روح سے جان پھونک دی گئی۔ وہ عنصر جس سے آدم خاکی کی تخلیق عمل میں آئی، مٹی ہے یا ایسا مادہ جو زمین سے حاصل کیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں تخلیق انسانی کے مختلف مراتب جو مختلف جگہوں پر بیان کیے گئے ہیں ان کی سلسلہ وار ترتیب مختلف مقامات کی تصریحات کو جمع کرنے سے یوں بنتی ہے۔

تراب ۲: یعنی مٹی یا خاک

طین ۳: یعنی گارا جو مٹی میں ملا کر بنایا جاتا ہے۔

طین الازب ۴: لیس دار گارا جس کے اندر باسی ہونے کے سبب لیس پیدا ہو جائے۔

حماء مسنون ۵: وہ گارا جس کے اندر بو پیدا ہو جائے۔

صلصال من حماء مسنون کالفخار ۶: یعنی وہ سڑا ہوا گارا جو سوکھنے کے بعد پکی ہوئی مٹی کے ٹھیکرے جیسا ہو جائے۔

بشر ۷: جو مٹی کی اس آخری صورت سے بنایا گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روح پھونکی اور جس کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔

جب مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آدم کی تخلیق مکمل ہوگئی تو انہیں اشیاء کا علم دیا گیا یہ اللہ کی ایسی نعمت تھی جو آدم کو عطا کی گئی، فرشتوں کو نصیب نہیں تھی۔ کچھ عرصہ آدم تنہا زندگی بسر کرتے رہے تاہم فطری طور پر وہ اپنے کسی ہم جنس کی ضرورت محسوس کرتے تھے لہٰذا اس صورت کو بھی اللہ نے پورا کیا اور دوسرا انسان جو تخلیق ہوا وہ جسمانی تغیر کے ساتھ بی بی حوا (Eve) تھیں۔

> ''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔'' (الاعراف)

حوا کی تخلیق کے بارے میں قرآن تفصیل نہیں بتاتا۔ اس ضمن میں دو آرا ملتی ہیں۔ ایک رائے جو کہ بائبل میں مذکور ہے، یہ ہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ بخاری اور مسلم کی روایتوں میں بھی یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔

> ''عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔'' (حدیث)

اس حدیث کا مطلب ابن اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ حوا، آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں۔ مگر ابن اسحاق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبی نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں

کہ اس حدیث میں دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کا حال بھی پسلی جیسا ہی ہے اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرنا چاہئے۔8

اس سلسلے کی دوسری رائے یہ ہے، اور بیشتر محققین اسی رائے کی طرف مائل ہیں کہ آدم ہی کی طرز پر اس کے جوڑے کے طور پر اللہ نے ہی حوا کو بھی تخلیق کیا ہو۔ آدم و حوا، یعنی پہلے اور دوسرے انسان کی تخلیق کے بعد، اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت ان کے اندر رکھ دی کہ ان سے افزائش کا سلسلہ چلے۔ لہٰذا تب سے آج تک نسل انسانی کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔

''اس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔'' (السجدہ)

یہ اور اسی طرح کے دوسرے قرآنی بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے انسان کو براہ راست تخلیقی عمل (Direct Creation) سے پیدا کیا گیا اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر یہ صلاحیت اور طاقت رکھ دی گئی کہ اس کے نطفے سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔

ڈارون کی تھیوری کے بعد بظاہر یہ ایک غیر سائنٹفک نظریہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اولین جرثومہ حیات کی تخلیق۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جہاں آ کر سائنس کی گاڑی رک جاتی ہے۔ اس اولین براہ راست تخلیق کو اگر نہ مانا جائے تو پھر یہ احمقانہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ زندگی کی ابتداء محض ایک حادثے کے طور پر ہوئی ہے۔ حالانکہ انسان تو رہا ایک طرف اگر ہم کسی ''یک خلیہ جاندار'' (Uni Cellular) کو ہی دیکھیں تو زندگی کی یہ سادہ ترین صورت بھی اس قدر پیچیدہ باریکیوں اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے محض ایک حادثہ یا اتفاق قرار دینا قطعی نا قابل یقین ہے۔ اگر ایک دفعہ آدمی یہ بات مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا تو پھر آخر یہی بات ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے براہ راست تخلیقی عمل سے پیدا ہوا اور پھر اس کی نسل، تناسل (Procreation) کی

مختلف صورتوں سے چلی۔ [9]

یہ درست ہے کہ سائنسدان ابھی پوری طرح اس بات کا ادراک نہیں کر سکے ہیں کہ مواد ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا؟ پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کس طرح ہوئی؟ اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی؟ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز آج سائنسی ادراک کی گرفت میں نہ ہو اس کے ساتھ کل بھی یہی معاملہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ آنے والی صدیوں میں سائنس اس عقدہ کو حل کر لے۔ لیکن کسی ایک آفاقی نظریئے کو ہم محض اس لئے نہیں جھٹلا سکتے کہ وہ سائنس کی پہنچ سے ہنوز باہر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے طاعون کی بیماری قدیم زمانے میں بھی موجود تھی لیکن لوگ اسے بیماری کے طور پر نہیں بلکہ ''عذاب الٰہی'' کے طور پر جانتے تھے۔ لیکن چودھویں صدی عیسوی میں اسے مسلمان طبیبوں نے متعدی مرض قرار دیا، اس کی علامات، احتیاطی تدابیر، اور علاج وغیرہ تجویز کیے۔ [10] طاعون جسے میڈیکل سائنس نے متعدی مرض کے طور پر چودھویں صدی عیسوی میں متعارف کرایا، کیا اس سے قبل دنیا میں موجود نہیں تھا؟ یقیناً تھا۔ سائنس نے اس کا ادراک دیر سے کیا۔ اسی طرح یہ قرآنی نظریات، مزید سائنسی دریافتوں، ایجادوں اور انکشافات کے بعد زیادہ بہتر طریقے سے سمجھے جا سکیں گے۔

آدم و حوا سے جس نسل انسانی کی ابتداء ہوئی وہ بتدریج بڑھتی اور پھیلتی رہی جس کے نتیجے میں مختلف خاندان اور قبائل وجود میں آتے رہے اور زمین آہستہ آہستہ ان سے آباد ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اولاد آدم میں بگاڑ پیدا ہونے لگا اور انہوں نے بتوں کو پوجنا اور شرک کرنا عام کر دیا اور من حیث القوم دیگر اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو گئے تو ان کی ہدایت کے لئے حضرت ادریسؑ کو منتخب کیا گیا۔ انہوں نے پھر سے اولاد آدم کو توحید کا پیغام دیا نسل انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ وہ ۳۵۳ سال تک نسل انسانی پر حکمران رہے۔ [11] ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں تمدن نے خاص ترقی بھی کی۔

چند صدیوں میں نسل آدم میں پھر گمراہی اور بے راہ روی پیدا ہونے لگی۔ حضرت ادریسؑ کی پھیلائی ہوئی توحید کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی، ایک اللہ کے بجائے غیر اللہ کی

اطاعت و پرستش قومی شعار بننے لگا لہٰذا سنت اللہ کے مطابق، ان کی ہدایت کے لئے انہی میں سے حضرت نوحؑ کو مبعوث کیا گیا، جنہوں نے جادہ حق کی طرف اپنی قوم کی راہنمائی کی لیکن ان کی قوم نے انہیں جھٹلایا، اور ان کی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑا تو طوفان بلا خیز کی صورت میں عذاب خداوندی نے ان کو آلیا [۱۲] اور وہ سب غرق کر دیئے گئے سوائے ان چالیس ہدایت یافتہ لوگوں کے جنہوں نے کشتی نوح پر پناہ لی۔ اسی کشتی پر اللہ کے حکم کے مطابق حضرت نوح نے ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا بھی رکھ لیا تھا۔

گویا اولاد آدم کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا، ان کرتوتوں کے عوض جو انہوں نے اپنا رکھے تھے۔ پھر اس دنیا کو دوبارہ سے آباد کیا گیا ان چالیس مرد و زن سے جو اہل ایمان تھے اور ان جانوروں کے جوڑوں سے جنہیں حضرت نوحؑ بچا لائے تھے۔ اسی لئے حضرت نوحؑ کو "آدم ثانی" بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے تین بیٹے حام، سام اور یافث تین بنیادی انسانی نسلوں کے بانی تھے۔ ابتداء میں ان کا مسکن ایک تھا۔ [۱۳] ان کے خاندانوں کے مجموعوں نے معاشروں کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کی وجہ سے، نیز بہتر تلاش معاش کی غرض سے مختلف خاندانوں نے زمین کے مختلف خطوں کی طرف ہجرت کی۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے قدیم وطن کو خیر باد کہا وہ غالباً حامی نسل (*Hamitic*) کے لوگ تھے۔ اس کے بعد یافثی نسل (*Japhetic*) کا ایک خاندان جو تورانی کہلاتا تھا، اپنے ابتدائی مسکن سے نکلا، ان میں سے بعض شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق میں پھیل کر موجودہ منگولی (*Mangolian*) شاخ کے مورث اعلیٰ بنے۔ اسی کی ایک اور شاخ مغرب کی طرف نکلی اور آذر بائیجان، ہمدان اور گیلان میں آباد ہوگئی، جو بحیرہ خزر کے جنوب مغرب میں ہیں اور جو قدیم تاریخ میں ماد (*Media*) کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ اس شاخ کے ایک حصے نے کچھ مدت کے بعد سرزمین بابل کے زرخیز میدانوں میں جا کر اپنے سے پہلے کی حامی نو آبادیوں کو مسخر کیا اور رفتہ رفتہ ان میں مل جل کر اکادی قوم (*Accadian*) کی شکل اختیار کر لی جسے یہودیوں اور عیسائیوں کی

مذہبی کتابوں میں کوشی (Kushite) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخلوط نسل نے بابل کی بنیاد ڈالی اور ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جو اپنی بلند سطح پر فطرت پرستانہ وحدت الوجودیت سے مشابہہ تھا لیکن زیریں سطحوں پر اس میں ہمہ دیوات کا عقیدہ تھا، اور سورج اور چاند دیوتاؤں کی پوجا تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ لنگ پوجا تھی، جنسی خواہشوں کی تسکین کرنے والی رسمیں تھیں، بچوں کی قربانیاں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسمیں تھیں۔ چنانچہ بابل کا مذہب ایسے معاشرے کا مذہب تھا جس میں ایک طرف تو اعلیٰ درجہ کی مادی ترقی تھی اور دوسری طرف پرلے درجے کی نفسانیت پرستی اور خون آشامی، جسے مذہب کی سند قبولیت حاصل تھی۔[۱۴]

اس کے بعد جس شاخ نے اپنے ابتدائی مسکن (باختر، ام البلاد) سے کوچ کیا وہ سامی نسل (Semitic) تھی۔ یہ بھی تورانیوں کے نقش قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور اغلب ہے کہ (Mesopotamia) بین النہرین کے ڈیلٹا کے شمالی حصہ میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انہوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے سلطنت بابل کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کا سکہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ اشوریوں کی اس سلطنت میں جو مذہب رائج تھا وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصور توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔[۱۵]

سب سے آخر میں جس شاخ نے اپنے تنے سے جدا ہونا منظور کیا وہ نسل یافث تھی، جو حامی اور سامی خاندانوں کے چلے جانے کے باوجود اپنے اصل وطن میں مقیم رہی اور اپنے طور پر نشو و نما پاتی رہی تھی۔ پھر ان میں مہاجرت کی حرکت دکھائی دیتی ہے۔ یافث نسل کے مختلف خاندان یکے بعد دیگرے ام البلاد سے نکلے اور بالآخر صرف خالص آریا لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔[۱۶]

اس طرح اولاد آدم خدا کی زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہوتی چلی گئی۔ جنہوں نے مختلف معاشروں کی بنیاد رکھی اور ان معاشروں میں مختلف النوع تہذیبوں کو جنم دیا۔ ابتدائی مذہب اسلام نے متعدد شکلیں بدلیں۔ ہر دفعہ جب بھی اولاد آدم بگاڑ کا شکار ہوتی، اس پر انبیاء

مبعوث کیے جاتے رہے، جو جادہ حق کی طرف ان کی رہنمائی کرتے، تو میں کچھ عرصہ صراط مستقیم پر رہتیں، پھر ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا۔ پھر کوئی ڈرانے والا اور خبردار کرنے والا مبعوث کیا جاتا، یوں زمانوں پر زمانے اور صدیوں پر صدیاں گزرتی رہیں یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی آ گئی، یہ صدی بھی بدقسمتی سے قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کی صدی تھی (جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں تفصیل سے کیا جائے گا) اور جو ایک سراج منیر کی متقاضی تھی۔

❧ ♦ ☙

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ محمد عبدہ اپنی تفسیر المنار میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان اس خطہ زمین پر ہبوط آدم سے قبل بھی موجود تھے اور ان میں خونریزی اور فساد رواج پا چکا تھا، جس کی طرف ملائکہ نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن قرآنی آیات سے ایسے کسی نتیجے پر پہنچنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن خود اس پر شاہد ہے کہ آدم اولین تخلیق تھے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے ''ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔'' (الاعراف)
اس نوعیت کا بیان سورۃ الحجر میں بھی ہے ''اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے اور ہم ''جن'' کو اس سے قبل جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے۔'' (سورۃ الحجر)
اگر آدم سے قبل نوع انسانی وجود میں آ چکی تھی تو قرآن اس کی بھی ضرور وضاحت کرتا جس طرح جنوں اور ملائکہ کے ضمن میں وضاحت ملتی ہے کہ وہ تخلیق آدم سے قبل وجود میں آ چکے تھے۔

۲۔ آل عمران: ۵۹۔

۳۔ السجدہ: ۷۔

۴۔ الصافات: ۱۱۔

۵۔ الحجر: ۲۸-۲۹۔

٦ الرحمٰن: ۱۴۔

٧ صٓ: ۷۱-۷۲۔

٨ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ص ۳۰ (بحوالہ فتح الباری)۔

٩ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ۴، ص ۴۰۔

١٠ ٹی۔ آرنلڈ، دی لیگسی آف اسلام، لندن، ص ۴۷۵۔ (مشہور عرب مدبر، مورخ اور طبیب ابن خطیب غرناطی (۱۲۷۴ء-۱۳۱۳ء) نے اپنے مشہور رسالہ ''طاعون'' میں اس وباء کی پوری کیفیت لکھی ہے۔)

١١ حضرت ادریسؑ کے زمانے میں اختلاف ہے۔ بعض انہیں حضرت نوحؑ سے مقدم مانتے ہیں اور بعض انہیں حضرت نوحؑ کے بعد کے زمانے کا بتاتے ہیں۔ تاہم مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگ کا نام حنوک یا اخنوخ (Enoch) بتایا گیا ہے وہ یہی حضرت ادریسؑ ہیں۔ حضرت ادریسؑ کا (اگر ان کا عبرانی نام (Enoch) تسلیم کرلیا جائے) حضرت آدمؑ کی ساتویں پشت میں ہونا، حضرت نوح کا آٹھواں پر دادا ہونا، اور ۳۶۵ سال کی عمر پانا بائبل سے ماخوذ ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ادریس کا تذکرہ دو مقامات پر آیا ہے۔ سورہ مریم اور سورہ انبیاء میں، ان قرآنی بیانات سے ان کی نبوت کا پتہ تو چلتا ہے لیکن ان کا عرصہ متعین نہیں ہو پاتا۔

١٢ سورۂ ہود۔

١٣ امیر علی، سیّد، اسپرٹ آف اسلام، ص ۷، ''باختر'' (Bactria) کی سطح مرتفع کو، جسے عرب جغرافیہ دانوں نے ''ام البلاد'' کا موزوں نام دیا، نوع انسانی کا گہوارہ، مذہبوں اور قوموں کا مرزبوم خیال کی جاتی ہے۔

١٤ امیر علی، سیّد، اسپرٹ آف اسلام، اردو ترجمہ روح الاسلام، مترجم محمد ہادی حسین، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۸۔

١٥ ایضاً، (حضرت ابراہیم بھی اشوری النسل تھے۔)

١٦ ایضاً، ص ۹۔

دوسرا باب:

تہذیب کیا ہے؟

''تہذیب''، ''تمدن'' اور ''ثقافت'' عربی زبان کے ایسے الفاظ ہیں جو بعینہٖ اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں۔لفظ تہذیب کا مادہ ''ہ ذ ب'' ہے۔ہذب کے معنی صاف کرنا، درست کرنا، پودوں اور درختوں کی شاخ تراشی کرنا، ھذب الشعر یعنی شعر کی اصلاح کرنا، ھذب الرجل یعنی پاکیزہ اخلاق والا بنانا [1]، مہذب یعنی پاکیزہ اخلاق والا۔اس عربی لفظ کو اردو زبان نے اس کے معنوں سمیت اختیار کیا ہے۔لہٰذا اردو زبان میں بھی تہذیب کے معنی پاک کرنا، اصلاح کرنا، درستگی، آراستگی، شائستگی اور خوش اخلاقی وغیرہ کے لئے جاتے ہیں۔

اصطلاحاً تہذیب سے مراد انسان کا نظام فکر ہے۔یعنی انسان کے وہ عقائد، نظریات و افکار جن سے اس کی شخصیت بنتی اور سنورتی ہے۔اس کے خیالات جتنے زیادہ پاکیزہ، روشن اور سلجھے ہوئے ہوں گے وہ معاشرے کا اتنا ہی مہذب شخص متصور ہوگا۔تہذیب کا تعلق انسانی فکر و خیال اور ذہن سے ہوتا ہے اس اعتبار سے تہذیب کی کیفیت نظریاتی، فکری، روحانی اور غیر مادی ہوتی ہے۔

تہذیب کے مترادف ایک اور لفظ ''ثقافت'' استعمال ہوتا ہے۔تاہم اس کے لغوی معنوں میں تھوڑا فرق ہے۔ثقف معنی ذہین ہونا، ہوشیار و دانا ہونا۔ثقف الولد معنی لڑکے کو مہذب بنانا، تربیت دینا، تعلیم دینا، اسی طرح امراۃ (ثقاف) معنی بہت ذہین عورت کے ہیں۔[2] اس لفظ کو بھی اردو زبان نے تقریباً انہی معنوں میں اپنا لیا ہے لہٰذا اردو میں اس کے معنی عقل مند

ہونے کے ہیں۔ یوں ثقافت کا تعلق بھی براہ راست ذہن سے بنتا ہے اور اصطلاحاً یہ لفظ تہذیب کے مترادف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض علماء ان دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کے متقابل سمجھتے ہیں جیسے کہ جمیل جالبی تہذیب کا تعلق انسان کے ظاہر سے بتاتے ہیں اور ثقافت کو روحانی اور باطنی حیثیت دیتے ہیں گویا ان کے نزدیک تہذیب، ثقافت کے برعکس ہے۔[۳] حالانکہ اگر دونوں کے لغوی معنوں پر غور کیا جائے تو یہ تضاد غلط نظر آتا ہے۔ لسان العرب میں بھی ثقافت کے معنی علوم وفنون وادبیات پر قدرت ومہارت، کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے بتائے گئے ہیں۔ اس لفظ کا تعلق بھی تہذیب کی طرح انسان کے ذہنی کارناموں سے ہے۔

تہذیب و ثقافت کے مقابل ''تمدن'' اور ''حضارت'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ تمدن کا مادہ ''م دن'' ہے۔ مدن کے معنی قیام کرنا اور مدّن کے معنی شہر بنانا یا شہر آباد کرنا اور تمدن کے معنی شائستہ ومہذب ہونا۔[۴] تمدن کا لفظ اردو میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یعنی مل کر رہنے کا طریقہ۔ طرز معاشرت، یا انسان کا بڑے بڑے گروہوں میں مل کر ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنا تمدن کہلاتا ہے۔

اصطلاحاً تمدن کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ تمدن وہ نظام عمل ہے جو انسان کے نظام فکر (تہذیب) کے تابع ہوتا ہے۔ تمدن کا تعلق چونکہ انسانی افکار وخیال کے تحت سرزد ہونے والے ظاہری اعمال سے ہے لہٰذا اس کی حیثیت عملی، ظاہری اور مادی ہوتی ہے۔

تمدن کے مترادف دوسرا لفظ ''حضارت'' ہے اس کا مادہ ''ح ض ر'' ہے۔ حضر معنی موجود ہونا، حاضر ہونا اور حضارہ کے معنی شہر میں رہنے کے ہیں اور حضارہ یعنی شہر کی بود وباش۔[۵] اردو زبان نے اس لفظ کو بھی انہی معنوں سمیت اپنے اندر سمیٹ لیا ہے، لہٰذا اردو میں بھی ''حضارت'' کا لفظ شہری زندگی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شہر بنانے اور بسانے کا تعلق براہ راست عمل سے ہے لہٰذا تمدن وحضارت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نظر آنے والی وہ عملی اور مادی چیز ہے جس کا انسان مشاہدہ کر سکتا ہے جبکہ تہذیب کو یا تو محسوس کیا جا سکتا ہے یا سمجھا جا سکتا

ہے، مشاہدہ کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔

اب تک کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تہذیب (و ثقافت) اور تمدن (و حضارہ) میں ایک اعتبار سے فرق ہے۔ تہذیب کا تعلق انسانی فکر و خیال اور عقائد و نظریات سے ہے جب کہ تمدن کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے۔ تاہم تہذیب و تمدن ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور تلازمہ کی یہ صفت ان کو ایک کر دیتی ہے۔ تمدن دراصل تہذیب کا نتیجہ ہے، بالفاظ دیگر، تمدن، تہذیب کا عملی مظاہرہ ہے جب تک تہذیب (نظام فکر) نہیں ہوگی تب تک تمدن (نظام عمل) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ روح اور جسم کے مانند ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور تلازمہ کی یہ صفت ان کو ایک کر دیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تہذیب و تمدن کے لئے ہم ایک ہی لفظ اختیار کر سکتے ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب اثبات میں ہونا چاہئے۔ اور وہ لفظ "تہذیب" ہے جس میں مادی اور غیر مادی دونوں پہلو شامل ہوں گے۔

انگریزی زبان میں تہذیب کے مترادف کلچر (*Culture*) اور تمدن کے مترادف (*Civilization*) کے الفاظ مستعمل ہیں۔ لفظ کلچر ابتداء میں صرف کاشتکاری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ سترہویں صدی عیسوی تک یہ لفظ درختوں کی نشو و نما اور کاشتکاری کے لئے استعمال ہوتا رہا۔[6] اس کے بعد یہ جانوروں اور قدرتی پیداوار جیسے ریشم (*Silk*) کی نشو و ارتقاء کے لئے استعمال ہونے لگا۔[7] اس کے بعد اس لفظ کے معنوں میں مزید تبدیلی آئی اور یہ انسانی جسم کی تربیت کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اس لفظ کے وہ معنی اختیار کیے گئے جو آج بھی ہیں۔ یعنی کلچر کا لفظ تہذیب کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔[8] اصطلاحاً کلچر کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ بھی تہذیب کی اصطلاحی تعریف کے قریب قریب ہے۔

ماہرین عمرانیات نے کلچر کی کئی تعریفیں بیان کی ہیں تاہم *E. B. Tylor* کی بیان کردہ تعریف سے بیشتر ماہرین عمرانیات مطمئن نظر آتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخری ربع میں وضع کی گئی تھی، جس کی رو سے "کلچر ایسا مرکب ہے جس میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، قانون،

رسم ورواج اور دوسری ہر قسم کی صلاحیتیں اور عادتیں جن کا اکتساب انسان، معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کرتا ہے، موجود ہیں۔"[9]

تاہم میرے خیال میں اس سے زیادہ سادہ مگر وسیع المعنیٰ تعریف خود Robert Bierstedt کرتا ہے۔

"کلچر وہ مرکب ہے جو ہمارے نظامِ فکر، نظامِ عمل اور ہر اس چیز پر مشتمل ہے جو معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ہم میں موجود ہے۔"[10]

کلچر کی طرح ہی لفظ Civilization میں بھی معنوں کے اعتبار سے واضح ارتقائی منازل نظر آتی ہیں۔ یہ لفظ اٹھارویں صدی تک "قانون یا انصاف" کے لئے بولا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ لفظ "انسانی معاشرے کی ترقی یافتہ شکل، (A developed or advanced state of human society) کے طور پر بولا جانے لگا۔[11] ان معنوں میں Civilization کا لفظ تمدن کے مترادف نظر آتا ہے۔

جس طرح ہم نے تہذیب اور تمدن کے لئے ایک ہی لفظ "تہذیب" منتخب کر لیا ہے اسی طرح اب ماہرین عمرانیات کلچر اور سویلائزیشن کے لئے ایک ہی لفظ "کلچر" استعمال کرنے لگے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق کلچر، سویلائزیشن کی ترقی یافتہ شکل ہے اور تمدن رفتہ رفتہ تہذیب میں ڈھل جاتا ہے۔

"تہذیب، ترقی یافتہ تمدن کے اس خاص پہلو کو بتاتی ہے، جس کا تعلق حسن، ہم آہنگی، ستھرا پن اور پاکیزگی سے ہے۔"[12]

اس بیان کے مطابق جب تمدن بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو جائے اور اس میں حسن و خوبی نظر آنے لگے تو اس پر تہذیب کا اطلاق ہوگا لیکن یہ بہت مبہم سا وصف اشتراک ہے کیونکہ حسن، خوبی اور پاکیزگی کی تعریف اور اس کے مفہوم جدا جدا ہیں چنانچہ اس کا حکم لگانا کہ کہاں پر پہنچ کر تمدن، تہذیب کے سانچے میں ڈھل گیا، نہایت مشکل ہے۔

جدید ماہرین عمرانیات کلچر اور سویلائزیشن کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم

گردانتے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہے۔ ہرٹن ہنٹ کلچر کو غیر مادی (Non-material) سمجھتا ہے اور سویلائزیشن کو مادی (Material) سمجھتا ہے جو کہ ایک دوسرے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اپنی اس بات کو وہ بیس بال کے کھیل کی مثال سے واضح کرتا ہے۔یعنی بیس بال کے کھیل میں دستانے، بلّا اور کھلاڑی کا لباس وغیرہ مادی کلچر کے کچھ عناصر ہیں جب کہ کھیل کا طرز، کھلاڑی کی توانائیاں، ان کی حکمت عملی اور خاص روایتی انداز غیر مادی کلچر کے عناصر ہیں۔ اب اگر بیس بال کے ''کھیل'' کو بھلا دیا جائے تو بلا (Bat) محض لکڑی کا ایک ٹکڑا رہ جائے گا۔[۱۳]

اس اعتبار سے سویلائزیشن (مادی کلچر) منطقی نتیجہ ہے کلچر (غیر مادی کلچر) کا اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے معنی ہیں۔

حاصلِ بحث:

☆ تہذیب انسان کے نظامِ فکر کو کہتے ہیں، یعنی انسان کے وہ عقائد و نظریات جس سے اس کی شخصیت بنتی ہے۔تہذیب، نظریاتی، فکری، روحانی اور غیر مادی ہوتی ہے۔

☆ ثقافت کا لفظ، تہذیب کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔

☆ انگریزی لفظ ''کلچر'' بھی تہذیب و ثقافت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

☆ اصطلاحاً تمدن انسان کے نظامِ عمل کو کہتے ہیں، جو اس کے نظامِ فکر (یعنی تہذیب کا تابع ہوتا ہے۔تمدن کی حیثیت عملی ظاہری اور مادی ہوتی ہے۔

☆ 'حضارۃ' کا لفظ، تمدن کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔

☆ انگریزی لفظ ''سویلائیزیشن''، تمدن اور حضارۃ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ المنجد، دارالاشاعت، کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء، ص ۱۱۲۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۳۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۴۳۔

۴۔ المنجد، ص ۹۵۲۔

۵۔ المنجد، ص ۲۱۷۔

۶۔ دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوئم، آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۲۴۷۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ *The Training, Development and Refinement of Mind, Taste and Manners, The Intellectual side of Civilization.*

۹۔ Robert Bierstedt, *The Social Order*, P. 127.

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوئم، ص ۴۴۸۔

۱۲۔ انسائکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز، نیویارک، ۱۹۵۱ء، جلد سوئم، ص ۶۲۱۔

۱۳۔ ہرٹن ہنٹ، سوشیالوجی، نیویارک، ۱۹۷۲ء۔

تیسرا باب:

تہذیب کے عناصر تکوینی

تہذیب کی ایک جامع تعریف کے تعین کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ تہذیبیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ وہ کون سے تکوینی عناصر ہیں جن کے ملنے سے انسانی معاشرے بنتے ہیں اور ان معاشروں میں تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں۔ دنیا کی کم و بیش تمام معلوم تہذیبوں کے تشکیلی عناصر تین ہیں۔

۱۔ جغرافیائی عنصر (Geographical factor)

۲۔ حیاتیاتی عنصر (Biological factor)

۳۔ نظریاتی عنصر (Ideological factor)

جغرافیائی عنصر:

کسی جگہ یا مقام کی آب و ہوا، جائے وقوع، زمین کی ساخت اور معدنی وسائل وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ اسے ماحول یا گرد و پیش بھی کہا جا سکتا ہے۔ جغرافیائی ماحول یا گرد و پیش انسان کی جسمانی ساخت، اس کے خیالات و اعمال اور معیشت سب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس موضوع پر غالباً سب سے پہلے بقراط نے یہ کہہ کر روشنی ڈالی۔

"اکثر حالتوں میں آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانوں کا جسم اور اس کی سیرت ملک کی نوعیت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔"[1]

یونانیوں نے نظریہ ماحول کی تائید میں چند محبوب مثالیں دیں مثلاً زیریں وادیٔ نیل کی زندگی نے مصریوں کی جسمانی ساخت، سیرت اور اداروں پر ایک قسم کا اثر ڈالا اور یوریشیا کے صحرائی علاقے کی زندگی نے سیتھیوں کی جسمانی ساخت، سیرت اور اداروں پر بالکل مختلف اثر ڈالا۔[۲]

بطلیموس نے دنیا کے آباد حصہ زمین کو سات قسموں پر تقسیم کیا تھا جن کو "ہفت اقالیم" کا نام دیا جاتا ہے۔ ابن خلدون ان اقالیم پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کرتا ہے کہ ان اقالیم کے باشندوں پر مقامی حالات اور آب و ہوا کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے نزدیک گرم اقالیم (یعنی پہلی اور دوسری اقالیم) کے باشندے سیاہ فام، گھنے بالوں اور وحشی فطرت کے حامل اس لئے ہوتے ہیں کہ وہاں سورج ان کے سروں پر ہوتا ہے اور شدید گرمی کی وجہ سے ان کی کھال سیاہ پڑ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے مزاج میں بھی وحشت اور گرمی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سرد اقالیم (یعنی چھٹی اور ساتویں اقالیم) کے باشندے رنگ میں سرخ و سفید ہوتے ہیں، ان کے بدن پر بال کم، آنکھیں نیلی اور بال بھورے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہوا شدت برودت کی وجہ سے سرد اور ٹھنڈی رہتی ہے اور زیادہ تر موسموں میں سردی شدید پڑتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تیسری، چوتھی اور پانچویں اقالیم کو ابن خلدون مجموعی طور سے "اقالیم معتدلہ" کا نام دیتا ہے۔ اقالیم معتدلہ کے انسان تو انسان، حیوان تک معتدل مزاج کے ہیں۔ ان اقالیم کی آب و ہوا معتدل اور مثالی ہے حد یہ کہ نبوت بھی انہی اقالیم کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان اقالیم کے باشندے اسی اعتدال مزاجی کے باعث درجہ کمال پر ہوتے ہیں۔[۳]

کسی ملک کی طبعی حالت کا اثر وہاں کی معیشت پر بھی پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے جغرافیائی حالات میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ شمالی سرحد کے کوہستانی علاقے اور جنوبی جزیرہ نما کے مغربی اور مشرقی گھاٹوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک مسطح یا کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ چند سرد خطوں سے قطع نظر موسم سال کے ایک حصہ میں معتدل اور دوسرے حصہ میں گرم رہتا ہے۔ بارشوں کی کمی نہیں۔ ملک کے بڑے حصے کی آب و ہوا یکساں کہی جاسکتی ہے لیکن پورے ملک میں سرد ترین سے لے

کر گرم ترین اور مرطوب ترین سے لے کر خشک ترین تک ہر قسم کی آب و ہوا موجود ہے اور زمین کی حالت میں بھی اتنا تنوع ہے کہ قریب قریب ہر قسم کی نباتاتی اور معدنی پیداوار ملک کے اندر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جس ملک میں میدانوں کی کثرت ہو، پانی افراط سے ہو اور سورج سال کے بڑے حصے میں زمین کو حرارت اور زندگی بخشتا ہو وہ زراعت کے لئے خاص طور پر موزوں ہوگا چنانچہ ابتداء سے ہندوستان کا پیشہ زراعت ہے۔[۴] بلکہ علم الاقوام کی تحقیقات کے بعد بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے زراعت ہندوستان میں ہی شروع ہوئی۔[۵] گویا کہ ہندوستان کی طبعی ساخت کا اثر وہاں کے ذریعہ معاش پر پڑا اور اس معیشت کا براہ راست اثر ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن پر پڑا۔ ظاہر ہے کسانوں کی تہذیب، شکاریوں کی تہذیب سے بہت مختلف ہوتی ہے اور ترقی کی ہر منزل پر وہ امن کو جنگ پر اور تعمیر کو تخریب پر ترجیح دیتی ہے۔

پھر یہی نہیں جغرافیائی عنصر کو، تہذیب انسانی کی تشکیل میں اس وقت فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب ''قومی تہذیب'' کا مسئلہ درپیش ہو۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین کا کہنا ہے:

> ''تہذیب کا ترکیبی عنصر جو طبعی ماحول اور سماجی حالات پر مشتمل ہے خواہ نظریاتی عنصر کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو یا نہ ہو لیکن تہذیب میں مقامی رنگ یہی پیدا کرتا ہے۔''[۶]

جغرافیائی عنصر وہ طاقتور عنصر ہے جو انسانی فکر کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کی بہت عام اور مقبول مثال ''وطنیت'' (*Nationalism*) کی ہے۔ ایشیا کے مقابلے میں یورپ میں وطنیت زیادہ قوی اور عام کیوں ہے؟ اس کی وجوہات میں سے ایک وجہ یورپ کے جغرافیائی حالات بھی ہیں۔ ایشیا میں طبعی علاقے زیادہ وسیع، مختلف قسم کی آب و ہوا اور پہاڑوں کی مختلف قسم پر مشتمل ہیں۔ یہ علاقے زیادہ زرخیز ہیں اور ان میں وسائل حیات کی فراوانی ہے اس بناء پر براعظم ایشیا میں مملکت کا میلان فطری طور پر وسعت اور عمومیت کی طرف ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس خطہ زمین پر دنیا کی وسیع ترین سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اس کے برخلاف یورپ میں زندگی کی کشمکش، تنازع للبقاء شدید ہے۔ اس کی آبادی گنجان، علاقے تنگ اور وسائل معیشت محدود ہیں۔

پہاڑوں اور دریاؤں کی طبعی سرحدوں نے مغربی اقوام کو مستقلاً تنگ فطری دائروں میں محصور کر دیا ہے۔ خصوصاً یورپ کا وسطی، مغربی اور جنوبی حصہ وسیع ریاستوں کی نشو و نما کے لئے موزوں نہیں۔ اس لئے قدیم یورپ میں بھی سیاسی تصور، شہری ریاست (City State) سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ جن کا رقبہ چند میل سے زیادہ وسیع نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بالکل خود مختار ہوتی تھیں۔ اس کی اہم مثال یونان ہے، یہاں قدیم ترین عہد سے بیسوں چھوٹے چھوٹے خود مختار شہروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ۷

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ماحول کوئی ساکن عامل نہیں جیسا کہ بعض یونانی دانشور سمجھتے تھے۔ ۸ بلکہ آب و ہوا، علاقے کے جغرافیائی حالات اور زمین کی ساخت وغیرہ میں تبدیلی آتی رہتی ہے گو کہ تبدیلی کا یہ عمل بہت سست اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ افریقہ کا جو صحرا آج ہمیں جھلسا ہوا نظر آتا ہے وہ برفانی دور میں باقاعدہ سیراب ہوتا تھا۔ ۹ پہاڑ شکست و ریخت کے عمل سے گذرتے رہتے ہیں۔ دریا اپنی گذرگاہیں تبدیل کرتا رہتا ہے، سمندر اپنی حدود بدلتا رہتا ہے لیکن یہ سب دنوں، مہینوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوتا ہے۔ ان جغرافیائی تبدیلیوں کا اثر مقامی تہذیبوں میں بھی تبدیلی لاتا ہے۔

بعض ماہرین نے تہذیب کے عناصر تکوینی میں معاشی عنصر (Economical Factor) کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس عنصر کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے بلکہ اس کو جغرافیائی عامل کے تحت لیا جانا چاہئے کیونکہ کسی ملک کی معیشت کیا ہو سکتی ہے اس کا فیصلہ انسان نہیں وہاں کے جغرافیائی حالات کرتے ہیں۔ انسان قدرت کے اس فیصلے کو تبدیل تو کر سکتا ہے لیکن قدرت کے فیصلوں میں اتنی منفعت ہوتی ہے کہ انسان خود ہی اس کو تبدیل نہیں کرتا اور قبول کر لیتا ہے۔ ہندوستان قبل از مسیح میں بھی ایک زرعی ملک تھا، آج ایٹمی طاقت بن جانے کے باوجود اس کی زرعی حیثیت مسلمہ ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ملک کی طبعی حالت ہی ایسی ہے کہ اس کو ایک زرعی ملک ہونا چاہئے۔

حیاتیاتی عنصر:

اسے نسلی عامل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں رنگ، نسل، زبان اور تمام تر وراثتی اور نسلی صلاحیتیں، عادتیں اور خصوصیات شامل ہوتی ہیں جو کہ رسوم و رواج کی صورت میں نسل در نسل چلتی ہیں۔ٹائن بی ان کی تعریف یوں کرتا ہے، ''نسل کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں جو ان کے جانشینوں میں بطور میراث منتقل ہوجاتے ہیں۔'' ۱۰ امتیازی وصف سے مراد محض نفسی خصائص ہی نہیں بلکہ بدیہی جسمانی خصائص بھی ہیں۔

ابن خلدون کا خیال ہے کہ کسی خاندان کے اوصاف چار پشتوں تک چلتے ہیں۔کوئی خاندان مسلسل شرف ونسب کا مالک نہیں رہتا۔ تاہم ابن خلدون اس امر کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ شرف وحسب کی زندگی و بقاء کے لئے چار پشتوں کی حد کوئی قاعدہ کلیہ نہیں،کوئی خاندان اپنا شرف چار پشتوں تک بھی برقرار نہیں رکھ سکتا اور کوئی خاندان یہ سلسلہ پانچویں اور چھٹی پشت تک کھینچ لے جاتا ہے لیکن چار پشتوں کے بعد زوال ضرور شروع ہوجاتا ہے۔۱۱

بہرحال مختلف خاندان یا قبیلے یا نسلیں اپنی جبلی عادتوں، خصلتوں اور قابلیتوں سے تکوین تہذیب کا باعث ہوتی ہیں۔جس طرح جغرافیائی عامل کسی تہذیب کو مقامی رنگ عطا کرتا ہے اسی طرح حیاتیاتی عنصر کسی تہذیب کو دوسری تہذیب سے نمایاں اور ممتاز کرتا ہے۔

جس جسمانی خاصیت پر نسلی نظریات کے مغربی داعی بطور خاص زور دیتے ہیں وہ رنگ ہے۔سفید رنگ کو برتری کا نشان سمجھا جاتا رہا۔شاید اسی لئے ہندوستان میں آنے والے آریاؤں نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کو پنچ اور کمتر سمجھا، کیونکہ وہ نہ گورے چٹے تھے اور نہ آریاؤں کی طرح لمبے چوڑے۔ بعد میں منوشاستر میں ان کو مستقلاً شودر کا درجہ دے دیا گیا۔ تہذیب کے جدید نسلی نظریات میں سب سے ہردل عزیز نظریہ وہ ہے جس میں سفید فام نسل کے سنہرے بالوں، بھوری آنکھوں اور لمبوترے سروالے لوگوں کو تخت برتری پر بٹھایا گیا۔۱۲ جنگ عظیم اول کے بعد بھی اسی قسم کے رجحانات کی لہر نے جرمنوں سے دعویٰ کروایا کہ وہ دنیا کی سب سے برتر اور عظیم قوم ہیں۔اور اس دعویٰ نے ان کے اندر من حیث القوم ایک طرح کا (*National Sentiment*) پیدا کیا۔۱۳

جس طرح سے یورپ کا دعویٰ سفید رنگ کی وجہ سے برتری کا تھا۔ اسی طرح جاپانیوں نے اس غرض کے لئے بالکل مختلف جسمانی معیار مقرر کیا۔ اتفاق یہ ہے کہ جاپانیوں کے جسم غیر معمولی طور پر بالوں سے پاک ہوتے ہیں اور ان کے پڑوس میں شمالی جزیرے میں بالکل مختلف قسم کی قدیم قوم آباد ہے، جس کا جسمانی نمونہ عام اہل یورپ سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے انہیں ''بالوں والے آئینو'' کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر جاپانیوں نے طبعًا بالوں کے نہ ہونے کو روحانی برتری کا نشان قرار دے لیا۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ ویسا ہی بے بنیاد ہے جیسا سفید رنگ کی برتری کا مغربی دعویٰ لیکن سطحی طور پر ان کا دعویٰ ٹائن بی کو زیادہ معقول نظر آتا ہے اس لئے کہ جس انسان کے جسم پر بال نہ ہوں وہ اپنے اس بھائی کے مقابلے میں بندر سے زیادہ دور ہے جس کے بدن پر تھوڑے بہت بال ہوں۔[۱۴]

اس قسم کے نسلی نظریات کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اس امر سے انکار دشوار ہے کہ یہ عامل تکوین تہذیب کا باعث ہوتا ہے۔ کسی خاندان یا قبیلے یا نسل میں احساس کمتری یا احساس برتری کے مہلک جراثیم اس عامل کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس کا اثر ان کے پورے نظام حیات پر پڑتا ہے۔ گویا ایک طرف تو یہ عامل کچھ خیالات و افکار اور کچھ عادات و اطوار اپنے آنے والی نسل کو دیتا ہے جس سے خیالات کی ایک خاص فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ عنصر کسی بھی اجنبی کی شناخت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر پاکستانی معاشرے میں ایک بوٹے قد پیلی رنگت، چھوٹی مگر کھلی آنکھیں اور چپٹی ناک والا اجنبی آجائے تو دیکھنے والا جان سکتا ہے کہ یہ چینی تہذیب کا ایک فرد ہے۔

نیز یہ عنصر انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان رسوم و رواج، اعراف و اقدار کا جو اس کو وراثتی طور پر ملے ہیں، احترام کرے۔ معاشرہ قوت نافذہ کے طور پر کام کرتا ہے اور قوانین کی عدم موجودگی کے باوجود افراد ان رسوم و رواج کی پابندی کرتے ہیں اور ان کا ضمیر اس پر مطمئن ہوتا ہے۔

حیاتیاتی عنصر میں ہم زبان کو بھی شامل کر سکتے ہیں جسے تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھا گیا ہے۔[۱۵] زبان جو کہ انسان کو موروثی طور پر اپنے والدین سے ملتی ہے نہ صرف اس کی شناخت کا ذریعہ ہے بلکہ یہ تہذیب کو بھی زندہ رکھتی ہے کیونکہ تہذیبوں کے حالات، ان کی

ادبیات اور دیگر ایجادات زبان ہی کی وجہ سے محفوظ رہتی ہیں۔ جو زبانیں آج فنا ہو چکی ہیں ان کی تہذیبوں کا بھی نام و نشان مٹ چکا ہے۔

نسلی یا حیاتیاتی عنصر ساکن عامل نہیں ہے لہٰذا نسلوں اور قوموں میں رنگ، زبان اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور اب دنیا میں کوئی قوم یا نسل خالص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بین الاقوامی جنگیں، شادیاں، ہجرتیں اور غلامی وغیرہ ایسے بے رحم عوامل ہیں جنہوں نے رنگ و خون اور زبانوں میں زبردست آمیزش پیدا کر دی۔[۱۶] نسلوں کے خالص ہونے کا تصور بہت ہی ابتدائی زمانوں میں تو تسلیم کیا جا سکتا ہے یا پھر بہت ہی الگ تھلگ معاشروں (Isolated Societies) میں اس کے وجود کو منطقی سمجھا جا سکتا ہے وگرنہ ہر قوم اور ہر نسل، زبان، رنگ، خون اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تبدیلیوں سے دوچار ہوتی ہے۔

حیاتیاتی عنصر نسبتاً کمزور عنصر ہے اور بعض ماہرین کے نزدیک اس کی کوئی جداگانہ حیثیت بھی نہیں کیونکہ اگر ہم "نسل" کے سلسلہ میں ٹائن بی کی تعریف[۱۷] کو معیار قرار دیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "امتیازی وصف" سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد ان کے رسوم و رواج اور عادات و خصائل ہیں جو ان میں من حیث القوم پائے جاتے ہیں تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عادات و خصائل کس کے عطا کردہ ہیں؟ کیا ان کو ان کے طبعی ماحول نے یہ عادت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ یا پھر ان کو ان کے عقائد و نظریات نے یہ امتیازی وصف عطا کیا۔ ان دونوں صورتوں میں حیاتیاتی عنصر کی جداگانہ حیثیت پر ضرب لگتی ہے۔

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ حیاتیاتی عنصر کی اس وقت جداگانہ حیثیت ہو جاتی ہے جب یہ جغرافیائی اور نظریاتی عناصر کے مجموعی اثرات کو قبول کرتے ہوئے وجود میں آتا ہے۔ جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ، جوان و توانا ہونے پر اپنے الگ خاندان کی بناء ڈالتا ہے۔

نظریاتی عنصر:

تکوینِ تہذیب کا یہ انتہائی بنیادی اور اہم ترین عنصر ہے۔ اس میں انسان کا پورا نظامِ فکر،

یعنی حیات و کائنات کے بارے میں اس کے نظریات، اعتقادات اور خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ اعتقادات و نظریات انسانی بھی ہو سکتے ہیں اور الہامی بھی۔ دونوں صورتوں میں اس کو مذہب بھی کہا جا سکتا ہے۔ مذہب کا معاملہ تہذیب کے سلسلہ میں بڑا پیچیدہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مذہب ایک معنی میں تو کل تہذیب پر حاوی ہے اور اس کی تکوین کرتا ہے۔ جبکہ دوسرے معنی میں مذہب محض تہذیب کا ایک جزو ہے۔ اگر مذہب شخصی سطح پر چند رسوم و عادات کا مجموعہ ہو تو وہ تہذیب کا محض ایک جزو ہوگا۔ یہ جزو اہم بھی ہو سکتا ہے اور غیر اہم بھی۔ لیکن اگر مذہب کو اس کے حقیقی معنوں میں لیا جائے جو کہ انسان کو انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات میں راہنمائی فراہم کرتا ہے تب یہ تہذیب کا ایک اہم ترین تکوینی عنصر ہوگا۔

آغاز تہذیب کی بابت دو نظریات ملتے ہیں ایک ''عینی نظریہ'' دوسرا ''مادی نظریہ''۔ عینی نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے ارتقاء کی کسی منزل میں ایک شخص یا کئی اشخاص کو ایک برتر قوت کی طرف سے وحی یا الہام کے ذریعہ سے اقدار اعلیٰ یا اعیان ۱۸ کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ یا وہ اپنے وجدان صحیح سے خود دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر اسی سماجی ماحول میں جو ان کے اردگرد موجود ہے یہ مشاہدہ ایک ''معروضی ذہنی'' ۱۹ شکل اختیار کر لیتا ہے اور جماعت کا نصب العین بن جاتا ہے اور یہ نصب العین اس طبعی ماحول میں، جس میں یہ جماعت رہتی ہے ایک خاص نفسی یا مادی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً اس نظریئے کے مطابق ویدک زمانے میں چند رشیوں کو الہام یا وجدان سے اعیان، کی ایک جھلک نظر آئی۔ جس نے آریا قوم کی اجتماعی حالت اور صلاحیت کے مطابق ایک نصب العین کی شکل اختیار کر لی۔ اس نصب العین کو وادئ سندھ اور وادئ گنگا کے طبعی ماحول میں حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور وہ تصورات و ادارات وجود میں آئے جو مجموعی طور پر ''ویدک تہذیب'' کہلاتے ہیں۔ ۲۰

دوسری طرف مادی نظریہ یہ ہے کہ اصل چیز طبعی ماحول ہے۔ پہلے انسان کی اجتماعی زندگی آب و ہوا، مادی وسائل اور ان آلات کے اثر سے جو پیدائش دولت کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں، ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی بناء پر اصول و ضوابط منضبط ہوتے ہیں اور

پھر ان سے عمل تجرید کے ذریعہ اقدار کے مجرد تصورات بنتے ہیں۔ جن کا مستقل وجود فرض کر کے ہم انہیں ''اعیان'' کہنے لگتے ہیں۔ مثلاً اسی ویدک تہذیب کے بارے میں مادیئین یہ کہیں گے کہ اس کی بنیاد وہ جغرافیائی ماحول خصوصاً وہ زراعتی طرز زندگی تھا جس سے خانہ بدوش آریاؤں کو ہندوستان پہنچ کر سابقہ پڑا اور اسی پر رفتہ رفتہ ان کے مذہب اور سماجی نظام کی عمارت تعمیر ہوئی۔[۱۲]

آغاز تہذیب سے متعلق مندرجہ بالا دونوں نظریات میں نظریاتی، حیاتیاتی اور جغرافیائی عناصر کو تہذیب انسانی کے تشکیلی عوامل کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ فرق صرف تقدم کا ہے۔ عینی نظریہ میں نظریاتی عنصر کو اولیت اور تقدم حاصل ہے تو مادی نظریہ میں جغرافیائی عامل کو نظریاتی عامل سے زیادہ تقدم اور اہمیت ملی ہے۔

اس ضمن میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ جس طرح جغرافیائی عنصر کسی تہذیب میں مقامیت پیدا کرتا ہے وہیں نظریاتی عامل، تہذیبوں میں، آفاقیت پیدا کرتا ہے کیونکہ یہ تصوراتی یا فکری عنصر جو ان خیالات، نظریات اور اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو اقدار اعلیٰ کے شعور سے پیدا ہوتے ہیں، مقام کا پابند نہیں ہوتا بلکہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک قوم سے دوسری قوم میں پہنچ سکتا ہے۔ قدیم اور جدید تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک تہذیب یا فلسفہ زندگی یا سیاسی اصول یا معاشی نظریات پہلے دنیا کے کسی خطے میں جنم لیتا ہے اور پھر دوسرے حصوں میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ مختلف آب و ہوا میں رہنے والی، مختلف نسلی امتیازات رکھنے والی قومیں اسے کلی یا جزوی طور پر اختیار کر لیتی ہیں، تاہم جن مذاہب، یا فلسفہ یا اصول و نظریات کا درجہ زیادہ بلند نہیں ہوتا یا وہ زیادہ ہمہ گیر نوعیت کی نہیں ہوتیں وہ طبعاً مقامی ہی رہ جاتے ہیں۔ یہ نظریات قبیلوں یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

نظریاتی عنصر تہذیب کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ براہ راست انسانی فکر پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ ہر فلسفہ یا مذہب انسان اور کائنات کے تمام عقدہ ہائے لاینحل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے مخاطب کو بتاتا ہے کہ فی الواقع وہ کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اس کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس اعتبار سے اس کی زندگی کا

نصب العین کیا ہونا چاہئے؟ فکر انسانی ان نظریات سے متاثر ہوتی ہے جس کا براہ راست اثر اس کے اعمال پر پڑتا ہے جس کا مشاہدہ اس کی روزمرہ کی زندگی میں کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی مذہبی نظام ہمہ گیر نوعیت کا ہو تو اس کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑتا ہے اور اگر یہ اثرات نتائج کے اعتبار سے بہترین ہوں تو دوسری قومیں بتدریج اس کو اپنا لیتی ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی فلسفہ محض کسی خاص شعبہ سے متعلق ہو تو اس کا اثر اس شعبے پر خصوصیت سے پڑے گا جس طرح سے سوشلزم مارکس اور اینجل کے ان معاشی خیالات پر مبنی ہے جس کی اشاعت انہوں نے حالت جلاوطنی میں لندن میں بیٹھ کر کی۔

یورپ کی عظیم صنعتی زندگی کو ٹائن بی مسیحیت کی راہبیت کی ایک ضمنی پیداوار سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں اس عظیم الشان مادی عمارت کی نفسیاتی بنیاد و اساس یہ عقیدہ ہے کہ جسمانی ریاضت و محنت ایک فریضہ ہے اور اس ریاضت کا اعزاز و احترام لازمی ہے۔ اس کے برخلاف محنت کے متعلق یونانی تصور یہ تھا کہ یہ پایہ ثقافت سے گرا ہوا مشغلہ ہے اور اس میں انسان کی تذلیل ہوتی ہے۔[۲۲]

اسی طرح ہندوستان میں زراعت کی طرف زبردست رغبت اور بحری تجارت سے احتراز کی ایک وجہ تو وہاں کا مخصوص طبعی ماحول تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مقامی ہندوؤں کے نزدیک بحری سفر خلاف عقیدہ تھا۔ اس لئے بھی بحری تجارت کو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں بحری تجارت شروع کرنے والے زیادہ تر عرب یا دوسرے غیر ملکی تھے۔

اسی طرح مذہب کا اثر فنون لطیفہ اور تعمیرات تک پر بھی پڑتا ہے۔ اسلام ایک سیدھا سادا روشن مذہب ہے۔ یہ سادگی مسلمانوں کے فن تعمیر میں بھی نظر آتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے معابد میں پراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہیں بالکل اندھیرا ہوتا ہے تو کہیں سورج کو رنگے ہوئے شیشوں سے گزارا جاتا ہے تاکہ دماغ پر ایک مخصوص قسم کی اجنبیت اور ہیبت پیدا ہو سکے۔ اسلامی عمارات خصوصاً مساجد میں ایسی بازی گری مطلق روا نہیں رکھی جاتی۔ مسجد کی سب سے عام چیز صحن ہے جہاں زیادہ سے زیادہ روشنی اور ہوا آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام

کا سارا فلسفہ زندگی ابہام اور رمزیت سے دور ہے، لہٰذا اسلامی عمارت کے نقشے سیدھے سادھے ہوتے ہیں اور یہ عمارت ہندو یا گوتھک عمارتوں کی طرح بھول بھلیاں بھی نہیں ہوتیں۔ ۲۳؎

ٹائن بی کا نظریہ تکوین تہذیب:

آرنلڈ، جے، ٹائن بی اپنی شہرۂ افاق کتاب *Study of History* (مطالعۂ تاریخ) میں ان تکوینی عناصر کا جائزہ پیش کرتا ہے جو انسانی تہذیبوں کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ پہلے ماحول اور پھر نسل پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد انہیں تکوینی عناصر کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ البتہ مذہب کی تکوینی حیثیت کا قائل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس باب میں اس ضمن میں اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ غلط یا متنازعہ ہے۔

ٹائن بی دراصل جب لفظ ''تہذیب'' استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کا مطلب ''عظیم تہذیب'' ہوتا ہے۔ وہ اپنے نظریہ میں دراصل تہذیب کی تکوین کی بات نہیں کرتا بلکہ تہذیب کی انتہائی ترقی یافتہ شکل کی تکوین کی بات کرتا ہے۔ جن معاشروں نے ترقی نہیں کی اور تہذیب کے اوج کمال پر نہیں پہنچے انہیں وہ ''تہذیب'' نہیں مانتا اور نہ ہی انہیں موضوع بحث بناتا ہے۔ جب کہ ہمارا موضوع کسی بھی تہذیب کے تکوینی عوامل سے ہے خواہ وہ عظیم تہذیب بن سکی ہوں یا نہیں۔ اسی طرح سے وہ نسل اور ماحول کو بالکل رد نہیں کرتا بلکہ انہیں نئی روشنی میں دیکھتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ مختصراً ٹائن بی کے نظریہ تکوین تہذیب پر روشنی ڈال دی جائے۔ اس ضمن میں ٹائن بی دعوت مقابلہ اور جواب *Challenge and Response* کا نظریہ پیش کرتا ہے اور اسی کو (عظیم) تہذیب کا تکوینی عنصر قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نسل (حیاتیاتی عنصر) اور ماحول (جغرافیائی عنصر) الگ الگ تہذیب کی تکوین نہیں کر سکتے بلکہ تہذیب کی تکوین ان عناصر کے باہمی تعامل میں پوشیدہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جب ماحول دعوت مقابلہ دے (یعنی ماحول ناموافق حالات پیدا کر دے) اور انسان اپنی قوت اور عقل و دانائی سے اس کا موثر جواب دے تب متمدن معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ ماحول ''دعوت

مقابلہ" (Challenge) دریا، جنگلات، شدید حرارت، طوفان، قحط، خوفناک سمندر، ناموافق آب و ہوا یا بنجر مٹی کی صورت میں دے سکتا ہے۔ اگر انسان اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے ان ناموافق حالات سے نمٹ لے تو عظیم تہذیب وجود میں آتی ہے۔

اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے ٹائن بی تقریباً تمام بڑی تہذیبوں کی مثال دیتا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف مصری تہذیب کا حوالہ دے کر باب ختم کرتے ہیں۔

مصری تہذیب کی تکوین کی صورت یہ ہوئی کہ برفانی دور کے اختتام پر افریشیا کے خطے میں گہرا طبعی تغیر شروع ہوا یعنی اس میں خشکی پیدا ہونے لگی۔ جب اس علاقے کے لوگوں کو شدید خشک سالی سے سابقہ پڑا تو متاثرہ علاقے کی شکار پر گزر بسر کرنے والی آبادی کے سامنے تین راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ اپنے شکار کے پیچھے پیچھے شمال یا جنوب کی طرف نکل جائیں اور اس طرح ان خطوں میں پہنچ جائیں جہاں کی آب و ہوا ویسی ہی بن گئی تھی جس کے وہ عادی تھے۔ دوئم یہ کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور جو تھوڑے بہت جانور خشک سالی سے بچ رہے تھے ان کے شکار پر جوں توں کر کے بسر اوقات کریں۔ سوئم یہ کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں لیکن جانور پال کر کھیتی باڑی کر کے حالات پر قابو پائیں۔

یہ حالت پیش آنے پر جن لوگوں نے نہ وطن چھوڑا نہ طرز بود و باش بدلا یعنی دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ تو صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ خشک سالی نے انہیں دعوت مقابلہ دی لیکن وہ اس کا مناسب جواب دینے میں ناکام رہے۔

جن لوگوں نے وطن نہ چھوڑا اپنا طرز معاشرت بدل لیا (یعنی تیسرا طریقہ اختیار کیا) وہ شکار کو چھوڑ کر گلہ بانی میں لگ گئے اور صحرائے افریشیا کے خانہ بدوش بن گئے۔

جن لوگوں نے اپنی جائے سکونت بدل لی اور طریق بود و باش نہ چھوڑا، وہ خشک سالی سے بچنے کے لئے شمال کی جانب بارانی ہواؤں والے خطے میں چلے گئے۔ اس طرح انہیں بلا ارادہ ایک نئی دعوت مقابلہ سے دوچار ہونا پڑا جو لوگ اس شدید موسم سے بچ گئے ان میں ایک نئی تخلیقی قوت حرکت میں آ گئی۔

جو لوگ خشک سالی سے بچنے کے لیے جنوب کی سمت چلے گئے جہاں بارشیں ہوتی تھیں، وہ منطقہ حارہ کی یکساں اور بے رنگ آب و ہوا سے پیدا ہونے والے روح فرسا اثرات کے ماتحت آ گئے۔ لوگوں کا پانچواں اور آخری گروہ وہ تھا جس نے خشک سالی کی دعوت مقابلہ میں اپنی جائے سکونت بھی بدل لی اور طریق معاشرت بھی بدل لیا۔ اس نادر دوگونہ ردعمل کے باعث افریشیا کے کے بتدریج معدوم ہونے والے مرغزاروں کے بعض قدیم معاشروں سے مصر اور سمیریا کی تہذیبیں معرض وجود میں آ گئیں۔

❧ ♦ ☙

حواشی و حوالہ جات:

1. ٹائن بی، آرنلڈ جے، **مطالعہ تاریخ**، جلد اول، ص ۱۱۱۔ تلخیص ڈی۔ سی۔ سومرویل، ترجمہ غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء۔
2. ایضاً۔
3. ابن خلدون "**مقدمہ**"۔
4. ڈاکٹر سیّد عابد حسین، **قومی تہذیب کا مسئلہ**۔
5. ایضاً۔
6. ایضاً۔
7. ندوی، سیّد ابوالحسن علی، **انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر**، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۴۱۔
8. ٹائن بی، ص ۱۰۴۔
9. ایضاً، ص ۱۳۱۔
10. ایضاً، ص ۱۰۴۔
11. ابن خلدون، ص ۱۶۲۔

۱۲۔ ٹائن بی، ص ۱۰۵۔

۱۳۔ ایڈولف ہٹلر، *Mein Kampf*، بوسٹن، ص ۴۲۶۔

۱۴۔ ٹائن بی، ص ۱۰۵۔

۱۵۔ **انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز**، جلد ۳، ص ۶۲۲۔

۱۶۔ *Robert Bierstedt*، ص ۳۷۔

۱۷۔ ''نسل کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں جو ان کے جانشینوں میں بطور میراث منتقل ہو جاتے ہیں۔'' (ٹائن بی، ص ۱۰۴)

۱۸۔ ''اعیان'' دراصل ایک تشریح طلب اصطلاح ہے جو افلاطون کی وضع کردہ ہے۔ افلاطون اور بعض فلسفیوں کے خیال میں وجود کی کئی قسموں میں سے ایک قسم ''عینی'' ہوتی ہے۔ اس میں وہ مثالی نمونے یا معیار داخل ہیں جن پر ہم پوری زندگی کے ہر ہر اصول و فعل کو پرکھتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ ان اعیان کو ''اقدار اعلیٰ'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ جن میں حق، حسن اور انصاف وغیرہ شامل ہیں۔ (**قومی تہذیب کا مسئلہ**، ص ۶)

۱۹۔ ''معروضی ذہنی'' یہ بھی وجود کی ایک قسم ہے اس کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ خیالات، معتقدات اور اصول جو صرف ایک فرد کے نفس تک محدود نہ ہوں بلکہ بہت سے افراد میں مشترک ہوں اور ایک پود سے دوسری پود میں منتقل ہوتے رہیں۔ مثلاً مذہب، قانون، ریاست (مجرد معنوں میں) وغیرہ۔ فلسفیوں نے اس قسم کے وجود کا نام ''ذہنی معروضی'' وجود رکھا ہے۔ (**قومی تہذیب کا مسئلہ**، ص ۵-۶)۔

۲۰۔ **قومی تہذیب کا مسئلہ**، ص ۲۷۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ٹائن بی، **مطالعۂ تاریخ**، ص ۱۴۸۔

۲۳۔ صدیقی، عبدالحمید، **عقیدہ ختم النبوت کے چند عمرانی پہلو**، مرکز مطبوعات اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۴ء، طبع اول، ص ۳۲۔

چوتھا باب:

ہندو تہذیب

ہندوستانی تہذیب دنیا کی قدیم ترین اور کئی اعتبار سے منفرد تہذیب ہے۔ منفرد ان معنوں میں کہ قدامت کے باوجود اب تک زندہ ہے اور یہاں ہمیں تہذیبی ارتقاء کے تمام مدارج نظر آتے ہیں۔ اپنے حدود اربعہ اور آب و ہوا کے اعتبار سے ہندوستان بجائے خود ایک دنیا ہے۔ مثلث نما یہ وسیع و عریض ایشیائی ملک اپنے جنوب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق میں گہرے سمندر میں گھرا ہوا ہے تو اس کے شمال، شمال مغرب اور شمال مشرق میں سر بفلک پہاڑوں کا طویل سلسلہ ہے۔ پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو وسط ایشیا کے دوسرے ممالک سے بالکل جدا کر رکھا ہے۔ البتہ شمال مغرب پہاڑی سلسلہ میں متعدد کشادہ درے ہیں مثلاً درہ خیبر، درہ ٹوچی، درہ بولان اور درہ مکران وغیرہ یہ کشادہ درے ہی وہ راستے ہیں جن سے گزر کر مختلف زمانوں میں مختلف اقوام ہندوستان میں داخل ہوتی رہیں۔

مورخین کے خیال کے مطابق ہندوستانی تہذیب آٹھ واضح ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ وادی سندھ کی قدیم تہذیب ۲۔ رگ ویدی تہذیب

۳۔ دور شجاعت کی تہذیب (۱۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ق م)

۴۔ برہمنی تہذیب (۱۰۰۰ ق م تا ۳۰۰ ق م) ۵۔ بدھ تہذیب (۳۲۰ ق م تا ۵۰۰ء)

۶۔ پرانک یا جدید برہمنی تہذیب (۵۰۰ء تا ۱۰۰۰ء)

وادی سندکی قدیم تہذیب:

اگر چہ ہندوستان میں قدیم ترین ایام ہی سے متعدد قوموں اور نسلوں کے قبیلے، تاجر اور حملہ آور شمال مغربی دروں کے راستے آ آ کر آباد ہوتے رہے تاہم وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں انسانی معاشرے کی بنیاد کب پڑی۔ راولپنڈی کے نواح میں پتھر کے بعض اوزار زمین سے نکلے ہیں جنہیں ماہرین علم الآثار دو سے چار لاکھ سال پیشتر کا بتاتے ہیں [1] لیکن ایک منظم اور با قاعدہ تہذیب کے قدیم ترین آثار موئن جو داڑو (ضلع لاڑکانہ، سندھ) اور ہڑپا (ضلع ساہیوال، پنجاب) میں پائے گئے ہیں۔ ان کھنڈرات سے ملنے والے آثار وشواہد کی روشنی میں جدید خیال یہ ہے کہ دریائے سندھ کے کناروں پر تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں انسانی تہذیب کی ابتداء ہو چکی تھی۔[2] اور یہ تہذیب، علم الآثار کے محققین کے خیال کے مطابق تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل اپنے عروج پر تھی۔[3]

وادی سندھ کی تہذیب سمیر کی اولین تہذیب اور ایلام و میسوپٹامیہ کے طوفان نوح سے قبل کے دور کی تہذیب کے نہ صرف ہم عصر تھی بلکہ کئی اعتبار سے ان سے برتر بھی تھی۔[4] نیز یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ عہد ماقبل تاریخ میں وادی سندھ کے لوگوں کے وادی دجلہ وفرات کے لوگوں سے تجارتی تعلقات قائم تھے اور ان کے مابین آمد ورفت کا سلسلہ عام تھا۔[5]

وادئ سندھ کی یہ تہذیب ایک ہزار میل سے زائد وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی جو رقبہ میں بابل سے چار گنا اور مصر سے دو گنا ہے۔[6] قیاس ہے کہ اس زمانے کے یہ لوگ دراوڑی نسل کے تھے (جو ہندوستان کے اصلی باشندے تھے) اس خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ بلوچستان میں بروہی قبیلے کے لوگ اب بھی ''براہوی'' بولتے ہیں جو دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔[7] یہ قوم مہذب، متمدن اور ترقی یافتہ تھی اور آریاؤں کے ورود سے قبل ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی حصوں میں ان کی تہذیب عروج پر تھی۔

یہ ایک مکمل شہری تہذیب تھی، جہاں صفائی، حفظان صحت، اور نکاسی آب کا انتہائی

معیاری انتظام تھا۔ تعمیرات کے معاملہ میں بھی وہ اپنی ہم عصر تہذیبوں سے بہت آگے تھے۔ ۸
یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ موئن جوداڑو کے کھنڈرات سے ماتا دیوی کے مجسمے کثرت سے ملے ہیں (برصغیر میں آج بھی ماتا دیوی کے مندر اور معبد تقریباً ہر گاؤں اور شہر میں پائے جاتے ہیں) اس کے ساتھ ساتھ ایک دیوتا کا مجسمہ بھی ملا ہے جسے سر جان مارشل ''شیو'' کا مماثل سمجھتے ہیں۔ ۹ اس کے علاوہ یہ لوگ درختوں، جانوروں، پتھروں کے علاوہ مرد و عورت کے مخصوص اعضاء کے مجسّموں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ جواہر لعل نہرو نے اپنے کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھا ہے کہ ہر چند کہ وادی سندھ میں مذہب کا عنصر موجود تھا مگر وہ بہت طاقتور عنصر نہیں تھا اور مجموعی طور پر وادی سندھ کی تہذیب ایک لادین تہذیب تھی۔ ۱۰ اس خیال سے اتفاق نہایت دشوار ہے کیونکہ قرائن و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مذہبی عقائد نے ان کے آرٹ، موسیقی اور طرز معاشرت سب کو براہ راست متاثر کیا تھا اور ان کی تہذیب میں مذہب کا عنصر نمایاں اور قوی تھا خواہ یہ مذہب اوہام کا مجموعہ ہی کیوں نہ رہا ہو۔

رگ ویدی تہذیب:

دراوڑوں (*Dravidians*) کا یہ اعلیٰ تمدن جب اپنے عروج پر پہنچا تو یہاں آریاؤں کا ورود ہوا۔ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ سفید جلد، دراز قامت اور سیاہ بالوں والے آریاؤں کے مختلف قبیلوں نے یکے بعد دیگرے شمال مغربی دروں سے داخل ہوکر ہندوستان میں آباد ہونا شروع کیا۔ آریا کافی مدت تک پنجاب اور وادی سندھ کے علاقوں میں آباد رہے۔ اس کے بعد یہ موجودہ اتر پردیش کے مغربی علاقوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

آریا مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے جو ہمیشہ باہم نبرد آزما رہتے۔ اسی عدم اتحاد کی وجہ سے انہوں نے اپنے الگ الگ علاقے آباد کیے۔ ان قبیلوں میں کچھ حضری تھے اور کچھ بدوی ان کی ابتدائی آبادیاں گاؤں یا چھوٹے قصبوں کے طرز پر تھیں اور بیشتر دریا کے کنارے تھیں۔

انہیں فن زراعت کا علم تھا اور اکثر ابتدائی اقوام کی طرح ان کا متخیلہ نہایت زبردست

تھا۔ تاہم یہ لوگ فن تحریر سے آشنا نہیں تھے اور ان کا جتنا علم تھا وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا تھا۔ ان لوگوں میں مردوں کو دفن کرنے اور جلانے دونوں کا رواج تھا۔ وہ عموماً سبزی، دودھ اور گوشت استعمال کرتے تھے۔ شکار، بیل گاڑیوں کی دوڑ، موسیقی اور رقص کا انہیں خاص طور سے شوق تھا، ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم بڑی سادہ تھی، وہ گاؤں میں رہتے تھے اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔[۱۱] اس دور میں کسی قسم کے سیاسی اتحاد یا کسی حکومت کا مطلق پتہ نہیں چلتا ان کی معاشرت کی بنیاد خاندان پر تھی۔ خاندان ان کے نزدیک سب سے بنیادی اور اہم ادارہ اور دنیا و عقبیٰ کی ساری نعمتوں کا مرکز تھا۔[۱۲] ہندو معاشرے کی وہ واضح نسلی تفریق جو بعد کے زمانے میں نظر آتی ہے، اس عہد میں مفقود تھی اگرچہ رگ وید کے آخری بھجنوں (سوکتوں) میں سے ایک میں برہمن، کشتری اور ویش کے نام آئے ہیں۔[۱۳] لیکن اس سے زیادہ نہیں، اس عہد میں معاشرتی طور پر مکمل سماجی مساوات قائم تھی۔ عورتوں کو معاشرے میں قابل تعظیم درجہ حاصل تھا۔ وحدۃ الازواج کی روایت تھی اور لڑکیوں کو اپنے شوہروں کے انتخاب کی پوری آزادی حاصل تھی۔[۱۴]

فنون میں ان کے پاس صرف شاعری کا فن تھا، فن تعمیر سے نابلد تھے۔ نہ مندر تھے نہ معبد اور نہ ہی اصنام پرستی بلکہ آریا سرے سے بتوں کے تصور سے ہی ناآشنا تھے۔ آریا جو مذہب اپنے قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے دو چیزوں پر مشتمل تھا یعنی اجداد (پرکھوں) کی ارواح کی پرستش اور مظاہر فطرت کی پرستش۔[۱۵] گویا قدرت کے مظاہر کو انہوں نے دیوتاؤں کی شکل عطا کرکے ان کی پوجا شروع کردی، دیاؤس (آسمان دیوتا) اور پرتھوی (زمین دیوتا) آریاؤں کے غالباً سب سے قدیم معبود تھے جن کا ذکر کثرت سے رگ وید میں آیا ہے۔[۱۶] اس کے علاوہ سوریہ (سورج دیوتا) اور اگنی (آگ دیوتا) سمیت رگ وید میں ۳۳ دیوتاؤں کا پتہ چلتا ہے۔

''رگ وید'' ان کی قدیم ترین مذہبی کتاب ہے۔ یہ ۱۰۱۷ یا ۱۰۲۸ ''اشلوکوں'' پر مشتمل ہے جو دس ''منڈلوں'' میں بٹا ہوا ہے۔ آریاؤں کی قدیم تہذیب وتمدن، خانہ جنگیوں، ''سپت سندھو'' کے طبعی خدوخال اور مذہب کے متعلق اس کتاب میں خاطر خواہ مواد موجود ہے اور اس عہد کی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ تین اور ویدیں ''سام وید'' ''یجر وید'' اور

''اتھروید'' بھی ہیں جو ہندوؤں کے نزدیک الہامی کتابیں ہیں اور جو آریہ رشیوں پر نازل ہوئیں۔

دیوتاؤں کی پوجا کا طریقہ سادہ تھا یعنی منتروں کا پڑھنا، دیوتا پر سوم رس چڑھانا اور قربانی کرنا، عبادت تھا۔ مذہب کی یہ نوعیت بڑی مادی اور تجارتی تھی، یعنی یہ دیوتاؤں کی مدح سرائیاں کرتے، ان کو سوم رس، دودھ اور شہد کے چڑھاوے چڑھاتے، بعض اوقات جانوروں کی قربانیاں کرتے اور اس کے عوض دیوتا انہیں مال مویشی اور دشمنوں پر فتح عطا کرتے۔ ان کے خاندان کی حفاظت کرتے، امراض سے بچاتے، ان کے کھیتوں میں پانی برساتے اور ان کی گائیوں کو گابھن بناتے۔ ۱۷ آریوں میں اخلاقی ترقی کم ہے۔ ویدوں میں صرف تین اخلاقی باتوں کی تلقین کی گئی ہے۔ خیرات، حیوانوں پر مہربانی اور دوستوں کے ساتھ وفاداری۔

دورِ شجاعت کی تہذیب (۱۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ق م):

رگ ویدی تہذیب کے بعد آریائی معاشرہ داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر مختلف پہلوؤں سے متاثر ہوا۔ اس وقت آریا اپنے ابتدائی مسکن ''سپت سندھو'' سے نکل کر سارے شمالی برصغیر میں پھیل چکے تھے اور ان کی تہذیب و تمدن کا مرکز پنجاب سے منتقل ہو کر گنگا اور جمنا کی وادیوں میں پہنچ چکا تھا۔ قدیم اور سادہ آریائی معاشرہ بتدریج تبدیل ہو رہا تھا اور ان کی سیاسی و سماجی زندگی میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ دورِ شجاعت یا رزمیہ عہد ہندو معاشرہ کے لئے ایک عبوری دور تھا۔ اسی زمانے میں ہندو سماج کے عقائد و رسوم نے موجودہ شکل اختیار کی۔ رگ ویدی عہد کی سماجی مساوات رفتہ رفتہ تحلیل ہونے لگی اور ہندو معاشرہ واضح طور پر چار ذاتوں میں تقسیم ہو گیا۔ قبائلی ریاستوں کی جگہ بڑی بڑی سلطنتوں نے لے لی۔ پھر قصبات کے ساتھ ساتھ شہر بھی آباد ہونا شروع ہوئے جو اہم تجارتی اور صنعتی مراکز بھی ہوتے تھے۔ انہی بڑے شہروں میں ایک ٹیکسلا بھی تھا جو ایک اہم منڈی ہونے کے علاوہ علم کا مشہور مرکز بھی تھا۔ ۱۸

قدیم آریائی معاشرہ میں عورت کو جو عزت و مرتبہ حاصل تھا اگرچہ اس میں تھوڑی کمی آ گئی تھی تاہم پھر بھی وہ اس عہد میں سماج کا باوقار کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ طلاق اور بچپن کی

شادی کا رواج نہیں تھا۔ بیوہ کو دوسری شادی اور اونچے گھرانے کی لڑکیوں کو بعض اوقات سوئمبر کے ذریعہ اپنے خاوند کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔ ستی کی رسم کا مطلق پتا نہیں چلتا، ہندو عورت پردہ بھی نہیں کرتی تھی، صرف سگا بھائی اور باپ محرم سمجھے جاتے تھے [19] عورت اپنے شوہر کے شانہ بشانہ عبادات، پوجا پاٹ اور دیگر سماجی تقریبات میں حصہ لیتی تھی۔

رگ ویدی عہد کی طرح رزمیہ عہد میں بھی کپڑے کی کٹائی اور سلائی کا رواج نہیں تھا۔ لباس کے طور پر عموماً چادریں استعمال کی جاتی تھیں۔ خوراک بھی رگ ویدی عہد کی طرح سادہ تھی البتہ تعلیم کا رواج عام ہونے لگا تھا۔ طلباء کو عموماً ویدوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دیگر علوم ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ آریا سماج میں جیومیٹری اور علم نجوم وغیرہ کی ابتداء اسی دور میں ہوئی۔

اس عہد میں آریاؤں کے قدیم دیوتا (اندر، سوریہ، اگنی وغیرہ) آہستہ آہستہ غیر مقبول ہوتے گئے اور ان کی جگہ برہما، وشنو اور شو مقبول ہو گئے گویا یہ ہندوستان کے خانہ زاد معبود تھے اور اس بات کو خارج از امکان نہیں قرار دیا جاسکتا کہ ان معبودوں کی 'تخلیق' میں وادی سندھ کی قدیم تہذیب کے اثرات یا ہندوستان میں پھیلی ہوئی قدیم دراوڑی تہذیب کے اثرات آریاؤں نے قبول کیے ہوں۔ بہر حال وشنو کشتریوں کا خاص دیوتا تھا جس کی بیوی لکشمی دیوی تھی اور شو (زندگی اور موت کا دیوتا) برہمنوں کا خاص دیوتا تھا اور پروتی اس کی بیوی تھی۔ ان دیوتاؤں کے وجود کو رگ ویدی عہد کے اواخر تک تسلیم کیا جاچکا تھا۔ رزمیہ عہد میں یہ زیادہ مقبول ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ انہوں نے قدیم دیوتاؤں کی جگہ لے لی۔ ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' میں خصوصیت کے ساتھ وشنو کی عظمت پر زور دیا گیا ہے اور بھگوت گیتا (ہندوؤں کی یہ مقدس نظم مہابھارت کا اہم حصہ ہے) میں کرشن کو وشنو کا اوتار بنا کر ایک فعال معبود کا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ [20]

رامائن اور مہابھارت ہندوؤں کی دو نہایت اہم، مقدس رزمیہ نظمیں ہیں جو اس عہد کے واحد تاریخی ماخذ بھی ہیں۔ ''مہابھارت'' ہندوؤں کے لٹریچر میں سب سے طویل تالیف ہے۔ اس میں دو لاکھ پندرہ ہزار بیتیں ہیں۔ ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ کتاب رشی والمیکی [21] (*Valmiki*) کی تصنیف ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ نظم صدیوں میں تالیف ہوئی ہے اور

اس کا مؤلف کوئی ایک شخص نہیں لہٰذا اس کا زمانہ متعین کرنا بھی ممکن نہیں۔ مہابھارت کا ایک حصہ تو نہایت قدیم ہے، اس میں وقتاً فوقتاً الحاق اور اضافے ہوتے رہے اور اس کے جدید سے جدید حصے کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ تیسری صدی عیسوی کے بعد کا ہے۔[۲۲] ہندوؤں کی نظر میں مہابھارت کا درجہ بہت اونچا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دیوتاؤں کے سامنے چاروں ویدوں کو ایک پلہ میں اور مہابھارت کو دوسرے پلے میں رکھا گیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ مہابھارت کا پلہ بھاری ہے۔[۲۳] جو کوئی اس کتاب کا ایک حصہ بھی پڑھ لے اس کے تمام گناہ دھل جاتے۔

لفظ ''مہابھارت'' کے لفظی معنی خاندان بھارت کی تاریخ کے ہیں۔[۲۴] ہستاپور (جو دہلی کے قریب تھا) میں آریاؤں کے دو قبیلے کورو اور پانڈو آباد تھے جو آپس میں ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ ان دونوں میں جو زبردست جنگ ہوئی اس کی تاریخ مہابھارت میں درج ہے۔ جس میں کچھ افسانویت اور بہت زیادہ رطب و یابس بھی بھرا ہوا ہے۔

''رامائن'' جو کئی صدی قبل مسیح کی تالیف ہے ضخامت میں مہابھارت کی ربع ہے۔ اس میں صرف ۴۸ ہزار بیتیں ہیں۔ ہندو روایت کے مطابق یہ رشی ویاس (*Vyasa*)[۲۵] کی تصنیف ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مہابھارت کی طرح اس کی تالیف بھی صدیوں میں مکمل ہوئی لہٰذا یہ کسی ایک رشی کا کام نہیں نیز اس کا زمانہ تصنیف بھی اسی وجہ سے متعین نہیں کیا جاسکتا تاہم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رامائن، مہابھارت سے قدیم ہے۔ اس کتاب میں رام چندر جی اور سیتا کی داستان بیان کی گئی ہے۔

مذہبی اعتبار سے اس عہد میں اپنشدوں کو بھی مقبولیت حاصل رہی۔ اپنشد، ویدی ادب کا آخری مگر ضخیم حصہ ہے، جس میں ہندومت کا تقریباً پورا فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ اس میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات اوج کمال پر نظر آتے ہیں اور وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتے ہیں۔ اپنشد خدا کے نفوذ مطلق سے بحث کرتے ہیں جو ایک ایسا تصور ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی شکل اختیار کر لی۔[۲۶]

رزمیہ عہد میں فلسفے نے کافی ترقی کی۔ تناسخ اور کرم کے نظریات اسی عہد میں اختیار

کیے گئے۔ ''کرم'' کے عقیدہ کے مطابق ہر عمل چھوٹا ہو یا بڑا، اچھا ہو یا برا انسانی روح پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان اپنے عمل (کرم) کے اعتبار سے جزا یا سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اچھا یا برا جنم لیتا ہے۔

تناسخ کے عقیدہ کے مطابق انسان کو صرف ایک زندگی نہیں ملتی بلکہ مرنے کے بعد وہ پھر سے جنم لیتا ہے۔ ہر موت کے بعد اس کا نامۂ اعمال ''یامہ'' (Yama) یعنی موت کے دیوتا کے سامنے پیش ہوتا ہے جو اس کے مطابق اسے کوئی دوسرا جنم دے کر دنیا کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے اور یہ چکر اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب انسان اچھے اور مقبول اعمال ذخیرہ کر لیتا ہے۔ اس وقت اسے ''مکتی'' حاصل ہوتی ہے۔ (مکتی کی وضاحت اس عہد میں نہیں ملتی)

اس عہد کے اواخر میں آہستہ آہستہ برہمنوں نے مذہبی فرقہ کے طور پر مذہب و معاشرہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور یوں ''دور برہمنیت'' کا آغاز ہوا۔

برہمنی تہذیب (۱۰۰۰ ق م تا ۳۰۰ ق م):

اس عہد کو پران و منوسمرتی کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جو صحیح معنوں میں ہندو تہذیب و تمدن کو نمایاں طور پر پیش کرتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ عہد دوسرے ادوار کی بہ نسبت زیادہ صاف اور واضح ہے کیونکہ اس دور سے متعلق کچھ نہ کچھ مستند تاریخی مواد ضرور مل جاتا ہے۔

رگ ویدی تمدن کا مرکز پنجاب تھا۔ (اس کے بعد دور شجاعت میں وہ اپنے توسیع و استحکام میں لگے رہے) اور برہمنی تمدن وادئ گنگا کا تمدن ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال کی مدت تک آریہ قوم برابر مشرق کی طرف بڑھتی رہیں اور تقریباً کل ہندوستان پر قابض ہو گئیں۔ یہاں کے قدیم باشندے لڑائی بھڑائی چھوڑ کر پوری طرح ان کے محکوم ہو چکے تھے اور آریاؤں میں اپنی نسل کو خالص رکھنے کا احساس شدید تر ہو چکا تھا۔ آریاؤں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پوری حفاظت نہ کرے تو وہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اگر ماں اور باپ کی نسل ایک نہ ہو تو اولاد نہایت کم درجہ کی پیدا ہوتی ہے۔[۲۷] چنانچہ انہوں نے ''سترہ'' تصنیف کیے اور ''دھرم

سترہ'' کے اندر مختلف ذاتوں کو مختلف مقام عطا کیا اور اس تقسیم کو ازلی و بنیادی قرار دیا۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ذاتوں کی ذمہ داریاں، حقوق و فرائض اور مشاغل متعین کیے۔ ''دھرم سترہ'' کو ہندو قانون کے ماخذ کی حیثیت حاصل رہی۔ دھرم کے معنی مذہب، فرائض اور اعمال کے ہیں اور ''سترہ'' کے لفظی معنی تو دھاگہ کے ہیں مگر اصطلاحی معنی ''مقدس کتابوں کی طرف راہنمائی کرنے والی بیاض'' کے ہوئے۔ ان کی تصنیف چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد کی ہے۔ ۲۸

لیکن اس کے باوجود آریاؤں نے محسوس کیا کہ مقامی لوگوں کے ساتھ انجذاب و اتصال (*Assimilation*) کے عمل کو مکمل طور پر روک دینا دھرم سترہ جیسے قوانین کی موجودگی کے باوجود، ممکن نہیں رہا اور وہ غیر آریائی نظریات واثرات قبول کرنے لگے ہیں نیز بدھ مت بھی (گوتم بدھ کا ظہور چھٹی صدی قبل مسیح میں ہو چکا تھا اور اس کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں) ان کی مذہبی ونسلی برتری اور تفوق و امتیاز کے لئے شدید خطرہ بن کر منڈلا رہا ہے لہٰذا انہوں نے اپنی بالا دستی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک نیا قدم یہ اٹھایا کہ ''دھرم سترہ'' (جو اس وقت کے برہمنی تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا) تشکیل نو کی جائے۔

چنانچہ انہوں نے دھرم سترہ کی تالیف نو کی اور ان کا نام ''دھرم شاستر'' رکھا۔ یہ بھی ''دھرم سترہ'' کی طرح کافی تعداد میں لکھی گئیں۔ مگر ان میں سب سے زیادہ شہرت منو جی کے دھرم شاستر کو حاصل ہوئی۔ چونکہ یہ کتابیں غیر الہامی ہیں اس لئے ان کو الہامی کتابوں یعنی ''سروتی'' سے ممیز کرنے کے لئے ''سمرتی'' کہا جانے لگا۔ چنانچہ عام طور پر ''منودھرم شاستر'' کے بجائے ''منوسمرتی'' ۲۹ بولنے لگے۔

منوشاستر یا منوسمرتی تین سو سال قبل مسیح میں تصنیف ہوئی جبکہ ہندوستان میں برہمنی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور اس کو بہت جلد ہندوستان بھر کے مدنی و سیاسی قانون کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ نیز اس عہد کے سب سے اہم تاریخی ماخذ کے طور پر بھی منوسمرتی قابل ذکر ہے جو اس عہد کی کماحقہ تصویر کشی کرتی ہے۔ منوشاستر میں ہے:

''قادر مطلق (برہما) نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے اور اپنے

بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، کشتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔" (باب اوّل:۳۱)

"اس دنیا کی حفاظت کے لئے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض مقرر کیے۔" (باب اوّل:۸۷)

"برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا۔" (باب اوّل:۸۸)

"کشتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے۔ دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں نہ پڑے۔" (باب اوّل:۸۹)

"ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، تجارت، لین دین زراعت کرے۔" (باب اوّل:۹۰)

"شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا۔ وہ ان تینوں کی خدمت کرتا ہے۔" (باب اوّل:۹۱)

صرف منوشاستر میں ہی نہیں بلکہ تمام دھرم شاستروں کی بنیاد، ذات کی ایسی تفریق پر رکھی گئی ہے۔ اور مقدمہ کے طور پر دو اصولوں کو سب سے پہلے تسلیم کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ انسانی آبادی چار ذاتوں کے اندر بٹی ہوئی ہے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا۔ ان میں سے اوّل الذکر تین ذاتیں دوج یا دوئج ہیں۔ یعنی مرنے کے بعد پھر جنم لیتے ہیں لیکن شودر کا صرف ایک جنم ہے۔ دوئم یہ کہ ذاتوں میں برہمن کی ذات سب سے بلند ہے اور اس کی حیثیت دیوتا کی ہے "برہمن کا غضب دیوتا کے غضب سے زیادہ خطرناک ہے۔" (منوسمرتی، باب۱۲)

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت۔" (منوسمرتی، باب اوّل:۹۹)

برہمنوں کو دیوتاؤں جیسا مقام حاصل تھا۔ انہیں یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ کے مشیر بنتے اور بادشاہوں (جو عموماً کشتری ہوتے) کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ برہمنوں کے مشورے کے بغیر

کوئی کام نہ کریں۔ضرورت کے وقت برہمنوں کو جائز تھا کہ وہ کوئی پیشہ اختیار کرلیں یا تجارت کریں لیکن عموماً ان کی گزراوقات کشتریوں کی داد و دہش پر ہوا کرتی تھی کیونکہ برہمن کو دان دینا ہندوؤں کے اعلیٰ ترین فرائض میں سے تھا۔[30] نیز برہمن بلاعذر، وقت ضرورت اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا تھا کیونکہ غلام صاحب جائیداد نہیں ہوسکتا اس کی کل املاک مالک کا مال ہے۔[31] بادشاہ برہمنوں سے کسی قسم کا Tax یا محصول نہیں لے سکتے تھے۔[32] اسی طرح ان کی سزائیں بھی دوسری ذاتوں کے مقابلے میں بہت ہلکی تھیں۔ البتہ ان غیر معمولی حقوق کے ساتھ ساتھ ان کے فرائض بھی سختی کے ساتھ محدود کردیئے گئے تھے۔ان کی زندگی کو چار آشرم کے اندر تقسیم کیا گیا۔

۱۔ برہم چاریہ: طفولیت یا زندگی کے ابتدائی پچیس سال جس میں یہ علم حاصل کرتے (خصوصاً ویدوں کا علم) اور خاص استادوں سے مذہب کے اسرار سیکھتے۔

۲۔ گرہستھ: جوانی یا پچیس سے پچاس سالہ دور زندگی، جس میں برہمن شادی کرتا اور خانہ داری کے فرائض ادا کرتا۔ جس میں سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ صاحب فرزند ہو۔

۳۔ ونا پرستھ: ادھیڑ عمری یا پچاس سے پچھتر سالہ دور زندگی جس میں برہمن خانہ نشینی اختیار کرتا، اور غور و فکر، مشاہدہ و ریاضت اور عبادت میں مصروف رہتا۔

۴۔ سنیاس: بڑھاپے یا زندگی کا آخری حصہ جس میں برہمن کو تارک الدنیا ہوجانے کی ہدایت ہوتی۔ اس دور تک پہنچتے پہنچتے برہمن پختہ کار ہوجاتا اور اس میں ایسی روحانیت آجاتی کہ وہ خدا تک پہنچ جاتا۔ اس دور میں وہ مراقبہ میں موت کی تیاری کرتا۔

آشرم دھرم تینوں دوج ذاتیں اختیار کرسکتی تھیں لیکن خصوصیت سے یہ برہمنوں کے لئے مخصوص تھا جس کے عوض انہیں بے اندازہ حقوق حاصل ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر ہوگئے۔ جبکہ معاشرے کی دوسری انتہا پر شودر تھے جن کا درجہ حیوانوں سے بدتر تھا۔ وہ پیدائشی غلام تھے اور ان کا واحد کام دوبج خصوصاً برہمن کی خدمت کرنا تھا۔ شودر مال و دولت نہیں جمع کرسکتا تھا کیونکہ اس طرح وہ برہمن کو دکھ دیتا تھا۔[33]

دھرم شاستروں میں ہر ذات کے علیحدہ علیحدہ حقوق اور ایک ہی جرم میں ان کے

لئے مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں، مثلاً ایک کشتری کو قتل کرنے کا جرمانہ اس جرمانہ کا چوتھائی ہے جو برہمن کے قتل کا ہے۔ اسی طرح ویش کے قتل کا جرمانہ اس کا آٹھواں حصہ ہے اور اگر شودر نیکوکار ہے تو اس کے قتل کا جرمانہ سولھواں حصہ ہے اور اگر شودر نیکوکار نہیں ہے اور قاتل دوئج ہے تو قاتل کو سزا نہیں دی جائے گی۔[۴۳]

"برہمن کو سنگین سے سنگین جرم میں بھی قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس کے قتل سے زیادہ سنگین کوئی گناہ نہیں ہے۔" (منوشاستر)

"اگر شودر کسی شودر کو قتل کردے تو دس گائے برہمن کو دے کر کفارہ ادا کرے۔ اگر ویش کو قتل کردے تو سو گائے اور اگر کشتری کو تو ہزار گائے برہمن کو دے کر کفارہ ادا کرے اور اگر وہ برہمن کو قتل کرتا ہے تو اسے ہلاک کردیا جائے گا۔" (منوشاستر)

"اگر کوئی شودر کسی دوئج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہئے کہ اس کے سرین کو دغوادے اور اسے ملک بدر کردے۔" (منوشاستر، باب ہشتم: ۲۸۱)

"اگر شودر کسی دوج کی جاتی کا نام بے حرمتی سے لے تو ایک لوہے کی کیل دس انگلی لمبی آگ میں سرخ کرکے اس کے منھ میں ڈالی جائے گی۔" (منوشاستر، باب ہشتم: ۲۷۱)

اسی ذات پات کی سختی کی وجہ سے عورتوں کی آزادی بھی اس دور میں بالکل سلب کرلی گئی کیونکہ عورت کی بے احتیاطی سے ان اصولوں میں فرق آنے کا احتمال تھا۔ اس برہمنی دور میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا جو ویدی زمانہ میں تھا۔ منو کے قانون میں عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔ شوہر مرجاتا تو عورت گویا جیتے جی مرجاتی، نہ وہ دوسری شادی کرسکتی اور نہ ہی اپنی سابقہ حیثیت کو برقرار رکھ پاتی۔ شوہر کے مرتے ہی اس کی حیثیت سسرال کی لونڈی اور خادمہ کی سی ہوجاتی جو زندگی کی تمام سہولتوں اور آسائشوں سے یک لخت محروم کردی جاتی یہی وجہ ہے کہ اس دور کی عورت زندگی پر موت کو ترجیح دینے پر مجبور ہوگئی۔ بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منوشاستر میں نہیں ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے

کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی کیونکہ یونانی مورخین نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ۳۵

جہاں شوہر کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو خوش رکھیں، ان کی عزت کریں، اور انہیں گہنوں سے سنواریں ۳۶ وہیں عورت کو ہر حال میں شوہر کی وفاداری کی تلقین اور دوسری صورت میں شدید سزا کی وعید دی گئی ہے۔

> ''اگرچہ شوہر بدچلن اور اوصاف حمیدہ سے خالی ہو اور عیاش بھی ہو، تاہم زوجہ کو چاہئے کہ دیوتا کی طرح اس کی پرستش کرے۔ جو زوجہ شوہر کے فرائض کو پورا نہ کرے وہ مرنے کے بعد رسوا ہوگی اور گیدڑ کے پیٹ میں جنم لے گی۔ اس گناہ کے پاداش میں وہ انواع واقسام کے امراض میں مبتلا ہوگی۔'' (منوشاستر، باب پنجم: ۱۵۴-۱۶۴)

اسی سبب سے منوشاستر میں سب سے بڑا جرم زنا کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے ذات پات کے نظام کے بگڑنے کا خطرہ ہوتا تھا۔

عہد مذکور میں بدھ مت ہندوستان میں پیدا ہو چکا تھا لیکن اس نے ابھی قوت نہیں پکڑی تھی۔ ہندومت جدید فلسفیانہ مباحث کی وجہ سے انتہائی ناقابل فہم ہو چکا تھا۔ مذہب روحانیت سے خالی تھا۔ ظاہری اعمال یعنی چڑھاؤں وغیرہ پر اس قدر زور دیا جانے لگا تھا کہ مذہب کی اس شدید سختی نے انسان کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی کا بھاری کفارہ اور اس کفارے کی ادائیگی کے لئے علیحدہ علیحدہ منتر، چڑھاوے، رسوم اور قربانیوں نے ہندوؤں کو شدید گرانبار کیا ہوا تھا، ایسے میں گوتم بدھ نے نجات دہندہ کا کام کیا۔

بدھ تہذیب (۳۲۰ ق م تا ۵۰۰ء):

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان میں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا جو نئی مذہبی یا اصلاحی تحریکات کا باعث بنے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے حوالے سے بدھ مت اور جین مت جیسی اصلاحی تحریکات قابل ذکر ہیں (یہی وہ زمانہ ہے جب ایران میں زرتشت اور چین میں کنفیوشس کا ظہور ہوا۔)

موجودہ نیپال کی (جنوبی) سرحد پر بنارس سے تقریباً سو میل شمال مشرق میں ہمالیہ کی ترائی میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کا صدر مقام کپیلا وستو (Kapilavastu) تھا جہاں آریاؤں کا ایک قبیلہ شاکیہ جونسلاً کشتری تھے، عرصہ سے آباد تھا، اس ریاست کے راجہ شدودھن (Suddhodana) کے یہاں اس کی پہلی بیوی مایا (مہامایا) سے اس کا اکلوتا بیٹا سدھارتھ پیدا ہوا جو اپنے خاندانی نام ''گوتم'' سے مشہور ہوا۔ اس کا سنہ پیدائش اختلافی ہے ۵۵۷ تا ۵۶۰ ق م میں کسی وقت اس کی پیدائش اور ۴۷۷ ق م سے ۴۸۰ ق م کے درمیان کسی وقت اس کی وفات ہوئی ۳۷ے اور ہندو رسم ورواج کے مطابق انہوں نے علوم وفنون حاصل کیے۔ کم سنی میں ہی ان کی شادی ایک حسین شہزادی یشودھر (Wasodhara) سے کر دی گئی۔ شادی کے دس سال بعد ان کا بیٹا راہل (Rahula) پیدا ہوا۔ ۳۸ے

بدھوں کی مذہبی روایات کے مطابق گوتم کی عمر تیس برس ہوئی تو ان میں ذہنی تبدیلی رونما ہوئی جس نے بالآخر گوتم کو مجبور کیا کہ وہ مکتی کے حصول کے لئے دنیا کو ترک کر دیں۔ اس عہد میں دراصل سارا ہندو فلسفہ ایک ہی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا کہ ''مکتی'' کس طرح حاصل کی جائے۔ بعض ہندو مذہبی رہنماؤں نے مکتی کے حصول کے لئے منتروں اور قربانیوں اور بعض نے تپیا اور ریاضت کے ذریعہ نفس کشی پر زور دیا جس سے مکتی تو حاصل نہ ہوئی البتہ ہندوستان میں ترک دنیا اور تعذیب نفس کے رجحانات عام ہو گئے۔

ان حالات میں گوتم نے ایک رات خاموشی سے اپنی سلطنت اور گھر چھوڑ کر ریاست مگدھ کے دارالسلطنت 'راج گرھی' جس کے اردگرد دور دور تک جنگلات اور پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، کو اپنے لئے منتخب کیا اور ریاضت اور نفس کشی شروع کر دی۔

اس وقت ترک دنیا کوئی انوکھی بات نہیں تھی بلکہ یہ ویدی فلسفہ کا ایک اہم جزو تھا مگر عین عنفوان شباب میں زندگی کی راحتوں اور محل کے آسائشوں کو خیر باد کہہ دینا، اپنی چھوٹی مگر مضبوط سلطنت، وفا شعار وخوبصورت بیوی اور کم سن بچے کو چھوڑ کر گدائی اختیار کرنا تاکہ بنی نوع انسان کے دکھوں کا خاتمہ کرے، ایک ایسی بات تھی جس نے گوتم کو ممتاز کیا اور اس کے مذہب کو

الہامی مذاہب کے بعد سب سے بڑے مذہب ہونے کا اعزاز عطا کیا۔

تقریباً چھ سال تک وہ جوگیوں کے طرز پر سخت ترین مجاہدات میں مشغول رہے، لیکن بعد ازاں اسے لاحاصل سمجھ کر بدھ گیا کے غیر آباد علاقہ میں ایک بڑ کے درخت کے نیچے مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ یہیں سے انہوں نے پینتیس چھتیس برس کی عمر میں "حق" کو پالیا۔ حصول حق کے بعد اپنی زندگی کے بقیہ پینتالیس سال انہوں نے بدھ مت کے پرچار میں گذارے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مسلسل و متعدد سفر کیے۔ "سنگھ" کے قیام کے ذریعہ اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام ان کے بعد بھی وسیع پیمانے پر جاری رہا۔

گوتم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں تھے بلکہ یہ ایک اصلاحی کوشش تھی، جس کی ملک کو اس وقت ضرورت تھی اور یہ ملک اس کو قبول کرنے پر آمادہ بھی تھا۔ انہوں نے ہندومت کی اصلاح کا کام کیا، اس سے یک سر انحراف نہیں کیا۔ انہوں نے بیشتر ہندوانہ عقائد ہی اختیار کیے مثلاً، تناسخ، کرم، اواگون، مکتی (جسے وہ نروان کہتے ہیں) وغیرہ۔ انہوں نے ذات پات پر مبنی سماجی تقسیم کے خلاف بھی آواز بلند نہیں کی بلکہ مختلف ذاتوں کے درمیان اخوت کی ہدایت کی۔ وہ برہمنوں کے تفوق کے قائل نہیں تھے۔ ان کی نظر میں تمام انسان برابر تھے۔ وہ پیچیدہ رسوم، قربانی اور بت پرستی کے بھی مخالف تھے۔ انہوں نے خدا، کائنات اور روح جیسے اہم مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ جب ان سے خدا کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر خدا اور دیوتا ہیں بھی تو وہ کرم کے قانون سے بالاتر نہیں، ویدوں کے الہامی یا غیر الہامی ہونے کے متعلق بھی انہوں نے وضاحت سے کچھ نہیں کہا۔

گوتم کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر برائی کی جڑ خواہشات نفسانی ہے اور خواہش نفسانی کی جڑ مایا ہے، یعنی نام و نشان، حکومت و دولت، عزت، لذائذ روحانی و جسمانی، جوانی، حسن عشق یہ سب مایا اور دھوکا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک چیز ہر وقت بدلتی رہتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی لہٰذا یہ سب دھوکا (مایا) ہے۔ انسان کی نجات کا دار و مدار نفسانی خواہشات کی فنا میں ہے۔ اسی صورت سے انسان نروان (مکتی)

حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے بعد تناسخ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔[۳۹]

مکتی کا حصول اس عہد کا سب سے اہم مسئلہ تھا جس کے حصول کے لئے گوتم بدھ نے ہندوؤں کی طرح قربانیوں، منتروں، چڑھاوؤں یا ریاضت و تپسیا پر زور دینے کے بجائے نیک اعتقاد، نیک نیت، نیک قول، نیک فعل، نیک زندگی، نیک کوشش، نیک خیال اور نیک مراقبہ (کامل مراقبہ) کا درس کیا۔[۴۰] مکتی کے حصول کا یہ زیادہ آسان، روشن، قابل فہم اور ہر طبقے کے نزدیک قابل قبول حل تھا لہٰذا یہ مذہب تیزی سے قبول عام حاصل کرنے لگا اور ہندوستان کے علاوہ رفتہ رفتہ چین، جاپان، برما، سیام اور مشرقی جزائر میں پھیل گیا۔ بدھ مت کی اشاعت میں اس کی سادگی کے علاوہ گوتم کی ذاتی شخصیت اور سنگھ کی تبلیغی کوششوں کے علاوہ یہ سیاسی سبب بھی شامل تھا کہ اسے راجہ اشوک (۲۷۳ ق م تا ۲۳۶ ق م) اور راجہ کنشک (۱۲۰ء تا ۱۶۲ء) جیسے بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوئی جنہوں نے دور دراز ملکوں میں اپنے مبلغین بھیجے۔ ہندوستان میں اشوک نے کافی تعداد میں وہاریں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں جو بدھ علوم کے مراکز تھے اور جہاں ہزاروں بھکشو رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اشوک نے بدھ تعلیمات کو کتبات کی صورت میں ستونوں اور چٹانوں پر کندہ کرایا جس سے اس مذہب کو مقبولیت عام حاصل ہوئی اور یہ مذہب ملک سے باہر بھی پھیلا۔

اس نئے مذہب کا معاشرتی اور اخلاقی اثر یہ ہوا کہ جرائم کی سزائیں خفیف ہو گئیں۔ مالگزاری اور محصولات کم کر دیئے گئے، مختلف فرقوں میں میل جول بہت بڑھ گیا جو کہ برہمنی زمانے میں ہرگز ممکن نہ تھا، اگرچہ ذاتیں موجود رہیں لیکن ان میں رواداری اور مہربانی کا عنصر نظر آنے لگا، مذہبی تعلیم پر صرف برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور تعلیم بلا تفریق ذات ہر شخص کے لئے حاصل کرنا ممکن ہو گیا۔ ملک میں ہر طرف شفا خانے بن گئے صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ حیوانوں کے لئے بھی علیحدہ شفا خانے تعمیر کیے گئے۔[۴۱]

ایک ہزار سال تک ہندوستان میں باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بدھ مت کا زوال شروع ہو گیا اور ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی میں یہ مذہب ہندوستان سے بالکل مٹ گیا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ بدھ مت بتدریج اسی برہمنی مذہب میں ضم ہوگیا جس سے وہ نکلا تھا۔۴۲
رفتہ رفتہ بدھ مت اپنی سادگی اور انفرادیت کھونے لگا، اور برہمن اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کر کے اپنی علیحدہ حیثیت کو گم کر دیا۔ گوتم بت پرستی کا قائل نہیں تھا بعد میں صورت یہ ہوئی کہ گوتم بدھ کے مجسمے اور تشبیہیں بننے لگیں، یہ مجسّمے اور بت زیادہ تر بدھ مت کے دور عروج میں تیار ہوئے، اور بدھ جہاں جہاں اور جس جس ملک میں گئے یہ بت اور مجسّمے ان کے ساتھ گئے۔

سنگھوں کی فضا بھی بدلنے لگی اور نئی نئی بدعتیں اور جدتیں نظر آنے لگیں۔۴۳
برہمنیت نے بدھ کو اوتار بنا دیا، سنگھ بہت دولت مند ہوگئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر و اوہام داخل ہو گئے۴۴ ان تمام اسباب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ گپت خاندان (چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی) نے ہندو مت کی سرپرستی کی اور یوں ہندوستان سے بدھ تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ گو کہ اس کے دوررس اثرات دیر تک یہاں کے مقامی لوگوں میں باقی رہے۔

جین مت:

اسی عہد میں بدھ مت کے پہلو بہ پہلو ایک اور اصلاحی تحریک نظر آتی ہے۔ یہ جین مت ہے جسے چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان میں فروغ حاصل ہوا۔ جین مت کو دعویٰ ہے کہ یہ ایک مستقل مذہب ہے جو نہ بدھ مت سے تعلق رکھتا ہے اور نہ برہمن سے اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ یہ انہی دونوں سے نکلا ہے۔ جین مت کا فلسفہ اور روایات بالکل وہی ہیں جو بدھ مت کی ہیں، جس سے کہ یہ بہت ہی قدیم زمانے میں الگ ہو کر ایک مستقل مذہب بن گیا اور اس کا قیام ہندوستان میں محض اس وجہ سے رہ گیا کہ اس نے برہمنی مذہب کی بہت سی باتیں اختیار کر لیں۔۴۵

اس مذہب یا تحریک میں ایک نئی زندگی یا نئی روح پھونکنے والے کا نام نتاپت ۴۶ (Nataputta) تھا جسے اس کے پیروکاروں نے مہاویر وردھمان کے نام سے یاد رکھا۔ گوتم کی طرح وردھمان بھی کشتری خاندان سے تھے ان کے والد سدھارتھ سردار قبیلہ تھے۔ ان کا قبیلہ

وسیالی کے ایک گاؤں کنڈا پور (Kandapura) میں آباد تھا۔ گوتم ہی کی طرح یہ بھی پر آسائش زندگی گذارتے رہے اور اٹھائیس سال کی عمر میں ویراگی بن گئے۔ پہلے وہ سادھوؤں کی ایک جماعت نیرگرنتھ کے طور طریقے پر عمل کرتے جس کی بنیاد تقریباً ۷۷۶ ق م میں پرسو (Parsva) نامی ایک سادھو نے رکھی تھی (بعد میں پرسو کو جین مت کا تیئیسواں پیغمبر یا جن مان لیا گیا) وہ تقریباً بارہ سال تک سخت مجاہدہ اور ریاضت میں مصروف رہے اور بالآخر چالیس سال کی عمر میں ان کو گیان حاصل ہوا اور وہ مہاویر (بہادر) جین (فاتح عالم) اور نیرگرنتھ (قید و بند سے آزاد) کہلائے۔ گیان حاصل کرنے کے بعد انہوں نے زندگی کے باقی تیس سال اسی مذہب کی تبلیغ میں گزارے اور ۵۲۷ ق م میں مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے وفات پائی۔

مہاویر وردھمان کو ماننے والے جین کہلائے۔ یہ وردھمان سے قبل تیئیس پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں سے آخری پرسو تھا جس نے حقیقی معنوں میں جین فرقے کی بنیاد رکھی اور چوبیسواں وردھمان تھا جس نے اس میں نئی روح پھونکی اور اس کی اصلاح کی ۷ے مہاویر نے بھی بدھ مت کی طرح ایک منظم جماعت کی تشکیل کی جس کی تبلیغی کوشش جاری رہیں۔ چندر گپت موریہ (۳۷۵ء تا ۴۱۴ء) اور چند دوسرے والیان ریاست اس کے سرپرست رہے لہٰذا یہ مذہب بھی ہندوستان میں تیزی سے پھیلا۔ آج کل بھی جینی زیادہ تر صوبجات متوسط، بمبئی اور راجپوتانے میں آباد ہیں۔

جہاں تک ان کی تعلیمات کا تعلق ہے وہ بدھ سے مماثل ہیں۔ جین بھی عالم کی قدامت کے قائل اور خالق کے وجود کے منکر ہیں۔ گوتم کی طرح مہاویر بھی سماجی مساوات کا قائل تھا۔ جین مذہب کی کتابیں بھی علیحدہ ہیں اور یہ بھی بدھ مت کی طرح ویدوں کو نہیں مانتے۔ آواگون اور کرم کے اصولوں کو مہاویر نے بھی تسلیم کیا البتہ تپسیا اور ریاضت کے معاملے میں اس نے گوتم سے اختلاف کیا۔ وہ ترک دنیا اور ریاضت کا بہت قائل تھا، یہاں تک مسلسل فاقوں کی وجہ سے جان کو مار دینا اس کے نزدیک زندگی کا بہترین انجام تھا۔

مہاویر نے بھی مکتی یا نروان کو جسے وہ ''موکش'' کہتا ہے۔ انسانی جد و جہد کا مقصد اعلیٰ

قرار دیا۔ موکش کے حصول کے لئے اس نے گوتم کی طرح صحیح عقیدہ (یعنی تمام پیغمبروں پر ایمان لانا) صحیح علم اور صحیح عمل کی تعلیم دی۔ صحیح عمل سے مراد یہ ہے کہ انسان پانچ باتوں کے لئے حلف اٹھائے۔

۱۔ کسی جانور کو تکلیف نہیں پہنچائے گا۔ ۲۔ چوری نہیں کرے گا۔
۳۔ جھوٹ نہیں بولے گا۔ ۴۔ ملکیت نہیں رکھے گا۔
۵۔ بدفعلی نہیں کرے گا۔[۴۸]

مہاویر کا خیال تھا کہ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب دنیا کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ اس کے نزدیک برہنہ رہنا اور فاقہ کشی کرتے کرتے مر جانا سب سے بہتر انجام تھا۔

مہاویر نے اہنسا کے اصول پر شدت سے زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کے ماننے والے جوں، مچھر، کھٹمل اور زہریلے کیڑوں کو بھی ہلاک نہیں کرتے بلکہ اس پلنگ پر جس میں بہت سے کھٹمل ہوں کسی تندرست آدمی کو پیسے دے کر سلاتے ہیں تاکہ کھٹملوں کو غذا مل سکے اور انہیں ثواب حاصل ہو۔ وہ غروب آفتاب سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں تاکہ تاریکی میں کوئی کیڑا ان کے کھانے میں نہ آ جائے۔ اسی طرح شمع روشن کرنا بھی ان کے نزدیک مناسب نہیں کیونکہ یہ پروانوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ جب وہ چلتے ہیں تو پیر بہت آہستہ زمین پر رکھتے ہیں تاکہ کوئی کیڑا پیر کے نیچے آ کر ہلاک نہ ہو جائے۔[۴۹]

مہاویر کی موت کے بعد ان کے پیرو دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہو گئے جن میں بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[۵۰] دیگمبر (Digambara) اور سوئتامبر (Svetambara) ان میں اوّل الذکر مہاویر کی پیروی میں برہنہ رہنا ضروری سمجھتے ہیں جبکہ آخر الذکر سفید کپڑا پہننے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں فرقوں میں زیادہ بنیادی اختلاف نہیں ہے، دونوں چوبیس پیغمبروں کو دیوتا کی طرح پوجتے ہیں اور عام زندگی مثلاً شادی، بیاہ، پیدائش و موت وغیرہ میں ہندووانہ رسم و رواج کی پیروی کرتے ہیں۔

پرانک تہذیب (۵۰۰ء تا ۱۰۰۰ء):

بدھ مت ہندوستان کے لئے روشنی کی ایک کرن ثابت ہوا۔ اس میں اور برہمنی مذہب میں پہلا بڑا فرق اخلاق، رواداری اور نیکی کا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ بدھ مت میں انسان کا درجہ اتنا بڑا رکھا گیا ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں۔[۵۱] اس مذہب کا عروج ہندو مت کی خرابیوں کی وجہ سے ہوا تھا لہٰذا ہندو علماء نے مذہبی اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ گپت عہد (۳۲۰ء تا ۴۶۸ء) ہندومت کی نشاۃ الثانیہ کا عہد ثابت ہوا۔ شنکر اچاریہ جیسے مفکرین نے مذہب کو مزید خرابیوں سے بچایا۔ دوسری طرف بدھ مت متعدد وجوہات کی بناء، پر جن کی نشاندہی اسی باب میں کی جا چکی ہے، ہندوستان سے مٹ گیا اور دوبارہ جس تہذیب کو فروغ ملا وہ وہی سابقہ برہمنی تہذیب تھی اور اس تہذیب کی تاریخ نے دوبارہ اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیا۔ لہٰذا ہم اس لاحاصل تکرار سے صرف نظر کرتے ہوئے چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی، ہندوستان کی ایک عمومی حالت کا جائزہ پیش کریں گے۔

ہندو تہذیب اور چھٹی صدی عیسوی:

ہندوستان کے مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہندوستان میں چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا پست ترین دور تھا۔ بت پرستی پورے عروج پر تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان معلوم زمانے سے ہی شرک کا گہوارہ رہا ہے اور مظاہر پرستی بالآخر بت پرستی میں بدل گئی لیکن وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی، اس صدی میں بڑھ کر ۳۳ کروڑ ہوگئی۔[۵۲] خواہ ویدی زمانہ ہو خواہ موجودہ زمانہ ایک ہندو کے نزدیک ہر وہ چیز خدا ہے جو اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ اگرچہ مختلف زمانوں میں مختلف ہندو مصلحین نے ہندو مت میں توحید کو ثابت کرنا چاہا لیکن برہمنوں اور فلسفیوں کی وہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں جو انہوں نے توحید قائم کرنے کے لئے یا کم از کم خداؤں کی تعداد گھٹا کر تین تک کرنے لئے کیں۔[۵۳]

چنانچہ چھٹی، ساتویں صدی عیسوی میں بت سازی کے فن نے بھی نمایاں ترقی کی۔ سارے ملک میں بت پرستی کا دور دورہ تھا حتیٰ کہ بدھ مت اور جین مت کو بھی اس مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی مقبولیت کو قائم رکھنے اور اپنی بقا کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا۔

اس بت پرستی کے ساتھ ساتھ جس چیز نے ہندوستان کو اخلاقی انحطاط میں مبتلا کیا وہ جنسی بحران تھا۔ شہوانی جذبات اور جنسی میلان کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کی تہذیب میں ہیں غالباً کسی دوسری تہذیب میں نہیں۔ ہندوؤں کی اخلاقی گراوٹ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہمی اختلاط کی حکایتیں مذہبی طور پر سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ ان مندروں میں قابل پرستش چیزوں میں سب سے ممتاز ومقدم لنگم اور یونی ہیں۔ جن سے مراد مادہ خلقت کے دونوں جزو ہیں۔ اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں (لنگم شیو کے آلہ تناسل کا نام ہے) اور راسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پوجا کرتے تھے۔[۵۴] مندروں کے محافظ ومنتظم بداخلاقی کا سرچشمہ تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم کا مرکز تھیں۔ محلات ودرباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود کا خیال نہ کیا جاتا۔ اس تن پروری اور نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی، ریاضت، مجاز (یوگ وتپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا۔

اس پر مستزاد طبقہ واریت تھی۔ کسی قوم کی تہذیب میں اس قدر شدت سے ذات پات کی تقسیم دیکھنے میں نہیں آتی جیسی ہندوستان کے قانون میں ہے اور اسی وجہ سے ہندوستانی معاشرہ میں ''قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں'' کے زریں اصول کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ قانون کے اندر عدم مساوات کی ایسی واضح مثال شاید کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔

ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کی حالت بھی ابتر تھی دراوڑی تہذیب یا ابتدائی

آریائی تہذیب میں اسے جو حیثیت حاصل تھی، وہ ختم ہوچکی تھی۔ ستی جیسی انسانیت سوز رسم ہمیں کسی دوسرے معاشرے میں نظر نہیں آتی۔

علم و ادب کے اعتبار سے بھی ہندوستان جمود کا شکار تھا۔ گپت عہد (چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی) ہندوؤں کے علم وادب کی ترقی کا زریں دور کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس میں ایسا جمود پیدا ہوا جو صدیوں جاری رہا اور راجپوت دور (جو ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے بارہویں صدی کے اختتام تک رہا) نہ صرف سیاسی انتشار کا زمانہ تھا بلکہ اس میں ہندوؤں کا علم و ادب بھی تنزل کا شکار ہو چکا تھا۔ تمام قدیم علوم سنسکرت میں تھے جو اس وقت تک مردہ ہوچکی تھی۔ بدھ مت کے دور عروج میں علم و ادب مقامی زبانوں میں منتقل ہوگیا تھا اس لئے اس کا خوب چرچا ہوا اور بودھ وہاریں اشاعت علوم وتعلیم و تدریس کا مرکز بن گئیں۔ مگر ہندومت کے دوبارہ اقتدار کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہندوؤں کے یہاں تحصیل علم کا حق قانوناً صرف برہمنوں کے پاس تھا۔ ان حالات میں علم کا زوال ہونا ہی تھا۔ گوکہ ہندوؤں نے ریاضی، ہیئت ونجوم میں کافی ترقی کر لی تھی، وہ سورج گرہن او چاند گرہن کی تاریخ اور اوقات کا صحیح تعین کر سکتے تھے۔ انہیں زمین گول ہونے کا بھی علم تھا اور کشش ثقل بھی دریافت کر چکے تھے مگر برہمن عوام کو عموماً اندھیرے میں رکھتے۔ جب چاند یا سورج گرہن کا موقع آتا تو اس کا سائنسی اور علمی سبب بتانے کے بجائے وہ اوہام پر مبنی کہانیاں بیان کرتے اور چانداور سورج دیوتا کو گرفت سے نجات دلانے کے لئے کئی قسم کی لایعنی اور پیچیدہ پراسرار رسومات ادا کرتے۔ دراصل برہمن کے اقتدار کی بنیاد ہی عوام کی جہالت پر استوار کی گئی تھی۔

غرض کہ ہندوستان اس وقت کی دنیا میں جہالت وتوہم پرستی پست درجہ کی بت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ واری ناانصافی میں پیش پیش تھا اور دنیا کی اخلاقی وروحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں مبتلا تھا۔ بدھ مت کے پاس بھی دنیا کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں وہ اپنے مسائل کا صحیح حل تلاش کر سکتی۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۵، ص ۳۷۱۔
۲۔ نہرو، جواہر لعل، ڈسکوری آف انڈیا، بمبئی، ۱۹۶۴ء، ص ۴۷۔
۳۔ صدیقی، محمد ادریس، وادیٔ سندھ کی تہذیب، محکمہ آثار قدیمہ، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۳۷۔
۴۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔
۵۔ ڈسکوری آف انڈیا، ص ۷۲۔
۶۔ دراصل باقیاتی تفتیش جیسے جیسے آگے بڑھ رہی ہے وادی سندھ کا تہذیبی دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ موجودہ پاکستان کے قریب قریب سارے علاقے میں موئن جو داڑو اور ہڑپا کے طرز کی ہزاروں بستیاں آباد رہی ہوں گی ان میں باقیاتی تفتیش کے اعتبار سے موئن جو داڑو، ہڑپا، جنہو دارو، علی مراد، آمری، دابر کوٹ اور کوٹ ڈیجی بہت اہم ہیں۔ (وادیٔ سندھ کی تہذیب، ص ۲۹)
۷۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۵، ص ۳۷۲۔
۸۔ ڈسکوری آف انڈیا، ص ۷۳۔
۹۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب، ص ۱۶۹۔
۱۰۔ ڈسکوری آف انڈیا، ص ۷۲۔
۱۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۵، ص ۳۷۲۔
۱۲۔ گستاولیبان، تمدن ہند، مترجم سیّد علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ص ۳۴۶۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۴۷۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۴۵۔
۱۵۔ امیر علی، سیّد، روح اسلام، ص ۱۱۔
۱۶۔ عین الحق، قدیم مشرق، ج ۲، ص ۲۷۲۔
۱۷۔ تمدن ہند، ص ۲۶۲۔
۱۸۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۵، ص ۳۷۲۔
۱۹۔ قدیم مشرق، ص ۲۸۴۔
۲۰۔ قدیم مشرق، ص ۲۷۴۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔
۲۲۔ تمدن ہند، ص ۳۷۳۔
۲۳۔ ایضاً۔
۲۴۔ ایضاً۔
۲۵۔ قدیم مشرق، ص ۲۶۷۔
۲۶۔ روح اسلام، ص ۱۱۔

۲۷ تمدن ہند، ص ۲۶۴۔
۲۸ قدیم مشرق، ص ۳۴۷۔
۲۹ ایضاً، ص ۳۴۹۔
۳۰ تمدن ہند (بحوالہ منوشاستر)۔
۳۱ ایضاً (بحوالہ منوشاستر، باب ہشتم: ۴۱۷)۔
۳۲ ایضاً۔
۳۳ قدیم مشرق (بحوالہ منوشاستر، باب دہم: ۱۲۹)
۳۴ ایضاً، ص ۳۵۰ (بحوالہ منوشاستر)
۳۵ تمدن ہند، ص ۲۸۹۔
۳۶ ایضاً (بحوالہ منوشاستر، باب سوئم: ۵۵، ۵۶، ۶۰)
۳۷ Hamsworth History of the World، ج ۴، ص ۱۱۸۶، لندن، ۱۹۱۴ء۔
۳۸ ایضاً۔
۳۹ تمدن ہند، ص ۳۰۹ (بحوالہ للت دستر باب، ۲۶)۔
۴۰ ایضاً۔
۴۱ ایضاً، ص ۳۳۴۔
۴۲ ایضاً، ص ۳۱۹۔
۴۳ ایشوراٹوپا، ہندوستانی تمدن۔
۴۴ ڈسکوری آف انڈیا، ص ۱۸۶۔
۴۵ تمدن ہند، ص ۴۹۹۔
۴۶ Hamsworth History of the World، ج ۴، ص ۱۱۹۸۔
۴۷ ایضاً۔
۴۸ ایضاً، ج ۴، ص ۱۱۹۹۔
۴۹ قدیم مشرق، ص ۴۲۰۔
۵۰ Hamsworth History of the World، ج ۴، ص ۱۱۹۹۔
۵۱ تمدن ہند، ص ۳۱۰۔
۵۲ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۵۸۔
۵۳ تمدن ہند، ص ۴۴۰۔
۵۴ دیانند سرسوتی، ستیارتھ پرکاش، ص ۳۴۴۔

پانچواں باب:

ایرانی تہذیب

ایران کا قدیم نام ''پرسس'' (*Persis*) یا ''پرشیا'' (*Persia*) تھا۔[1] یونانی اسے پارس اور عرب فارس کہتے تھے۔ ایک ہزار سال قبل مسیح کے بعد سے جب کہ یہاں آریاؤں کا ورود ہوا، اسے ''ایران'' کہا جانے لگا۔ لفظ ایران آریانہ (*Aryana*) سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے ''آریاؤں کی سرزمین''۔[2]

ایرانی سلطنت کی سرحدیں مختلف زمانوں میں مختلف رہیں۔ گویا بادشاہتوں کے ساتھ ساتھ ایران کی حدود بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہیں۔ جہاں تک قدیم ایران کی تاریخ کا معاملہ ہے تو بیسویں صدی کے اوائل میں سوسا[3] (سوس) کی کھدائی سے چند اہم انکشافات سامنے آئے جن کی روشنی میں ماہرین علم الاثار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح سے بھی پہلے پری پالس (اصطخر) میں ایک قدیم تہذیب قائم تھی جو حجری عہد کے اواخر سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تہذیب آریائی نہیں تھی۔ مستند شہادت کی عدم دستیابی تک ان اقتباسات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ لوگ یا تو خزری[4] (*Caucation*) تھے، حامی یا کوشی[5] تھے اور یا پھر عیلامی[6] تھے۔ ان کی اپنی ایک قابل ذکر تہذیب تھی جو تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح میں اپنے عروج پر تھی۔ ان کے معاصر تہذیبوں سے گہرے ثقافتی اور تجارتی روابط بھی موجود تھے۔

ازاں بعد ایک سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان آریاؤں کے دو بڑے قبائل

ماد یا اماد (Medes) اور پارس (Parsa) ایران میں داخل ہوئے ان کی ایک جماعت ہندو پاکستان کی طرف آئی اور دوسری کوہ البرز اور کردستان کی پہاڑیوں کے درمیان اس سطح مرتفع میں آباد ہوئی جو ان کی طرف منسوب ہو کر اریانا یا ایران کے نام سے موسوم ہوا۔ ایرانی سطح مرتفع کے اندر آباد ہونے والے آریائی قبائل میں سے قبیلہ ماد نے شمال ومغربی حصے میں اور پارس نے جنوبی حصے میں سکونت اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کا اول الذکر خطہ میڈیا اور آخر الذکر فارس کہلایا۔[7] ایک اور آریائی قبیلہ پارت تھا، جس نے ایران کے شمال مشرقی حصے میں سکونت اختیار کی جس کی وجہ سے اس علاقے کو پارتیا یا پارتھیا (Parthia) کا نام ملا۔[8]

میڈیا اور پارس کے قدیم باشندے (حامی یا کوشی یا عیلامی) ان نو وارد آریاؤں کے ہاتھوں یا تو مارے گئے یا ترک وطن کر گئے اور یا آریاؤں نے ان کو اپنا محکوم بنالیا۔ آل ماد میں دیوکس (Diokes) وہ پہلا شخص ہے جس نے میڈیا میں آزاد ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے ۷۰۹ ق۔م سے ۶۵۶ ق۔م تک حکومت کی۔ ہمدان کو اپنا دارالسلطنت بنایا (جو اس وقت امادان کہلاتا تھا) اور مختلف آریائی قبائل کو اتنا منظم کر لیا کہ پڑوسی آشوریوں کو جو آئے دن آریاؤں کے علاقوں پر حملے کرتے تھے مزید دست اندازی کی جرات نہیں ہوئی۔ ۶۵۶ ق۔م میں جب دیوکس کا انتقال ہوا تو آلِ ماد کی بادشاہت موروثی ہوگئی۔

دیوکس کے بعد اس کا بیٹا فراورتیش (Fravartish) تخت نشین ہوا۔ اس نے پارس کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا اور تقریباً بائیس سال حکومت کر کے ۶۳۳ ق۔م میں آشوریوں سے جنگ کے دوران مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سیاکسرز (Cyaxares) تخت نشین ہوا جس نے پارتھیا پر بھی قبضہ کرلیا اور نینوا سے آشوری خاندان کا خاتمہ کردیا۔ نینوا کے زوال کے ساتھ ہی نہ صرف آشوری سیادت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی بلکہ بہت سے آشوری علاقوں کو ضم کر کے میڈیا کی ریاست بھی وسیع ہوگئی۔ نینوا کے نئے بادشاہ (جو کہ بخت نصر کا باپ تھا) کے ساتھ معاہدہ صلح کیا گیا ساتھ ہی سیاکسرز نے اپنی ایک بیٹی امتیہ (Amyties) کی شادی بخت نصر سے کردی اور دونوں سلطنتوں کے مابین تعلقات بہتر ہوگئے۔ ۵۸۴ ق۔م میں

جب سیاکسرز فوت ہوا تو آلِ ماد کی مملکت (میڈیا) دریائے پالیس تک پھیلی ہوئی تھی جو ایران کو میڈیا سے جدا کرتا تھا۔ جنوب میں ان کی حدود بابل سے ملحق تھیں اور شمال میں آرمیبیا تک پھیلی ہوئی تھی بلکہ آرمیبیا مملکت ماد کا جزو ہی بن گیا تھا۔[9]

سیاکسرز کا بیٹا آستیاگس (*Astyages*) جس کا عرصہ حکومت ۵۸۴ ق۔م سے ۵۵۰ ق۔م تھا اس زبردست حکومت کو نہ سنبھال سکا۔ جبکہ دوسری طرف جنوبی آریاؤں کا قبیلہ پارس تیزی سے طاقت پکڑ رہا تھا۔ بالآخر قبیلہء پارس کے ایک نامور شخص کوروش اعظم، جسے یونانی مورخین سائرس (*Cyrus*) کہتے ہیں، کے ہاتھوں سلطنت ماد کا چراغ بجھ گیا۔ سائرس نے آلِ ماد پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد بابل کو بھی فتح کر کے اس عظیم ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی جسے تاریخ میں ہخامنشی سلطنت کہا جاتا ہے۔

آلِ ماد کی تہذیب:

ہخامنشی دور کے حالات بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا آلِ ماد کی تہذیب وتمدن پر ایک نظر ڈالی جائے حالانکہ اس سلسلہ میں سب سے بڑا مسئلہ تاریخی مواد کی عدم فراہمی کا ہے۔ اہل پارس کے حالات تو خود ان کی تحریروں میں کم وبیش مل ہی جاتے ہیں مگر میدیوں نے اپنا کوئی ریکارڈ نہیں چھوڑا ہے۔ تاہم مورخین نے ان کے تھوڑے بہت حالات آشوری کتبوں، یہود ملفوظات اور یونانی مورخین کی کتابوں سے جمع کئے ہیں۔ تاہم پھر بھی بعض جگہ قیاسات کا سہارا لینا پڑے گا۔

آلِ ماد کا اپنا تمدن تھا جسے بعد میں اہل فارس (ہخامنشیوں) نے اپنایا۔ آل ماد کے مذہب کے بارے میں تفصیلات تو نہیں ملتیں پھر بھی ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے ان کی مذہبی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[10] ماد (نیز پارس اور پارت) چونکہ آریائی تھے اس لئے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ان کا ابتدائی مذہب ایشیائے کوچک میں آباد ہونے والی آریائی شاخ میتانی (*Mittanians*) اور ہندوستان میں آباد ہونے والی آریائی جماعتوں سے مختلف نہیں ہوگا۔

ہندی آریاؤں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ اوائل میں عناصر فطرت (مثلاً آب و آتش، خاک و باد) اور مظاہر قدرت (مثلاً آفتاب و ماہتاب، برق و رعد) کی پرستش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں برائیوں اور آلام کے دیوتاؤں کا بھی تصور رکھتے تھے۔ میتانیوں کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ بھی یہی ہے کہ ان کے عقائد ہندی آریوں کے عقائد سے ملتے جلتے تھے۔ ایسی صورت میں ایرانیوں کے متعلق بھی یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ان کا مذہب بھی اسی نوعیت کا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ منتشر طور پر ایسے شواہد بھی مل جاتے ہیں جن سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستانی آریاؤں اور ایرانی آریاؤں کے کئی معبود مشترک تھے۔

اہورا[11] (Ahura) ایرانیوں کا سب سے بڑا معبود تھا۔ سنسکرت میں یہ لفظ اسورا (Asura) ہے جو بعد میں اسور یا ایشور بن گیا۔ آہورا یا اسورا ''مالک کائنات'' کے تصور کو ظاہر کرتا ہے۔ دیوا[12] (Dawa) یہ بھی قدیم آریائی دیوتا ہے۔ سنسکرت یا ویدی زبان میں یہ لفظ دیاؤ (Dyauh) ہے جس کے معنی خدائے سماوات (God of Heavens) کے ہیں۔ آخری ویدوں میں ''دیاوہ'' یا دیوا کو بہت ہی طاقتور مانا گیا ہے اور اسورا پر اس کی برتری ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ایران میں ''دیوا'' کو برائیوں کا دیوتا سمجھا گیا ہے اور اہورا سے اس کو برسرِ پیکار بتایا گیا ہے (یہ لفظ فارسی میں دیو یعنی شیطان بن گیا) مترا[13] (Mitra) یہ ''شمس دیوتا'' ہے جو بہت ہی طاقتور سمجھا گیا ہے۔ سنسکرت میں یہ لفظ متھرا (Mithra) ہے اور اوستا میں مشرہ (Mishra)۔

ان معبودوں کے علاوہ ایرانی چند دوسرے معبودوں کی بھی پرستش کرتے تھے جو معمولی صوتی فرق کے ساتھ ہمیں ہندوستان میں بھی نظر آتے ہیں یعنی ایرانی آرت (Arta) سنسکرت میں ورت (V a r t a) یعنی ''خدائے گیتی'' ہے، ایرانی دیوتا آزروان (Adhervan) سنسکرت میں اتھروان (Athervan) ہے جو کہ ''برق دیوتا'' ہے۔ ایرانی دیوتا اترآگنی (Atrugne) ہندوستانی دیوتا اگنی (Agni) ہے یعنی آگ کی دیوی اور ایرانی ایندرہ (Andra) سنسکرت میں اندرا (Indra) ہے یعنی ''کڑک دیوتا''۔

کچھ عرصہ بعد ایران میں خیر وشر کی دو طاقتوں کا تصور پیدا ہوا، جس نے ان کے مذہبی عقائد پر گہرا اثر ڈالا۔ انگرامنو یا اہریمن کو بدی کا دیوتا اور اہورا کو خیر کا دیوتا قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ایرانیوں کے مذہبی تصورات انہی دو خداؤں کے گرد چکر لگانے لگے۔ یوں ہندوستانی آریاؤں کے برعکس ایرانی آریاؤں نے کثرت سے وحدت کی طرف سفر شروع کیا جو ''ثنویت'' پر آکر ختم ہوگیا۔ عین ممکن ہے کہ خیر وشر کی دو طاقتوں کا تصور دینے والا زرتشت رہا ہو۔

ہندی آریاؤں کی طرح ایرانیوں میں بھی پروہتوں کا ایک طبقہ موجود تھا جس کو مغ [۱۴] (Mage) یا مجوس کہتے تھے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی اسی طبقے سے متعلق تھی۔ انہوں نے بھی برہمنوں کی طرح مذہب کے اندر بہت سی پیچیدگیاں پیدا کردی تھیں۔ مذہبی فرائض میں قربانی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ قربانی کے وقت ایک مقدس گھاس کا رس پینا، بہترین عبادت میں داخل تھا۔ اس گھاس کا نام سنسکرت میں سومہ (*Soma*) اور اوستا میں ہومہ (*Homa*) بتایا گیا ہے۔

یہ مجوسی مذہب زرتشت کے ظہور تک ایران کا مذہب تھا۔

زرتشت:

ایرانیوں کے پیغمبر زرتشت کی زندگی کے بارے میں متضاد آراء کی وجہ سے یہ مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے کہ زرتشت کب اور کہاں پیدا ہوا۔ بعض مورخین اس کا زمانہ پانچ ہزار سال قبل مسیح اور بعض ایک ہزار سال قبل مسیح بتاتے ہیں۔ جدید محققین نے اس کا زمانہ ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تجویز کیا ہے۔ [۱۵] یعنی ۶۳۰ ق۔م سے ۶۶۰ ق۔م کے لگ بھگ زرتشت آذربائیجان کے علاقہ میں پیدا ہوا۔ زرتشت کے حالات تاریکی میں تاہم روایات کے مطابق اس نے بیس سال کی عمر میں گوشہ نشینی اختیار کی اور ہمہ تن عبادت اور غور وفکر میں لگ گیا تیس سال کی عمر میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

زرتشت کو اشاعتِ مذہب کے لئے آذربائیجان کی زمین راس نہ آئی تو اپنی نبوت کے بارہویں سال اس نے بلخ کا رُخ کیا۔ وہاں کے حکمران گشتاسپ نے نہ صرف یہ دین قبول

کیا بلکہ اس کی سرپرستی میں باختر (بلخ) میں جگہ جگہ آتشکدے تعمیر ہونے لگے اور زرتشت کی تعلیمات کو بارہ ہزار بیلوں کی کھالوں پر تحریر کر کے محفوظ کیا گیا۔

زرتشتی تعلیمات کے مطابق ساری کائنات کا ایک خدا ہے [16] جس کا ذاتی نام اہورا مزدا ہے۔ اس کی چھ اہم ایجابی صفات، چھ سلبی صفات سے متصادم رہتی ہیں یعنی نورانیت ظلمت سے...... حقانیت کذب سے...... مالکیت عجز سے...... قدوسیت نجاست سے...... سالمیت شکستگی سے...... اور ابدیت عارضیت سے متقابل ہیں۔ اہورا کی ان سلبی صفات کا مصدر "اہرمن" ہے۔ اہرمن کے ساتھی، کماریکان یا دیوا ہیں، جن کا کام شر کو عالم میں پھیلانا ہے اور اہورا کے ساتھی یزداں ہیں جن سے دنیا میں خیر کی اشاعت ہوتی ہے۔

بلاشبہ بحیثیت ایک مفکر کے زرتشت نہایت ہی قابل احترام ہے، نہ صرف اس لئے کہ وہ اپنی فلسفیانہ بصیرت سے خارجی کثرت وتنوع کے مسئلہ تک پہنچ گیا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے مابعد الطبعی ثنویت تک پہنچنے کے بعد اس کے ابتدائی ثنویت کو ایک اعلیٰ وحدت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی [17] لیکن اس کے بعد اس کے متبعین میں سے کوئی بھی اس مخلصانہ کوشش کو آگے نہ بڑھا سکا اور یوں زرتشت کے پیروکار واضح طور پر ثنویت کے قائل ہو گئے۔ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ دنیا میں فائدہ پہنچانے والی تمام چیزوں کا خالق آہورا مزدا ہے اور نقصان پہنچانے والی تمام چیزوں کا خالق اہرمن ہے۔ اس طرح وہ دو ازلی ہستیوں یا دو خداؤں یا دو خالقوں کو مانتے ہیں۔ خیر وشر کے یہ خدا آپس میں نبرد آزما ہیں۔ اس جنگ میں بالآخر روح خیر (آہورامزدا) کو فتح نصیب ہو گی۔ وہی قیامت کا دن ہوگا۔ زرتشتی تعلیمات میں حیات بعد الممات، آخرت، جہنم اور بہشت وغیرہ سے متعلق بھی عقائد ملتے ہیں۔

زرتشتیوں کے نزدیک آگ اور نور کا درجہ سب سے بلند ہے کیونکہ یہ دونوں آہورا مزدا کے مظاہر ہیں۔ اس لئے اس دین کا قبلہ بھی آتش ہے اور آتش کو ہمیشہ روشن رکھنا ان کے نزدیک فرض اولین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرتشت کو ماننے والے آتش پرست بھی کہلاتے ہیں۔ جب کے ظلمت اہرمن کا مظہر ہے۔ آگ اس لئے مقدس ہے کہ وہ اندھیری راتوں کو روشن

کرتی ہے۔ اور سرگرداں خبیث روحوں کو جو اندھیرے میں پرورش پاتی ہیں، فنا کر دیتی ہے۔

آگ کے ساتھ ساتھ پانی اور مٹی (عناصر قدرت) بھی زرتشتیوں کے نزدیک مقدس ہیں۔ زمین کے تقدس کے پیش نظر وہ اپنے مردوں کو دفنانے یا جلانے کے بجائے ایک اونچے سنسان اور کھلے مچان پر رکھ دیتے ہیں تا کہ شکاری پرندے کھا جائیں۔ پانی کے تقدس کے پیش نظر سوائے پینے یا پودوں کی آبیاری کرنے کے اور کسی مقصد کے لئے اسے نہیں چھوتے۔

اخلاقی تعلیمات میں زرتشت نے "پندار نیک" "گفتار نیک" طہارت و پاک دامنی کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک سود خوری، جھوٹ، وعدہ خلافی سخت گناہ ہیں۔ زرتشت نے متاہل ۱۸ زندگی گزارنے اور اولاد پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ کسب معاش کی تاکید کی۔ کاشت کاری کو سب سے بہتر پیشہ بلکہ مذہبی فریضہ قرار دیا۔ نیز ان لوگوں کو بشارت دی ہے کہ جو زراعت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اور جانوروں کی پرورش پرواخت کرتے ہیں۔ زرتشت نے سخاوت، امداد اور حسن سلوک کو بہترین اعمال میں شمار کیا ہے۔

زرتشت کی بعثت کا مقصد "گاتھا" میں یوں لکھا ہے کہ اس نے یعنی (زرتشت نے) مذہب کی جو دعوت دی اس کا مقصد یہ تھا کہ مغوں کے قدیم مذہب میں جو توہمات شامل ہو گئے ہیں ان سے مذہب کو پاک کیا جائے۔ ۱۹

زرتشتیوں کی مذہبی کتاب اوستا (*Avesta*) ہے جو ان کے اپنے عقیدے کے مطابق منزل من اللہ ہے۔ اوستا کا مختصر سا حصہ ہے جسے گاتھا کہتے ہیں، زبان کے لحاظ سے دوسرے حصوں سے مختلف ہے۔ اس کی زبان شاید وہی ہے جو زرتشت کی تھی۔ بقیہ حصے ایک خاص زبان میں ہیں جو اوستائی زبان کے نام سے مشہور ہیں جو ہخامنشی زبان سے مختلف ہے۔ یہ کتاب اب اپنی اصلی حالت میں نہیں۔ تاریخی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اوستا کا اصل نسخہ سکندر کے حملے میں تباہ ہو گیا تھا۔ پھر کئی سو سال بعد بلاش سوئم (۱۶۸ء تا ۱۹۱ء) کے زمانے میں اس کی تدوین نو کی کوشش کی گئی مگر اس کی تکمیل ساسانی بادشاہ اردشیر بابکان کے زمانے میں ہوئی۔ اس تدوین میں گاتھا کے علاوہ بقیہ تمام حصے کی تصنیف میں محض حافظہ پر اعتماد کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ اصل اوستا کا محض ایک چوتھائی حصہ باقی بچا۔

اوستا کے بعد زرتشتیوں کی دو اور مذہبی کتابیں ہیں۔ (۱) ژند (۲) پاژند۔ اول الذکر موجودہ ژند پہلوی زبان میں ہے جس کی تدوین ساسانی عہد میں ہوئی۔ پاژند کی زبان پہلوی اور فارسی کے درمیان کی زبان ہے اور نسبتاً زیادہ واضح ہے۔

ہخامنشی دور (۵۵۰ ق م تا ۳۳۰ ق م):

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا آلِ ماد کی زبردست سلطنت بالآخر سائرس (کوروش اعظم) کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ سائرس (۵۵۰ ق۔م تا ۵۲۹ ق۔م) نے آلِ ماد کے آخری فرمانروا آستیاگس پر فتح حاصل کرنے کے بعد اپنے مورثِ اعلیٰ ہخامنش کے نام سے ہخامنشی عہد کی تاسیس کی۔ سلطنت کے قیام کے بعد اس نے روسیوں کے اور ایشیائے کوچک کے تمام علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو دریائے سیحوں سے لے کر بحیرۂ احمر تک وسیع کر لیا تھا۔ اس کی قائم کی ہوئی یہ حکومت دو سو بیس سال تک جاہ وجلال کے ساتھ قائم رہی۔ بالآخر سکندر کے شہ زور ہاتھوں نے اسے ختم کر دیا۔

اس سلسلے کے دوسرے بادشاہ حسبِ ذیل ہیں۔

کمبوجیہ (Cambyses) (۵۲۹ ق م تا ۵۲۱ ق م)

اس خاندان میں آٹھ بادشاہ گذرے ہیں جن میں سب سے اہم داریوش اوّل (Daruis - I) تھا (۵۲۱ ق م تا ۴۸۵ ق م) اس نے بابل اور مصر فتح کرنے کے بعد پنجاب اور سندھ کو بھی مسخر کیا، دانیوب کو عبور کر کے تھریس کو فتح کیا۔ مقدونیا کو زیر کیا، افریقہ اور چین تک پہنچا۔ اس کے حدودِ سلطنت سب سے زیادہ وسیع تھے، مشرق میں پنجاب وسندھ سے لے کر مغرب میں مقدونیہ وترا کیہ (تھریس) تک جنوب مغرب میں افریقہ سے لے کر شمال مشرق میں چین تک ان عظیم الشان فتوحات کی وجہ سے اسے تاریخ نے ''داریوش اعظم'' کا لقب دیا۔

خشارشیا (Xerxes) (۴۸۵ ق م تا ۴۶۶ ق م)

اردشیر درازدست (*Artaxerxes*) (۴۶۵ق م تا ۴۲۵ق م)

داریوش دوئم (۴۲۴ق م تا ۴۰۴ق م)

اردشیر دوئم (۴۰۴ق م تا ۳۸۵ق م)

اردشیر سوئم (۳۸۵ق م تا ۳۳۸ق م)

داریوش سوئم: (۳۳۶ق م تا ۳۳۰ق م) جسے سکندر نے شکست دے کر ہخامنشی عہد کا خاتمہ کیا۔

دور گذشتہ کی طرح اس عہد میں بھی طرز حکومت شاہی تھا۔ بادشاہ کو قومی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ عوام بادشاہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ لہٰذا بادشاہ کے احترام کی خاطر لوگ جھک جھک کر زمین تک جا لگتے تھے اور اس کے پاؤں کو بوسہ دیتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ ہخامنشیوں کو خدا کی طرف سے فرّ ایزدی یا فرّ کیانی عطا ہوئی ہے۔[۱۲] اس لئے وہ سرزمین ایران کے بادشاہ بنے۔ بعد ازاں یہ فرکیانی ہخامنشی بادشاہوں کو ورثہ میں ملتی گئی۔ اسی سبب سے بعد میں ساسانیوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہخامنشیوں کے وارث ہیں۔

ہخامنشی عہد میں سات خاندان، جن کے پاس اپنی بڑی بڑی جاگیریں تھیں بہت ممتاز تھے۔ انہی میں ہخامنشیوں کا خاندان بھی تھا۔ ان کو بادشاہ کی طرف سے خاص رعایات حاصل تھیں۔ بادشاہ کی مجلس مشاورت انہی امراء پر مشتمل ہوتی تھی۔ بعض اوقات بادشاہ ان امراء کو محصولات سے بھی مستثنیٰ کر دیتا تھا۔ یعنی وہ اپنے علاقوں سے مالیہ وصول کر کے شاہی خزانے میں جمع کرانے کے بجائے خود اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

داریوش اعظم نے ملک کو مختلف صوبوں (ساتراپی) میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر صوبے کا حکمران ساتراپ کہلاتا تھا۔ سیاسی حالات کے مطابق صوبوں کی تعداد بڑھتی گھٹتی رہتی تھی۔ صوبوں میں مرکزی حیثیت میڈیا کو حاصل تھی۔ دوسرا اہم صوبہ پارس تھا۔ اہل پارس ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن جب اس صوبے سے بادشاہ کا گذر ہوتا تھا تو اہل پارس قیمتی تحائف پیش کرتے

تھے۔ ہر صوبے کے لئے ٹیکس کی شرح مختلف تھی۔ سب سے زیادہ ٹیکس بابل پر عائد تھا۔ اس سے کم مصر[22] پر اور سب سے کم مکران پر۔

ہخامنشی عہد میں امراء کی عورتیں پردے میں رہتی تھیں۔ ان عورتوں کا کام کاج کرنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش لوگوں کی عورتیں البتہ بے پردہ رہتی تھیں۔ معاشرے میں ایک سے زائد شادیوں کا عام رواج تھا۔ شادی خونی رشتہ داروں کے مابین (یعنی ماں بیٹے، باپ بیٹی اور بہن بھائی کے مابین) بھی ہو جاتی تھی۔

مذہباً ہخامنشی آل ماد کے مذہب پر تھے۔ آہورا مزدا ان کے نزدیک خالق کائنات تھا۔ آگ کو مظہر خداوندی سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس امر میں شبہ ہے کہ ہخامنشیوں کا مذہب زرتشتی تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے ایرانیوں میں چند عیوب نمایاں تھے جن میں شراب سرفہرست تھی۔ ورزش اور کھیل کے رسیا تھے، صلح و امن کے زمانے میں بادشاہوں کا پسندیدہ مشغلہ شکار تھا۔ ایرانی سالگرہ کی تقاریب نہایت اہتمام سے مناتے تھے۔ کثیر الاولاد افراد معاشرے میں لائق احترام سمجھے جاتے تھے۔ جھوٹ اور ناپاکی سخت ناپسندیدہ امور تھے۔

ہخامنشیوں کا عہد تعمیراتی نکتہ نظر سے بہت اہم ہے۔ ایرانیوں نے اپنے عروج کے مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر شہر آباد کئے۔ محلات تعمیر کرائے اور دیگر شاندار عمارتیں بنوائیں۔ سب سے پہلے میدیوں نے ہمدان (امدان) شہر بسایا تھا۔ پارسیوں نے بھی ان ہی کی تقلید کرتے ہوئے دو شہر پرسوشں اور پرساگرد آباد کئے، جن میں سے آخر الذکر دارا اول کے ابتدائی عہد تک اس عظیم مملکت کا پایہ تخت رہا۔ دارا اول کے عہد میں اصطخر (جو یونانی زبان میں پرسی پالس کے نام سے مشہور ہے) کی عظمت کا دور شروع ہوا۔ اسی کی حدود میں تخت جمشید واقع ہے۔ اصطخر ہخامنشیوں کا پایہ تخت تھا جب کہ آل ماد کا پایہ تخت باختر (بلخ) رہا تھا۔ تخت جمشید کی صناعی و کاریگری کے بارے میں تفصیلات پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تاہم اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ہخامنشیوں کی زبان قدیم فارسی تھی۔ قدیم فارسی کا رسم الخط (Cuniform Script) کہلاتا ہے جو بائیں سے دائیں طرف کو لکھا جاتا تھا۔ یہ رسم الخط بابل و نینوا میں رائج

تھا۔ وہیں سے ایرانیوں نے اپنایا اور ترقی دی۔

سکندر اور خاندان سلوکیاں:

مقدونیہ کے یونانی بادشاہ سکندر کی ایشیائی مہمات کی ایک کڑی ایران پر اس کا قبضہ بھی تھا۔ مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس (فلپ) جو مقدونیہ کو یونانی ریاستوں کی قیادت کے منصب پر پہنچا چکا تھا، کا منصوبہ تھا کہ ایشیائے کوچک میں جو یونانی شہر ہیں انہیں سلطنت ایران کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ نیز دارا اوّل (دارایوش اعظم ۵۲۱ ق م تا ۴۸۵ ق م) اور خشارشیا (زرکیسز ۴۸۵ ق م تا ۴۶۶ ق م) سے جو حملہ آور کی حیثیت سے یونان آئے اور مقدونیہ اور تھریس پر چڑھائی کی تھی، اس ہزیمت کا بدلہ لیا جائے۔ وہ خود تو بے وقت قتل ہو جانے کی وجہ سے اس منصوبہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا البتہ اس کے اولوالعزم فرزند سکندر نے باپ کے اس منصوبہ پر عمل کیا۔ وہ ایک زبردست فوج لے کر مقدونیہ سے چلا اور فتوحات کرتا ہوا پنجاب تک آ پہنچا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں ایران، یونانی مقبوضہ بن گیا۔ آخری ہخامنشی حکمران دارا سوئم اور سکندر کے مابین آخری فیصلہ کن جنگ میں دارا کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۳۳۰ ق م میں ہخامنشیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا خاتمہ دراصل ایران کی قومی حکومت کا خاتمہ تھا۔ ایران پر اب اجنبی یونانیوں کا تسلط تھا جن کی تہذیب وتمدن مذہب واخلاقیات ایرانیوں سے مختلف تھے۔

سکندر نے فتح کے بعد باختر میں جو ہنگامہ قتال کیا اور جس طرح تخت جمشید کو جلوایا اس کی توجیہ مغربی اور یونانی مورخین یہ پیش کرتے ہیں کہ خشارشیا نے بھی ایتھنز میں یونانی مندر تباہ کئے تھے۔ لیکن سکندر نے جس طرح صور (Tyre) کے شہر کو فتح کرنے کے بعد وہاں عام شہریوں کے قتل کا حکم دیا جس کے نتیجہ میں کوئی دو ہزار آدمیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور تیس ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا[۲۳] اور غزہ جو پانچ فلسطینی شہروں کا سرتاج تھا، فتح کے بعد جس طرح تاراج کیا گیا۔ اور فوج کے سالار کو جو ایک خواجہ سرا تھا سکندر کی گاڑی کے پیچھے باندھ کر شہر کے اردگرد پھرایا گیا اور غزہ کی پوری آبادی غلام بنا کر بیچ ڈالی گئی۔[۲۴] سکندر کے کردار پر ایسے بدنما

داغ ہیں جن کی کوئی معذرت تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ تخت جمشید کے جلانے کے نتیجہ میں شاہی کتب خانے کو بھی آگ لگی جس کی وجہ سے اوستا کا نسخہ بھی جل گیا۔ سکندر نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان موبدوں کو بھی قتل کر دیا جن کو اوستا از بر تھی۔

سکندر نے دارا کی بیٹی روشنک (رخسانہ) سے شادی کی جس سے اسکا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ روشنک کے علاوہ شاہی خاندان کی دو اور شہزادیوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کیا۔ پنجاب سے واپسی کے بعد بابل میں بخت نصر کے محل میں شراب نوشی اور عیش وعشرت میں مشغول ہو گیا اور ساڑھے بتیس سال کی عمر میں بخت نصر کے محل ہی میں وفات پائی۔ (۳۲۳ ق م)

سکندر کے بعد اس کی وسیع سلطنت اس کے جرنیلوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ مصر بطلیموس کے قبضے میں آیا اور ایران پر اٹھارہ سال کی کشمکش کے بعد سلوکس نے اپنا تسلط جمایا اور ۳۱۲ ق م تا ۲۸۱ ق م حکومت کی۔ اس نے پہلے بابل کو اپنا مستقر بنایا اور پھر عراق میں ایک شہر ''سلوکیہ'' (دریائے دجلہ کے کنارے) اور شام میں ''انطاکیہ'' آباد کر کے ان کو مشرقی و مغربی اقالیم کا پایہ تخت قرار دیا۔ اس کی موت کے بعد یہ سلطنت اس کے خاندان میں موروثی طور پر منتقل ہوتی رہی۔ اس خاندان میں بارہ حکمران گزرے۔ آخری سلوکی حکمراں انطیوکس ہفتم تھا جس نے ۱۳۸ ق م تا ۱۲۹ ق م تک حکومت کی۔

سکندر کی حکومت کے دوران ایک طرف تو ایرانیوں کی قومی خصوصیات زائل کرنے کا عمل تیزی سے جاری رہا اور اس مقصد کے لئے سکندر نے ایشیائی مقبوضات میں ستر نئے شہر آباد کرائے۔ جنہیں یونانی حضارت کے مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ [۲۵] تو دوسری طرف مذہب زرتشت کو بہت صدمہ پہنچا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اوستا جل گئی، سینکڑوں کی تعداد میں موبدوں کو قتل کر دیا گیا۔ یہودی اور زرتشتی جلا وطن یا معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ سکندر کی یہی پالیسی اس کے جانشینوں نے اپنائی۔ زرتشتیوں کو سکندر اور اس کے جانشینوں سے جو نفرت تھی اس کا اظہار اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انطیوکس چہارم (۱۷۴ ق م تا ۱۶۴ ق م) کو اہریمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ [۲۶]

اشکانی عہد (۲۴۹ ق م تا ۲۲۶ ق م):

سکندر کی موت کے سو سال بعد اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے ایرانی مملکت کے مقبوضات رفتہ رفتہ نکلنے لگے۔ سلیوکی حکومت کے خاتمے کا آغاز پارت یا پارتھیا (خراسان) کے اشکانی خاندان کے مورث اعلیٰ ارشک اول (*Arsaces I*) ۲۴۹ ق م تا ۲۴۷ ق م کے ہاتھوں قتل ہوا جس نے اشکانی عہد کی بنیاد رکھی۔

اشکانی بھی آریائی تھے جو قبیلہ ماد اور پارس کی طرح وسط ایشیا (بحیرہ خزر کے مشرقی علاقوں) سے آکر موجودہ خراسان، جو اس وقت پارت یا پارتھیا کہلاتا تھا، میں آباد ہوئے اور یہیں ارشک اول کے ہاتھوں دولت اشکانیاں کی تاسیس ہوئی۔ تقریباً ایک صدی تک اشکانیوں کی یہ حکومت سلیوکیوں کی حکومت کے متوازی چلتی رہی۔ پھر جب اشکانی حکومت کو استحکام نصیب ہو گیا تو سلوکیوں کا ایران سے مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان میں اٹھائیس بادشاہ گزرے۔

مسعودی سمیت اکثر مورخین اس دور کو ''ملوک الطّوائف'' کا دور لکھتے ہیں۔ اس خاندان کا ابتدائی عہد قدرے بہتر تھا اور چند فرمانرواوں کو تاریخی اہمیت بھی حاصل تھی مگر بلاشک و شبہ اس کا آخری دور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ پراگندہ حالات میں تہذیبیں پروان نہیں چڑھا کرتیں۔ لہٰذا اس عہد کی تہذیب کی کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ ہخامنشیوں کا تہذیبی دوران سے بدرجہا بہتر تھا۔ اس عہد میں سیاسی پراگندگی کے پہلو بہ پہلو معاشرتی پراگندگی بھی نظر آتی ہے۔ شراب نوشی، رقص و موسیقی کا رجحان جو کہ پہلے سے موجود تھا اب بہت زیادہ بڑھ گیا۔ عورتوں کا سماجی مرتبہ بھی ہخامنشی عہد کے مقابلے میں کمتر ہو گیا تھا۔ فرہاد پنجم یعنی ارشک پانزدہم (۲ ق م تا ۴ء) کی مثال کو چھوڑ کر کہ وہ اپنی ماں کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا اور حکومت کی باگ دوڑ بہت حد تک اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اشکانی عہد کی شاہی عورتوں کا امور سلطنت میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

فن تعمیر اور سنگ تراشی سے بھی اشکانیوں کو کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لحاظ سے بابل، آسور اور ایران کے ہخامنشی بادشاہوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت فروتر ہے۔ سکندر

اعظم کے حملے سے ساسانی دور کے آغاز تک فن تعمیر کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ملتا جو اس دور کی یادگار کہلا سکے۔ ۲۷

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے چند ایسے شواہد ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ارشک بیست و یکم یعنی واردان دوئم (Vardanes II) کے عہد تک (۵۱ء) وہ قدیم آریائی مذہب پر قائم رہے۔ آریائی معبودوں کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کی ارواح کی پرستش بھی کرتے رہے۔ ارشک بیست و دوئم یعنی بلاش اول (۵۱ء تا ۷۷ء) کے عہد میں زرتشتی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ ازاں بعد ارشک بیست و ششم یعنی بلاش سوئم (۱۴۸ء تا ۱۹۱ء) کے عہد میں اوستا کی تدوین نو کی گئی اور اس کی تفسیر لکھی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ آریائی پروہتوں یعنی مغ یا مجوس کی حیثیت بھی کم کردی گئی۔ اور ان کی جگہ محافظین آتشکدہ یعنی آدروان نے لے لی۔

ساسانی عہد (۲۲۶ء تا ۶۵۳ء):

ساسانیوں سے ایران کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو کئی اعتبار سے شاندار ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی معنوں میں تاریخی بھی ہے۔ یہ دور ''عہد قدیم'' سے شروع ہو کر ''عہد وسطیٰ'' میں ختم ہوتا ہے جب حجاز میں اسلام کا آغاز ہوا تو یہ عظیم الشان سلطنت اپنے عرصہ زوال میں تھی۔

ساسانی عہد کا موسس اردشیر بابکان تھا جس کے باپ کا نام بابک اور دادا کا نام ساسان ۲۸ تھا۔ اردشیر نے ۲۲۰ء میں آخری آشکانی بادشاہ اردوان کو شکست دے کر اپنے مورث اعلیٰ ساسان کی نسبت سے ساسانی عہد کا آغاز کیا۔ اس خاندان نے چار سو چھبیس سال ایران کے وسیع علاقوں پر شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس خاندان میں ۳۷ حکمران گزرے جن میں دو خواتین پوران دخت دختر خسرو پرویز (۶۳۰ء تا ۶۳۱ء) اور آذرمی دخت دختر خسرو پرویز (۶۳۱ء) بھی شامل ہیں۔ آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوئم تھا۔ ۲۹ (۶۳۲ء تا ۶۵۲ء) جس کو ۶۴۲ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اور ایران پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

جہاں تک اس عہد کی تہذیب کا تعلق ہے ہخامنشیوں کے بعد یہی عہد قابل ذکر ہے۔ خود ساسانی بادشاہوں کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ ہخامنشیوں کے حقیقی وارث ہیں۔ انہوں نے اشکانیوں کی طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایک مستحکم حکومت قائم کی اور اشکانی تہذیب کے رہے سہے یونانی اثرات کو مٹا کر قدیم ایرانی روایات کو دوبارہ زندہ کیا۔ یوں وہ ہخامنشیوں کے حقیقی وارث ثابت ہوئے۔

ایرانی تہذیب میں سب سے بڑا نمایاں عنصر شہنشاہیت کا ہے۔ جس کا براہِ راست اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑا ہے۔ ایرانی بادشاہ عموماً اور ساسانی بادشاہ خصوصاً اپنی سطوت و ہیبت، عظمت و جلال اور شاہانہ کروفر کے لئے تاریخ میں مشہور رہے ہیں۔ ساسانی بادشاہ عموماً لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے۔ بادشاہ اور درباریوں کے مابین پردہ حائل ہوتا تھا۔ آداب شاہی کو شدت سے ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔ خلاف ورزی کی صورت میں قتل تک کی سزا دی جا سکتی تھی۔[30]

بادشاہ کا لباس اور تاج و تخت، زر و جواہر اور سونے چاندی سے پٹا ہوا ہوتا تھا۔ بادشاہ کے ذاتی تحفظ کے لئے فوج کا ایک خاص دستہ متعین ہوتا تھا۔ جس کی سالاری بہت ہی معتمد اور اکثر شاہی خاندان کے کسی فرد کے سپرد کی جاتی تھی۔ ان محافظوں کے چمکدار دستے، وردیاں اور زرہیں نیز بادشاہ کا تاج اور زریں لباس لوگوں کے دلوں پر ایسی ہیبت ڈالتا تھا کہ ہر خاص و عام کا سر جھک جاتا تھا اور بعض بے ساختہ گر پڑتے تھے۔[31]

ایرانی بادشاہ شاہانہ کروفر پر بے دریغ خرچ کرتے تھے اور بے انتہا ذخیرہ کرتے تھے۔ خسرو دوئم نے ۸-۷۰۶ء میں طسیفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶,۸۰,۰۰,۰۰۰) مثقال سونا تھا۔[32] حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں تقریباً اسی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا۔ خسرو دوئم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا۔ پورے تاج کا وزن ساڑھے ۹۱ کلو (تقریباً ڈھائی من) تھا۔ یہ تاج جو سونے اور چاندی سے بنا ہوا اور زمرد یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا، بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعہ لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی

کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آ کر نہ دیکھی جائے نظر نہیں آتی تھی۔ اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا تھا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اسے اٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔ ۳۳

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں شہنشاہیت ہوتی ہے وہاں ایک مصنوعی معاشرت، پر عشرت زندگی اور عیش پرستی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ بات خصوصیت سے ایرانی تہذیب پر صادق آتی ہے۔ ایرانی سرتاپا ایک مصنوعی تہذیب، بے جا رسوم و آداب اور رکھ رکھاؤ اور پر تصنع زندگی میں غرق تھے۔ تکلفات زندگی تعیشات اور سامان آرائش کی وہ بہتات تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

''کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں۔ پچاس ہزار اصیل گھوڑے، اس قدر سامان تعیش، محلات، نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کا محل اپنی شان و شوکت اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا۔'' ۳۴ ''تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہان ایران کی طرح داد عیش دی ہو۔ جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو مشرق اوسط اور مشرق اقصیٰ کے درمیان موجود تھے۔'' ۳۵

اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی، عراق عجم سے بے دخل ہوئے تو انہوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ عربوں کو ساسانیوں کے دارالسلطنت مدائن کی فتح میں ایسے خیمے ملے جو سربمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب سمجھے کہ اس میں کھانے پینے کا سامان ہوگا کھولنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سونے چاندی کے برتن ہیں۔

مورخین نے فرش بہار کی (جس پر ایرانی امراء موسم خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''یہ ساٹھ گز مربع تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی۔ جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی۔ چمن تھے جن میں پھولدار اور پھل دار درخت قائم تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی، اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے۔ گرد ہیرے کی جدول تھی۔ درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں۔ اور یہ سب

جواہرات کی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجداران آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ ۳۶؎

معاشرتی طور پر عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ متوسط طبقہ، اعلیٰ طبقے کی نقالی کرتا ہے۔ یہی حال ایران کا تھا۔ امراء شاہی خاندان کی اور متوسط طبقہ، طبقہ امراء کی نقالی کرتا اور اپنے معیار زندگی کو ان جیسا بنانے کی کوشش کرتا جس سے معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی تھی۔ طبقہ امراء کا ایک ایک شخص اپنی ذات اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے ایک پوری بستی کی ضروریات زندگی پوری کی جاسکتی تھیں۔ مثلاً اہل ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی حیثیت کے مطابق ہوتی تھی۔ ہرمز کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جس کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہٰذا اس کی کلاہ کی قیمت ایک لاکھ تھی جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ ازادبہ، کسریٰ کے عہد میں حیرہ کا حاکم تھا، اس کی کلاہ کی قیمت پچاس ہزار تھی۔ رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی جب کہ اس کی قیمت ایک لاکھ تھی۔ ۳۷؎

ایرانی اس جان لیوا تکلفات اور شدید تصنع کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ اس کے بغیر ان کے نزدیک زندگی کا کوئی تصور نہ تھا۔ مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہ ایران یزدگرد کو جب دارالحکومت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو اس پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ "ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار باز داد اور بہت سے دوسرے لوگوں کو لیتا گیا۔ اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی۔" ۳۸؎

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی مرتبہ مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا۔ پانی ایک موٹے سے پیالے میں لایا گیا۔ اس نے کہا چاہے میں پیاسا مر جاؤں اس بھدے پیالے میں پانی پینا میرے لئے ممکن نہیں چنانچہ اس کے لئے تلاش کر کے دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وہ پی سکا۔ ۳۹؎

ساسانی عہد کے تقریباً تمام ہی بادشاہ شراب و شکار اور رقص و موسیقی کے رسیا تھے۔ بادشاہ محل کے اندر چوسر شطرنج سے دل بہلاتا تھا۔ چوگان کا عام رواج ہو گیا تھا۔

ایرانی تہذیب میں معاشرتی طبقات شروع سے ہی نظر آتے ہیں لیکن ساسانی عہد میں طبقات کی تقسیم بہت زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ اعلیٰ طبقہ، شاہی خاندان اور ایرانی امراء کے مشہور سات خاندانوں پر مبنی تھا۔ اس طبقے کے لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے تھے۔ ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ و گلاب میں نہاتے، یہ لوگ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے۔[۴۰]

اس کے بعد عوام الناس تھے جن میں ایک طبقہ مذہبی علماء کا تھا۔ اس طبقے کے کچھ علماء مقدمات و معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ جنہیں ''دادور'' کہتے تھے۔ کچھ علماء تبلیغ و اشاعت کا کام کرتے تھے۔ جس کے رئیس کو ''موبد موبدان'' کہتے تھے جو درحقیقت زرتشتی دنیا کا پیشوائے اعظم ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت بے شمار موبد اور موبدوں کے ماتحت ''ہیربد'' ہوتے تھے جو آتش کدوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ہیربدوں کا رئیس ''ہیر ہیربداں'' کہلاتا تھا۔ علما کا سب سے نچلا طبقہ مغوں کا تھا جن کے رئیس کو ''مغ مغاں'' کہتے تھے۔

عوام الناس کا دوسرا طبقہ ملکی محافظوں یعنی فوجیوں پر مشتمل تھا۔ تیسرا طبقہ دبیروں کا تھا۔ جن میں ادیب، شاعر، محاسب، فرمان نویس، منجم، طبیب، افسر مالیات وغیرہ شامل تھے۔ ایک اور طبقہ اہل حرفہ کا تھا اور سب سے نچلا طبقہ کسانوں کا تھا۔

یہ طبقے مستقل اور موروثی تھے جن کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ ان طبقات میں سے اگر کسی طبقے کا کوئی شخص کسی دوسرے طبقے میں شامل ہونا چاہتا تھا تو یہ ممکن نہ تھا۔ جس طرح اعلیٰ طبقے کی زندگی سراسر عیش و طرب کی تھی اسی طرح نچلے طبقے کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی۔ کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی۔ وہ اپنی زمینوں کے ساتھ بندھے رہتے تھے ان سے ہر قسم کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ تقریباً ایسا ہی تھا جیسا غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ۔ ان بے چارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے گویا ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی تھی اور کسی قسم کی تنخواہ یا اجرت سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔[۴۱]

رہ گیا متوسط طبقہ تو ان کی کمر نت نئے ٹیکسوں نے توڑ رکھی تھی۔ ان پر دو طرفہ مصیبت تھی ایک تو اعلیٰ طبقہ کی نقالی کی وجہ سے انہوں نے اپنا معیار زندگی بڑھا رکھا تھا جس کے لئے انہیں بے تحاشا اخراجات برداشت کرتے پڑتے تھے۔ تو دوسری طرف محاصل اور نذرانے پیش کرنا۔ ساسانی عہد میں بادشاہ کو نذرانے پیش کرنے کا دستور بھی تھا جس کو ''آئین'' [۴۲] کہتے تھے۔ اس آئین کے مطابق، عید نو روز اور جشن مہرگاں [۴۳] کے موقع پر قیمتی تحائف اور بھاری نذرانے وصول کئے جاتے تھے۔ اس کی نوعیت بھی سرکاری محصول کی ہو گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ جب زندگی کے معیار کا یہ عالم ہو کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم پٹکا باندھنا اور تاج پہننا معیوب سمجھا جاتا ہو اور اگر کسی امیر کے پاس نہایت بلند ایوان، فوارہ، حمام، باغات، تیار جانور، اور خوشرو غلام نہ ہوتے، کھانے پینے میں وسعت و تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، تو ایسی صورت میں امراء و بادشاہ کے لئے رقوم کی فراہمی کا یہی ذریعہ رہ جاتا ہے کہ عوام پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جائیں۔ [۴۴]

المختصر ساسانی عہد میں جس قدر تعیّشات میں اضافہ ہوا اسی قدر عوام پر محاصل کا بوجھ پڑا۔ اس عہد میں ایک نیا محصول عائد کیا گیا جسے ''گزیت'' (Gizyat) کہتے تھے (یہی لفظ عربی میں ''جزیہ'' بن گیا) یہ ذاتی محصول تھا جو بالعموم عیسائیوں اور یہودیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ سرکاری لگان ''خراک'' (جو عربی میں خراج بن گیا) پیداوار کا تیسرا تا چھٹا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی وصولی میں بہت سختی کی جاتی تھی اور اس سے رعایا بھی بہت تنگ تھی۔ [۴۵]

ساسانی عہد مذہبی اعتبار سے بھی شدید افراط و تفریط کا شکار نظر آتا ہے۔ یوں تو اس عہد میں مذہب زرتشت باقاعدہ سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اوستا اور ژند کی تدوین نو کی گئی، آتش کدے تعمیر کئے گئے اور ان کے اخراجات کے لئے جاگیریں وقف کی گئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایران میں مانی اور مزدک کے ظہور نے مذہبی و معاشرتی پراگندگی عام کر دی۔

مانی:

دوسرے ساسانی فرمانروا شاپور اول (۲۴۰ء تا ۲۷۲ء) کے زمانے میں مانی کا ظہور ہوا۔ یہ نیم ایرانی ۱۲ھ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بابل میں پیدا ہوا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ اس کی ماں اشکانی خاندان کی ایک شہزادی تھی اور باپ جس کا نام ابن الندیم کی الفہرست کے مطابق ''فوتق'' تھا عیسائیوں کے فرقہ مغتسلہ سے تعلق رکھتا تھا اور مانی کی ابتدائی تعلیم انہی عقائد کے مطابق ہوئی۔ مانی نے ۲۴ سال کی عمر میں شاہ پور کی تاج پوشی کے دن اپنی نبوت کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ میں فارقلیط (Paraclet) ہوں جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ شاہی خاندان میں سب سے پہلے شاہ پور کے بھائی فیروز نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور شاید اسی کی وساطت سے مانی کی رسائی شاہ پور کے دربار میں ہوئی۔ شاہ پور نے بھی یہ مذہب قبول کر لیا جس کی وجہ سے مانویت تیزی سے ایران میں پھیلنے لگی اور تقریباً دس سال تک مانی آزادانہ ایران میں تبلیغ کرتا رہا۔

اس نئی صورت حال سے دین زرتشت کے مذہبی قائدین خوش نہیں تھے۔ وہ مانویت کو بدعت خیال کرتے تھے اور اس کے سدباب کے لئے بالاآخر انہوں نے شاہ پور کی اجازت سے دربار کے اندر مانی سے مناظرہ کیا اور اسے شکست دی۔ اپنے پیغمبر کی شکست سے شاہ پور اس قدر بددل ہوا کہ اس نے مانی کے قتل کا حکم دے دیا مگر مانی کسی طرح بچ نکلا اور کشمیر و تبت کا دورہ کرتا ہوا چینی ترکستان پہنچا، جہاں اس کے مذہب کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

شاہ پور کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا ہرمز تخت نشین ہوا تو مانی کو ایران آنے کی دعوت دی گئی۔ مانی ایران واپس آیا تو اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا گیا لیکن دو سال سے بھی کم مدت حکمران رہ کر جب ہرمز وفات پا گیا تو اس کا بھائی بہرام تخت نشین ہوا۔ مانی نے بہرام کے سامنے بھی اپنے عقائد پیش کیے۔ بہرام نے موبدوں اور مانی کے مابین دوبارہ مناظرہ کرایا جس میں مانی کو پھر شکست ہوئی۔ اس بار مانی کو گرفتار کر کے بڑی بے دردی سے مارا گیا، اس کی کھال

کھینچی گئی اور اس میں بھس بھر کر جندی شاہ پور کے دروازے پر لٹکا دی گئی جس کی نسبت سے یہ اب تک ''دروازہ مانی'' کے نام سے موسوم ہے۔ ۲۷۵ء میں جب کہ وہ ہلاک کیا گیا اس کی عمر ساٹھ سال تھی۔اس کے بعد اس کے پیروؤں پر مصیبت آئی اور ہزاروں کی تعداد میں بڑی بے رحمی سے مارے گئے۔

مانی نے عیسائیت اور زرتشتیت کے امتزاج سے ایک نیا مذہب نکالا جسے ''مانویت'' کے نام سے شہرت ملی۔ زرتشت سے اس کا پہلا اختلاف یہ تھا کہ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد ثنویت پر رکھی وہ نور وظلمت اور خیر وشر کو مستقلاً دو علیحدہ علیحدہ ہستیوں پر قیاس کرتا ہے۔اس کے نزدیک جوہر دو ہیں تاریکی اور روشنی اور انہی دونوں کے ملنے سے کائنات پیدا ہوئی ہے۔ زرتشت اور مانی کی تعلیمات میں دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اول الذکر نے خیر وشر کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد اپنے متبعین کو خیر کی طرف بڑھنے کی تلقین کی۔ انہیں باعمل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے محنت پر آمادہ کیا، پیداوار اور نسل کو بڑھانے کی تلقین کی۔ فاقہ کشی، تجرد اور ترک دنیا کی سخت مخالفت کی۔ زرتشت نے نور وظلمت کی امیزش کو لازماً برا نہیں بتایا۔

اس کے برعکس مانی نے نور وظلمت کے اختلاط کو فی نفسہ برا سمجھا ہے اور چونکہ یہ مادی دنیا اسی اختلاط سے بنی ہے لہذا یہ بھی بری ہے چنانچہ مانی انسانوں کو تجرد اور ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اخلاقی تعلیمات میں حضرت موسیٰ کے احکام عشرہ کی طرح اس نے بھی دس احکام دیئے، جو بدھ اور عیسیٰ کی تعلیمات سے اخذ کئے گئے ہیں۔یعنی بت پرستی نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، بخل نہ کرو، کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو، حیلہ سازی و جادوگری سے بچو، مذہب کے معاملے میں شک کو دل میں جگہ نہ دو، کاموں میں سستی نہ کرو، دن رات میں ۴ (یا سات) مرتبہ نماز پڑھو۔

یہ دس احکام عام پیروؤں کے لئے ہیں جنہیں ''سماعون'' یا ''شنندگان'' ۴۷ کہا گیا ہے۔خواص کے لئے مزید تین احکام اور ہیں جن میں شہوات ولذات سے پرہیز، گوشت اور شراب سے پرہیز اور عورت سے مکمل علیحدگی شامل ہیں۔خواص کو صدیقون (برگزیدان) ۴۸ کہا

گیا ہے۔

مانی سے سات کتابیں منسوب ہیں۔ جو ایک نئے رسم الخط میں تھیں جن کا بانی مانی خود تھا۔ یہ خط سریانی و فارسی کے بین بین تھا۔ ان کتابوں میں سے اب کوئی بھی موجود نہیں ہے البتہ ان کے اقتباسات مسلم مورخین کی کتابوں اور پہلوی تصانیف میں مل جاتے ہیں۔

ندوی کا خیال ہے کہ مانی کی یہ مذہبی تحریک دراصل ایران کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت ردعمل کا نتیجہ تھی۔ ایران صدیوں سے اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھا۔ خونی رشتوں کی بھی ان کے نزدیک حرمت نہ تھی۔ جن خونی رشتوں میں ازدواجی تعلقات، متمدن اور معتدل علاقوں کے باشندوں کے نزدیک ہمیشہ ناجائز، غیر قانونی اور ناپسندیدہ رہے ہیں، وہ ایرانیوں کے نزدیک جائز اور قانونی تھے۔ یزدگرد دوئم جس نے پانچویں صدی کے عشرے میں حکومت کی ہے، اس نے اپنی بیٹی کو اپنی زوجیت میں رکھا اور پھر قتل کرادیا۔ [۴۹] بہرام نے جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمران تھا اپنی بہن سے شادی کی تھی۔

معاشرے میں پھیلی ہوئی اسی اخلاقی ابتری کے ردعمل کے طور پر مانی کی مذہبی تحریک سامنے آئی جس نے ترک دنیا اور تجرد کی زندگی پر زور دیا اور نکاح کو حرام قرار دیا تا کہ انسان جلد فنا ہو جائے اور یوں ظلمت پر دائمی فتح حاصل کرلے۔

مزدک:

ایک اور مذہبی تحریک جو غالباً ''مانویت'' کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی ''مزدکیت'' ہے۔ مزدک ایرانی الاصل تھا۔ اس کے باپ کا نام بامدار تھا۔ ساسانی بادشاہ قباد اول (۴۸۷ء تا ۵۳۱ء) کے عہد میں اس نے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ اس زمانے میں ملک کے اندر امراء اور مذہبی پیشواؤں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ غالباً اسی بناء پر قباد نے مزدکی مذہب قبول کرلیا۔ بادشاہ کی حمایت حاصل ہو جانے سے ایک طرف تو مزدکیت کو فائدہ پہنچا مگر دوسری طرف خود قباد کو مزدکیت قبول کرنے کی وجہ سے تاج وتخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لہٰذا چند سال بعد، بعد از خرابی

بسیار جب وہ دوبارہ تخت نشینی میں کامیاب ہوا تو اس نے نہ صرف مزدکیوں کی حمایت و سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا بلکہ ان کے سدباب کے لئے ایک مذہبی کانفرنس منعقد کی جس میں مزدکیوں کے سرکردہ رہنماؤں کو زرتشتی عالموں سے مناظرے کی دعوت دی گئی۔ اس میں مزدکیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شکست کا اعلان ہونا تھا کہ سپاہی مزدکیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا قتل عام شروع ہوگیا۔ مزدکی پیشوا سب کے سب مارے گئے۔ ان میں خود مزدک بھی تھا۔ ان کی سب جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ ۵۰

قباد کے بعد نوشیرواں عادل کی حکومت شروع ہوئی وہ بھی مزدکیوں کا سخت مخالف تھا لیکن بادشاہوں کی شدید مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود مزدکیت کلیتہ ناپید نہ ہوسکی۔ عباسی عہد میں بابک خرمی نے اسی نظریئے کی تبلیغ کر کے مامون الرشید کی حکومت کو سخت پریشان کیا تھا۔

مزدک کے عقائد مانویت سے ماخوذ تھے۔ وہ بھی مانی کی طرح نور و ظلمت دو قدیم جوہروں کا قائل تھا تاہم اس کی تعلیمات کا سب سے اہم حصہ اشتراکیت اور اشتمالیت سے متعلق ہے۔ اس کے مذہب کو اشتراکیت کی ابتدائی صورت سمجھنا چاہئے۔ اس کا خیال تھا کہ تمام ناہمواری، ظلم، حسد، کینہ، حرص اور جنگ و جدل (جو کہ اہرمن کی طرف سے ہے) کا اصل سبب عورت اور دولت ہے جس پر انسان مالکانہ قبضہ رکھنا چاہتا ہے۔ ملکیت کا یہ تصور فتنہ و فساد کی جڑ اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے لہٰذا عورت اور دولت کو ذاتی تصرف سے آزاد کیا جائے اور ان پر تمام لوگوں کا مساوی حق تسلیم کیا جائے۔

مزدک کی یہ تحریک شروع شروع میں مذہبی تھی رفتہ رفتہ سیاسی رنگ اختیار کر گئی۔ قباد نے جب یہ مذہب اختیار کیا تو ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ ہر طرف اشتراکیت کا پرچار ہونے لگا۔ نوجوانوں اور عیش پسندوں کی مراد بر آئی۔ جنسی انارکی اور شہوانی بحران بڑھنے لگا۔ ''اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مزدک اور مزدکیوں کے پرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے۔ اس تحریک کا اتنا زور ہوا کہ جو چاہتا جس کے گھر میں گھس آتا اور مال و زن پر قبضہ کر لیتا اور صاحب مکان کچھ نہ کر سکتا۔۔۔ نہ باپ اپنے

لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو۔ کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار و قبضہ نہ تھا۔'' ۵۱؎

معاشرے سے ناموس کا پردہ اٹھ گیا۔ بے غیرتی اور بے حیائی بڑھنے لگی۔ کسانوں نے بھی بغاوتیں برپا کیں رفتہ رفتہ زمینیں غیر آباد ہونے لگیں اور مملکت کو شدید نقصان پہنچا۔ مزدکی تعلیمات کی وجہ سے ایرانی معاشرے میں عورتوں کی حیثیت پر بھی کاری ضرب لگی۔ یوں تو ایرانی تہذیب کے کسی بھی دور میں عورت کی ہمیں کوئی اونچی حیثیت نظر نہیں آتی۔ زرتشتی مذہب میں سگی بہنوں اور بیٹیوں سے شادی جائز تھی۔ بیویوں کی کثرت مذہباً قابل انعام بات تھی۔ بیویوں کے علاوہ لاتعداد لونڈیاں بھی ہوتی تھی۔ ایرانی جنسی تعلقات کے معاملات میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہیں تھے۔ ایران میں عورتوں کی نگرانی کے لئے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ یہ دستور بذات خود شرمناک اور مذموم تھا۔ اس پر مستزاد مزدکی تعلیمات تھیں، جس نے معاشرے کے اندر عورتوں کی رہی سہی عزت و تکریم پر آخری کاری ضرب لگا کر، دیگر جائیدادوں کی طرح ان کو بھی حصول لذت و منفعت کا ایک ذریعہ بنادیا۔

چھٹی صدی اور ایرانی تہذیب:

اس میں کوئی شک نہیں کے ساسانیوں نے مادی اعتبار سے ترقیاں کیں، تعمیرات اور علوم وفنون میں قابل ذکر اضافے کئے۔ اشکانیوں کی طویل طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایک منظّم اور وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی ''جس کی وجہ سے ایران کی سیاسی آزادی یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہوگئی لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ اس کا احیاء حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔'' ۵۲؎

ان حالات میں عموماً مذہب، معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں لیکن ایران میں اٹھنے والی مذہبی تحریکات مثلاً زرتشت، مانی و مزدک کی تحریکات میں اتنی وسعت وصلاحیت نہیں تھی کہ ایرانی تہذیب کے زوال کو روک سکیں۔ مذہب زرتشت کئی اعتبار سے بہتر اصلاحی تحریک تھی لیکن اس کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ ایک صدی سے زیادہ یہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہ سکا تھا۔ امیر

علی کا خیال ہے کہ "سوسال بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں جن کا اس نے اپنے عہد طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔" (روح الاسلام)

اوراق گذشتہ اس بات پر شاہد ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی تک آتے آتے ایرانی تہذیب کی بنیادیں پوری طرح کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اس کے پاس نوع انسانی کی بقاوسلامتی اور تہذیب نفس کے لئے کوئی پیغام نہیں رہ گیا تو مشیت کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ کسی ایسے پیغام کے ساتھ ایک پیغامبر کو بھیجا جائے جو انسانیت کی فلاح کا کام کر سکے۔

❧ ♦ ☙

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، جلد۳، ص ۲۶۷، (مادہ: ایران) دانشگاہِ پنجاب، لاہور

۲۔ ایضاً

۳۔ سوسا یا سوس یا شوش، عیلام کا دارالحکومت تھا اور عیلام عراق کا ایک علاقہ تھا۔

۴۔ پروفیسر اے۔ جے۔ آربری، میراث ایران، ص۴، مترجم سیّد عابد علی عابد، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۵۔ امیر علی، سیّد، روح الاسلام، ص۳۰۔

۶۔ عین الحق، قدیم مشرق، ص۲۲۔

۷۔ ایضاً، ص۲۱۔ ۸۔ ایضاً۔

۹۔ بدخشانی، مقبول بیگ، تاریخ ایران، لاہور ۱۹۶۷ء، جلد اوّل، ص ۲۹-۲۰۔

۱۰۔ قدیم مشرق، ص۱۳۳۔ ۱۱۔ ایضاً، ص۱۳۴۔

۱۲۔ ایضاً۔ ۱۳۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص۱۳۶۔

۱۵۔ برنارڈ گرن *The Time Tables of History*، نیویارک، ۱۹۸۲ء، ص۸۔ برنارڈ گرن، زرتشت کی پیدائش ۶۳۰ ق م اور وفات ۵۵۳ ق م بتاتے ہیں۔ بدخشانی زرتشت کی

پیدائش ٦٦٠ ق م اور وفات ۵۵۳ ق م لکھتے ہیں۔

١٦ ڈاکٹر ہاگ کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اقبال کا کہنا ہے کہ "ایران قدیم کا پیغمبر (زرتشت) دینیاتی نقطہء نظر سے موحد اور فلسفیانہ نقطہء نظر سے ثنویہ تھا (بحوالہ فلسفہ عجم، ص ۲۲)

١٧ ڈاکٹر محمد اقبال، فلسفہ ء عجم، ص ۲٦، مترجم میر حسن الدین، کراچی ١٩٦٩ء۔

١٨ خود زرتشت نے تین شادیاں کیں۔ ان کی اولادوں میں تین بیٹیوں اور بیٹوں کا نام ملتا ہے۔ (بحوالہ قدیم مشرق، ص ١٣٨)

١٩ بدخشانی، ص ۳١۔

٢٠ اہل پارس کے سات ممتاز خاندان تھے، جن میں ایک ہخامنشیوں کا خاندان تھا۔ ہخامنشی پازارگد قبیلہ کا ایک امیر زادہ تھا، جس نے اپنے علاقے کے قبائل کو منظم و متحد کیا۔ اہل پارس کے نزدیک وہ بہت قابل احترام تھا۔

٢١ تاریخ ایران، جلد اوّل، ص ۵۵٧۔ ٢٢ ایضاً، جلد اوّل، ص ١٨٧۔

٢٣ حتی، فلپ، تاریخ شام، مترجم غلام رسول مہر، طبع اوّل ١٩٦٢ء، لاہور، ص ١٩٠۔

٢٤ ایضاً۔ ٢۵ ایضاً، ص ١٩٣۔

٢٦ امیر علی، ص ۳۵۔ ٢٧ تاریخ ایران، ص ۳١۳۔

٢٨ ساسان کی اپنی سیاسی و مذہبی حیثیت تھی۔ وہ صوبہ فارس کی ریاست نیسایہ (*Nisaya*) کے خاندان امراء سے تعلق رکھتا تھا نیز وہ اصطخر کے "آتش کدہ ناہید" (اناہتا) کا موبد بھی تھا۔ اپنی اس سیاسی و مذہبی پیشوائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اشکانیوں کی طوائف الملوکی کے پیش نظر عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ اس کے پوتے اردشیر بابکان نے جو باپ اور دادا سے زیادہ حوصلہ مند تھا بالآخر آخری اشکانی بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔

٢٩ ٦۴٢ء میں یزدگرد مسلمان فوجوں سے شکست کھا کر چینی ترکستان کی طرف بھاگ گیا۔ یہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد وہ دس سال اسی عالم روپوشی میں رہا۔ حضرت عثمان کے عہد میں جب عرب فوجوں نے مرو کا رخ کیا تو یزدگرد مایوسی کے عالم میں وہاں سے فرار ہوا اور ترکستان کی سرحد پر ایک لالچی پن چکی والے مرزبان ماھویہ، کے یہاں پناہ لی جس نے جواہرات کی لالچ میں یزدگرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ ٦۵٢ء کا واقعہ ہے۔

۳۰ قدیم مشرق، ص ۱۲۰۔ ۳۱ ایضاً، ص ۱۲۱۔

۳۲ کرسٹن سین، تاریخ ایران بعهد ساسانیاں، مترجم محمد اقبال، ص ۶۱۱۔

۳۳ ایضاً۔

۳۴ شاہین مکاریوس، تاریخ ایران، مصر، ۱۸۹۰ء، ص ۹۰۔

۳۵ ایضاً۔

۳۶ شرر، مولوی عبدالحلیم، تاریخ اسلام، جلد اول، ص ۳۵۴۔

۳۷ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۳۸ ایران بعهد ساسانیان، ص ۸۱۔

۳۹ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۱۶۱۔ ۴۰ ندوی، ص ۹۵۔

۴۱ ایران بعهد ساسانیان، ص ۴۲۴۔

۴۲ بدخشانی، تاریخ ایران، ص ۵۶۲۔

۴۳ ۱۶ ماہ مہر کو جشن مہرگان شروع ہوتا تھا۔

۴۴ شاہ ولی اللہ، حجتہ اللہ البالغہ۔

۴۵ قدیم مشرق، ص ۱۲۷۔

۴۶ فلسفہ عجم میں علامہ اقبال مانی کو نیم ایرانی کہتے ہیں کیونکہ اس کا عیسائی باپ گو کہ ایرانی تھا لیکن ہمدان سے بابل کو ہجرت کر گیا تھا، وہیں مانی پیدا ہوا تھا۔ (فلسفہ ء عجم، ص ۳۳)

۴۷ قدیم مشرق، ص ۱۶۰۔

۴۸ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ لفظ ''صدیق'' کی آرامی شکل شائد (*Siddiqai*) صدیقے تھی یہی لفظ عربی زبان میں ''زندیق'' بن گیا جس کو مسلمانوں نے مانویوں کے لئے استعمال کیا ہے (بحوالہ قدیم مشرق، ص ۱۶۰)

۴۹ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۳۸۔ ۵۰ بدخشانی، تاریخ ایران، ص ۴۵۲۔

۵۱ امیر علی، ص ۳۶۔ ۵۲ امیر علی، ص ۳۶۔

چھٹا باب:

یونانی تہذیب

کرہ ارض کے شمال مغربی جانب، براعظم یورپ میں واقع یونان ایک جزیرہ نما ہے۔ جس کے تین اطراف بحیرہ روم اور ایک طرف خشکی ہے۔ عہد قدیم میں لفظ یونان محض موجودہ یونان کے لئے ہی نہیں بولا جاتا تھا بلکہ جزائر ایجین، ایشیائے کوچک، صقلیہ اور اطالیہ کی ساحلی نوآبادیاں بھی اپنے آپ کو ''ہیلاس'' (یونان) کہہ سکتی تھیں کیونکہ یہاں یونانی آباد تھے اور ان علاقوں میں انہی کی زبان و معاشرت جاری وساری تھی۔

ماقبل تاریخ کے عہد میں ہم یونانی تہذیب کی ابتداء سولہ سو سال قبل مسیح سے کر سکتے ہیں۔ یہ تہذیب چودہ سو سال قبل مسیح میں اپنے عروج پر پہنچی اور بارہ سو سال قبل مسیح میں ان پر اس وقت زوال آنا شروع ہوا جب یہاں آریاؤں[1] کا ورود ہوا۔ یونان میں آریاؤں سے قبل جو قوم آباد تھی اسے پیلاسجی (Pelasgi) کہتے ہیں۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ پیلاسجی آریائی تھے یا غیر آریائی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ نسلاً آریائی تھے جو چند صدی قبل اس خطے میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ پیلاسجیوں کی تہذیب وتمدن کے مطالعہ سے بھی یہی خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

پیلاسجی عہد (۱۶۰۰ ق م تا ۱۲۰۰ ق م) قدیم یونانیوں کی تہذیب کا ابتدائی دور ہے۔ اس عہد میں کچھ قبائلی دیہی زندگی گذارتے تھے اور زراعت کرتے تھے جب کہ کچھ قبائل بدویانہ زندگی گذارتے اور موسم و حالات کے اعتبار سے اپنی جائے رہائش بدلتے رہتے۔ ان

کی وجہ سے شہری زندگی متاثر ہوتی رہتی۔

ان کسانوں اور چرواہوں کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ کئی کئی خاندانوں پر مبنی معاشرے تھے جو سیاسی طور پر سب سے بڑے خاندان کے ماتحت ہوتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے سرداری راج تھا۔ دینی اعتبار سے وہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ تاہم معبدوں یا بتوں اور تشبیہوں کا تصور نہیں تھا۔ عبادت کے دوران خونی و غیر خونی قربانی دی جاتی تھی۔ یونانی پجاری اور کاہن پیش گوئیوں میں ماہر تھے، ایپرس (Epirus) میں ڈوڈونا (Dodona) کا دارالاستخارہ[2] اس وقت دنیا بھر میں مشہور تھا۔

اس کے بعد یہاں آریاؤں کا ورود ہوا۔ وہ قبائل کی شکل میں مختلف زمانوں میں آ کر یہاں مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ جغرافیائی طور پر یونان متعدد پہاڑیوں کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی وادیوں میں تقسیم ہے لہٰذا نو وارد آریاؤں نے مختلف وادیوں میں خودمختار طور پر رہنا شروع کر دیا۔ ان نو وارد قبائل میں سے ایک اہم قبیلہ "آئی اونین"[3] (Ionians) تھا۔ انہوں نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں پر اپنی آبادیاں قائم کیں اور دوسرے آریائی قبائل کے مقابلے میں تیزی سے تمدن کے مدارج طے کیے۔ کیونکہ یہاں وہ فنیقیوں (کنعانیوں) کے زیر اثر رہے۔ فنیقی قوم دو ہزار سال قبل مسیح ان علاقوں میں آباد تھی، جو اَب فلسطین اور لبنان کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ لوگ عصر قدیم کے نہایت بلند حوصلہ تاجر اور سب سے بڑے جہاز راں تھے اور ان کی نو آبادیاں ایک طرف ساحل افریقہ پر تیونس (قرطاجنہ) اور دوسری طرف جزائر یونان، قبرص اور غالباً خاص یونان کے مشرقی ساحلوں پر موجود تھیں۔ انہی سے آئی اونیوں نے تہذیب کی ابجد پڑھی۔ انہی سے فن تحریر سیکھا، اوزان و پیمائش کے طریقوں سے آگاہی حاصل کی اور انہی کے تعلق کی وجہ سے بعض قدیم صناعیاں اور ایشیائی دیوتاؤں کی پرستش یونان میں رائج ہوئی۔

بہر حال متعدد آریائی قبائل کی آمد اور مختلف وادیوں میں بسنے کے بعد شہری ریاستوں کا دور شروع ہوا اور ۸۰۰ ق م میں یہ شہری ریاستیں باقاعدہ مستحکم شکلیں اختیار کر گئیں جہاں جمہوری روح کارفرما تھی۔ ان ریاستوں میں قبائلی عصبیت بدرجہ اتم موجود تھی لہٰذا یہ آپس میں برسر پیکار رہتیں۔

اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام یونانیوں پر کبھی کوئی واحد قومی سلطنت قائم نہ ہو سکی جس کی وجہ ان کی باہمی عصبیت اور یونان کی جغرافیائی کیفیت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارسطو نے جب یونانیوں کی تاریخ مرتب کی (جواب ناپید ہے) تو اسے ڈیڑھ سو سے زائد خود مختار یونانی ریاستوں کے حالات جمع کرنے پڑے۔ جن میں ہمیشہ تغیر و انقلابات ہوتے رہتے تھے۔

۴۰۰ ق م میں یونانی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور ایتھنز تقریباً پورے یونان کا مرکز تھا۔ اس کے بعد متعدد وجوہات کی بناء پر اس طاقت میں ضعف پیدا ہونے لگا اور سکندر کی موت (۳۲۳ ق م) کے بعد یونانی طاقت مسلسل کمزور ہونے لگی اور ۱۴۶ ق م میں یونان بحیرہ روم کی ایک نئی طاقت یعنی رومی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

تہذیبی اعتبار سے یونانی تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم جا سکتا ہے۔

۱۔ افسانوی عہد (*Heroic Age*) یہ ان کا ابتدائی دور ہے جب وہ پہلے پہل سرزمین یونان میں وارد ہوئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ مقامی لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اپنی سرداریاں قائم کیں۔ یہ دور تقریباً دو سو سالوں (۱۰۰۰ ق م تا ۸۰۰ ق م) پر محیط ہے۔

۲۔ تاریخی عہد (*Historic Age*) یہ سیاسی ارتقاء کا دور ہے اس عہد میں مقامی سرداریوں نے صحیح معنوں میں شہری ریاستوں (*City States*) کی شکل اختیار کی جہاں مختلف طرز کی حکومتوں کے تجربے کیے گئے یہاں تک کہ انہوں نے جمہوری طرز کی حکومت بھی قائم کی اور جمہوریت کا ایک واضح تصور دنیا کو عطا کیا۔

یونان میں اس طرز کی سینکڑوں ریاستیں قائم تھیں تاہم ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں نے سیاسی استحکام کے اعتبار سے جلد ہی دوسری یونانی ریاستوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اسپارٹا اپنی عسکری صلاحیتوں اور ایتھنز اپنے علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان شہری ریاستوں کا رقبہ چند میل سے زیادہ نہیں ہوتا تھا مثلاً ایتھنز کی ریاست کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ساٹھ میل اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی چوبیس میل تھی۔[۳] لیکن یہ ریاستیں بالکل خود مختار ہوتی تھیں۔ ان میں شدید قبائلی عصبیت موجود تھی۔ قومی سطح پر سرداری ایک ایسا مسئلہ تھا جو ان

ریاستوں کو باہم نبرد آزما رکھتا تھا، یہ جنگیں سالوں چلتی رہتی تھیں۔ یونان کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب انہی ریاستوں کی باہمی جنگ و جدل بھی تھا۔ ان کی دو بڑی ریاستوں ایتھنز اور اسپارٹا کے مابین ۴۳۱ ق م تا ۴۰۴ ق م نہایت شدید جنگ لڑی گئی، جس میں سسلی سمیت جزائر اور تقریباً تمام یونانی ریاستوں نے حصہ لیا۔ قومی سربراہی کے لئے لڑی جانے والی یہ جنگ بالآخر بے نتیجہ رہی اور کسی میں بھی اتنا دم نہ رہا کہ قومی راہنمائی کا کام کر سکے۔[۵] فقط دو سال بعد پھر سے دونوں ریاستوں کے مابین جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ جنگیں بالآخر فیصلہ کن ثابت ہوئیں اور ایتھنز شکست کے بعد تباہ ہو گیا ایتھنز کی تباہی کے بعد اسپارٹا یونان کی سب سے بڑی طاقتور ریاست تسلیم کر لی گئی لیکن اسپارٹا کی طاقت بھی زیادہ عرصہ بحال نہ رہ سکی۔ مقدونیہ کی ریاست تیزی سے ابھری اور فلپ یا فیلقوس ثانی (جو کہ سکندر کا باپ تھا) کے زمانے میں تمام یونانی ریاستوں نے بالآخر مقدونیہ کی سیادت تسلیم کر لی۔

بہرحال ان باہم نبرد آزما یونانی قبائل کے پاس کم از کم دو بنیادیں ایسی تھیں جن کی بناء پر کچھ وقت کے لئے یہ قبائل ایک دوسرے کے قریب آ جاتے تھے۔ اس میں سے ایک موقع سورج دیوتا ''اپولو'' کی عبادت کا تھا اور دوسرا اولمپک تہوار کا۔ سورج دیوتا کی پرستش کے لئے ڈلفی کے مقام پر ایک مندر تعمیر ہوا تھا اور اس کے انتظام اور پوجا کی رسموں کی ادائیگی کے لئے ایک کونسل بنائی گئی تھی۔ اس کونسل میں تمام قبیلوں کے نمائندے شریک ہوتے تھے۔ ان کے باہمی ملاپ کا دوسرا موقع اولمپک تہوار مہیا کرتے تھے۔ یہ مقدس تہوار، شہر اولمپیا میں جہاں جیوپیٹر دیوتا کا ایک پرانا معبد تھا، ہر چوتھے سال منایا جاتا تھا اس موقع پر اولمپک کھیل منعقد ہوتے تھے۔ ان اولمپک کھیلوں میں تمام یونانی ریاستیں حصہ لیتی تھیں۔

یونانی وطنیت پر مستحکم ایمان رکھتے تھے۔ جہانیت اور آفاقیت جس کے متعلق کبھی سقراط اور انکساغورس[۶] نے اظہار خیال کیا تھا کوئی مقبول خیال نہیں تھا۔ ارسطو (۳۸۷ ق م تا ۳۲۲ ق م) کا سارا اخلاقی نظام یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے۔ ارسطو اس حد تک کہتا ہے کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ

کرتے ہیں۔ اس محدود طرز فکر اور تنگ نظری کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ جب ایک یونانی فلاسفر نے یہ کہا کہ میری ہمدردیوں کا حلقہ صرف میرے ذاتی وطن تک محدود نہیں بلکہ سارے یونان پر محیط ہے تو لوگ حیرت واستعجاب سے اس کی طرف تکنے لگے۔ ۷

مذہبی اعتبار سے اہل یونان کواکب پرست اور بت پرست تھے۔ ان کے دیوی دیوتاؤں کی فہرست ہندی اور ایرانی آریاؤں کی طرح طویل تھی۔ بتوں کو بڑے بڑے مندروں میں نصب کر کے ان کے آگے مراسم بندگی ادا کیے جاتے تھے۔ یہ دیوتا مونث بھی تھے اور مذکر بھی، ان میں زن وشوئی بھی تھی۔ ان معبودوں میں بشری کمزوریاں پائی جاتی تھیں۔ ہومر (جس کا تعلق افسانوی عہد سے ہے) کی نظموں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوتا انسانی معاملات میں حصہ لیتے تھے، ٹرائے کی جنگ میں بھی وہ شریک ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے بہادروں کی ہمت افزائی بھی کی تھی۔ ان میں عام انسانی کمزوریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی تھیں۔

یونانی ان معبودوں کو خالق کائنات یا مالک کل نہیں سمجھتے تھے۔ خدا کے متعلق ارسطو کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک مقناطیسی ۸ قوت ہے جو تمام اشیاء کو اپنی جانب کھینچتی ہے لیکن درحقیقت نہ وہ خالق ہے اور نہ خلق وخلقت سے اسے کوئی تعلق ہے۔ کشش کا باعث صرف یہ ہے کہ تمام اشیاء اس کی عاشق ہیں۔

یونانیوں میں دیوتاؤں کا تقدس محض اسی قدر تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے۔ اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا، اس کی عظمت وتمجید کے لئے کافی تھا پھر ان مراسم میں بھی کھیل تماشے، رقص وموسیقی اور شعر وشاعری کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اپولو ۹ دیوتا کے معبد کے اندر اس کی پوجا اور مقابلہ شعر وشاعری وموسیقی لازم وملزوم سمجھے جاتے تھے۔ ''درحقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن، کھیل اور تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی یونانیوں میں اور نہ کسی مذہب میں خوف ودہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے جتنا یونانیوں میں۔'' ۱۰

یونان میں کاہنوں کا ایک بااثر طبقہ بھی تھا جس کی پیش گوئی پر اہل یونان ایمان رکھتے تھے۔ ڈلفی (Delphi) کا مندر خاص طور پر اہل یونان کا ''دارالاستخارہ'' ۱۱ تھا، جہاں وہ غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لئے چلہ کش ہوا کرتے تھے۔ یونانی مندروں سے ملحق خانقاہیں بھی

تھیں جہاں پجاری اور داسیاں رہتی تھیں اور جو صدائے غیبی کے ذریعہ لوگوں کو ان کے معاملات سے متعلق مشورہ دیا کرتی تھیں۔

تہذیب کو جو قیمتی سرمایہ اہل یونان نے عطا کیا وہ علمی وفنی کارنامہ ہے۔ یونان نے تہذیب وتمدن کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب وادی دجلہ، فرات، وادی نیل، وادی سندھ اور دریائے زرد کی وادی تہذیب وتمدن کی بہت سی منازل طے کر چکی تھیں۔ مصر فن تعمیر و جہاری کو بلند مقام عطا کر چکا تھا۔ نینوا اور بابل علوم وفنون کے زبردست مراکز رہ چکے تھے۔ چین نے فلسفہ و اخلاق میں قابل ذکر اضافے کیے تھے۔ فنیقیوں نے جہاز رانی اور تجارت کو عروج تک پہنچا کر ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رسم الخط اور حروف کی برامد کے ذریعہ ان کے درمیان علمی ترقی کی بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ گویا مشرق، مغرب کا استاد تھا اور مغرب نے ہونہار شاگرد کی طرح اس میں اضافے کیے تھے۔ غرض یہ سارے تہذیبی مدارج، مختلف قومیں، یونانیوں سے پہلے طے کر چکی تھیں۔ یونان نے ان سے استفادہ کیا اور اپنی علمی ترقی کی بنیادیں ایشیا وافریقہ سے درآمد کیں۔[۱۲] سب سے پہلے انہوں نے فنیقیوں سے حروف تہجی سیکھے اور ''الف'' ان کے یہاں الفا (Alpha) اور ''ب'' بیٹا (Beta) ہوکر یورپ کے دوسرے ملکوں تک پہنچا چنانچہ انگریزی لفظ ''الفابٹ'' (Alphabet) اسی الفا، بیٹا کی ترکیب سے وجود میں آیا۔ فنیقیوں سے لکھنے کا فن سیکھنے کے بعد انہوں نے ان کے مشہور شہر بیلوس (Babylus) سے کاغذ درآمد کیا اور فن تحریر کو ترقی دی۔

غرض دوسو سال کے اندر انہوں نے علم وفن میں گراں قدر ترقی کی۔ شاعری، ادب، ڈرامہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ و سیاسیات میں ان کے اضافے تسلیم شدہ ہیں۔ یونانیوں نے سائنس کے بعض مضامین کو بھی ترقی دی اور ان سے متعلق اہم کتب تصنیف کیں لیکن یہ کارنامے انہوں نے زیادہ تر اس عہد میں انجام دیئے جب کہ سکندر کی موت کے بعد مصر میں بطلیموسی حکومت قائم ہوئی اور اسکندریہ علوم وفنون کا مرکز بنا۔[۱۳]

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یونانی محسوسات کے خوگر اور زبردست مادہ پرست تھے۔ ان

میں روحانیت کی بڑی کمی تھی للہذا اس تہذیب نے بڑے بڑے سائنس دان وفلاسفر تو پیدا کیے لیکن عابد وزاہد ایک بھی پیدا نہ کیا۔ علوم وفنون کی ترقیاں تمام تر مادی تھیں اور یونانیوں کی یہ ساری عملی کاوشیں ایک خاص حد سے کبھی آگے نہیں بڑھیں کہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

یونانیوں سے زیادہ غالبًا کوئی بھی قوم فطرت پرست نہیں تھی۔ فطرت پرستی دراصل مادہ پرستی ہی کی ایک شکل ہے۔ وہ زندگی سے کماحقہ حظ اٹھاتے تھے۔ ان کی معاشرتی زندگی میں جسمانی تربیت کھیل تماشوں، رقص وموسیقی اور پلاسٹک آرٹ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی، بلکہ ان کی زندگی ہی یہ تھی۔ ظاہری حسن اور تناسب واعتدال کے بارے میں جتنے حساس قدیم یونانی تھے غالبًا اور کوئی قوم نہیں تھی۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم تھا۔ خوبصورت چیزوں کی عبادت کرنے کی اس خصوصیت نے ان کی شاعری، موسیقی اور پلاسٹک آرٹ کے ساتھ ساتھ ان کے مذہب، قانون، فلسفہ اور سائنس پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

یونانیوں کی یہ حسن پرستی غیر انسانی، ظالمانہ اور غیر اخلاقی تھی کیونکہ لکرگس [۱۴] کے قانون کے مطابق ناجائز بچے اگر خوبصورت اور متناسب ہوں تو وہ بچے جائز اور قانونی سمجھے جائیں گے۔ لکرگس اسپارٹا کے سن رسیدہ مردوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اپنی جوان بیٹیوں کو خوبصورت اور ایماندار مردوں سے متعارف کرائیں اور ان سے بچے حاصل کریں تا کہ خوبصورت اور اعلیٰ نسل کے بچے دستیاب ہوسکیں۔ [۱۵] اسی طرح اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ خوبصورت عورت کے اچھے چال چلن اور خوبصورت بچے دیکھ کر عاشق ہو جائے تو اس کے لئے بھی جائز تھا کہ بے تکلف زن مذکور کو اس کے شوہر سے مانگ لے تا کہ اپنے لئے خوبصورت اور لائق بچے حاصل کر سکے۔ [۱۶]

لکرگس بچوں کو والدین کی نہیں بلکہ ریاست کی امانت سمجھتا تھا۔ بچوں کے سلسلہ میں بھی اسپارٹا کا رویہ انتہائی غیر انسانی تھا۔ ان کے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو سب سے پہلے اسے قبیلہ کے بزرگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اگر بچہ صحت مند وتوانا ہوتا تو یہ بزرگ اس کی پرورش اور تعلیمات کے سلسلہ میں ہدایات جاری کرتے اور اگر بچہ کمزور یا معذور ہوتا تو وہ اسے کوہ ٹیگٹس (*Taygetus*) کے نزدیک گہرے غار میں پھنکوا دیتے کیونکہ اس کی زندگی سے

ریاست اور عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ۱۷ اسی طرح اسپارٹا کی عورتیں نومولود بچوں کو پانی کی جگہ شراب سے نہلاتیں تا کہ اگر بچہ کمزور ہے تو اسی تجربہ کے دوران جاں بحق ہو جائے اور اگر توانا و صحت مند ہے تو بچ جائے۔ ۱۸

مخصوص حالات کی بناء پر حیاء، عفت اور عصمت کا کوئی تصور اسپارٹا کی عورتوں میں نہیں تھا۔ لکرگس ۱۹ کا حکم تھا کہ جوان عورتیں اور جوان مرد برہنہ ہو کر جلوسوں میں نکلا کریں اور اسی عالم برہنگی میں مذہبی تقریبات کے موقعوں پر رقص بھی کیا کریں اور ان مردوں کی شجاعت کے گیت گایا کریں جو جنگوں میں کارنامے انجام دیتے تھے۔ اسی طرح ان مردوں پر طنزیہ گیت گایا کریں جو جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام نہ دے سکے ہوں۔

اسپارٹا کی نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکلا کرتے تھے جس میں وہ ناچتی اور ورزش کرتی تھیں اور مردوں کو تاکید تھی کہ وہ ان برہنہ جلوسوں کا نظارہ کریں تا کہ ان میں شادی کا شوق پیدا ہو۔ جو مرد زیادہ عرصہ شادی نہ کرتا اس کے حقوق شہریت ساقط ہو جاتے تھے۔ ۲۰

اسپارٹا کی عورتوں کو اپنے گھروں پر بہت حد تک مالکانہ حقوق و اختیارات حاصل تھے اس کے برخلاف اہل ایتھنز کے یہاں جو ازمنہ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھے جاتے تھے، بیوی محض ایک اثاثہ تھی جس کی خرید و فروخت کی جا سکتی تھی بلکہ وصیت کے ذریعے منتقل بھی کیا جا سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک بری چیز سمجھی جاتی تھی جو محض گھر بار چلانے اور بچے پیدا کرنے کے لئے ضروری تھی۔ ایتھنز کے شہریوں کو بے حد و حساب بیویوں کی اجازت تھی چنانچہ ڈیموستھنز (Demosthenes) فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس قوم میں عورتوں کے تین طبقے تھے جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے۔ ۲۱

یہ اس یونانی تہذیب کا ایک اجمالی خاکہ تھا جس کے کھنڈرات پر رومۃ الکبریٰ کی عمارت کھڑی ہوئی۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۳، ص ۱۳۔

۲۔ ایضاً، جلد ۳، ص ۷-۳۶۔

۳۔ ''آئی اونی'' کو اہل مشرق نے بگاڑ کر ''یونانی'' کرلیا۔ جبکہ یہ یونانیوں کا محض ایک اہم قبیلہ تھا۔ قبائلی تقسیم سے قطع نظر سارے یونانی ہیلنس (Hellences) کہلاتے ہیں۔

۴۔ ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۳، ص ۱۵۴۔

۵۔ ہارمسورتھ، ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۷، ص ۲۳۸۰۔

۶۔ انکساغورس، ارسطو کا تقریباً ہم عصر اور یونان کے مشہور فلسفیوں میں سے تھا۔

۷۔ ندوی، ص ۲۴۳۔

۸۔ دین محمد شفیقی عہدی پوری، فلسفہ ھند و یونان، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۴۔

۹۔ ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۳، ص ۱۷۱۔

۱۰۔ لیکی، تاریخ اخلاق یورپ، مترجم عبدالماجد دریا آبادی، ص ۲۷۹۔

۱۱۔ ہسٹورین ہسٹری، جلد ۳، ص ۱۷۰۔

۱۲۔ عین الحق، تہذیبیں، طبع اول، کراچی، ۱۹۶۶ء، جلد و، ص ۴۵۴۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ لکرگس، اسپارٹا کا مشہور قانون دان تھا۔ تاہم اس کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ پلوٹارک نے اس کے قوانین وخیالات پرمبنی پورا باب ''مشاہیر یونان وروما'' میں لکھا ہے۔

۱۵۔ پلوٹارک، ''مشاھیر یونان و روما''، مترجم سیّد ہاشمی، ص ۱۱۳۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ پلوٹارک، ص ۱۱۳۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ امیر علی، ص ۲۲۳۔

سا تواں باب:

رومی تہذیب

یونانیوں کے بعد یورپ کی دوسری اہم تہذیب، رومی تہذیب تھی جو اٹلی کے مشہور شہر 'روم' کی طرف منسوب ہے۔ اٹلی اسی جزیرہ نما میں واقع ہے جس میں یونان واقع ہے۔ اس کے قدیم ترین آباد کار لاطینی (*Latin*)، سبائن (*Sabines*)، انبری (*Unbarians*) اور لگوری (*Ligurians*) تھے جو اس جزیرہ نما کے شمالی علاقوں (یعنی اٹلی اور گرد و نواح) میں آباد تھے۔ ۸۰۰ ق م میں یہاں اترسکن (*Etruscans*) قبائل کا ورود ہوا جن کی وجہ سے ان علاقوں میں شہریت متعارف ہوئی، انہوں نے جلد ہی یہاں کے قدیم آباد کاروں پر غلبہ حاصل کرلیا۔ دوسری طرف یونانیوں اور فنیقیوں کا پھیلاؤ بھی مسلسل جاری تھا۔ ۷۰۰ ق م تک سسلی اور اس جزیرہ نما کے جنوبی علاقے ان لوگوں کے قبضے میں آچکے تھے۔

روم جو کہ لاطینیوں کا وطن تھا اترسکن قبائل اور یونانیوں کی آبادی کے درمیان واقع تھا۔ یہ شہر رومیولس (*Romulus*) نے ۷۵۳ ق م میں آباد کیا تھا۔ پہلے یہاں شہنشاہیت قائم رہی پھر محدود نوعیت کی جمہوریت کا تجربہ کیا گیا۔ دس سال کی جدو جہد کے بعد ۳۹۶ ق م میں رومیوں نے اترسکن شہنشاہیت کو اپنے میں ضم کرلیا۔ تاہم ابھی وہ تہذیب کے کسی اہم مقام پر پہنچے نہیں تھے کہ ایک وحشی قبیلے گال (*Gaul*) نے روم پر حملہ کر کے ۳۹۰ ق م میں اسے بہت حد تک تباہ کر دیا۔ اس تباہی کے بعد رومی جلد ہی سنبھلے اور از سر نو اپنی تعمیر و تنظیم کا کام شروع کیا۔

پہلے انہوں نے گردونواح کے جنگجو اور شمال کے گال قبیلے پر اپنی برتری قائم کی، پھر وسطی اور شمالی اطالیہ کو ایک مرکز کے تابع کیا، یوں ۲۷۰ ق م تک اٹلی کا بہت بڑا علاقہ رومیوں کی طاقت کے تحت متحد ہو چکا تھا۔ اس کے بعد رومیوں نے جنوب کی طرف توجہ دی یہاں یونانی نو آبادیاں قائم تھیں اور یونان اس وقت عرصہ زوال میں تھا۔

رومیوں نے اس جزیرہ نما کے یونانی مقبوضات پر قبضہ کیا تو ان کا براہ راست تصادم فنیقیوں سے ہوا جن کا دار الحکومت شمالی افریقہ کا سب سے مشہور اور بارونق شہر قرطاجنہ (Carthage) تھا۔ رومیوں اور فنیقیوں کے مابین جنگوں کا جو شدید اور طویل سلسلہ شروع ہوا وہ پیونک [1] جنگوں کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے اور یہ سلسلہ قرطاجنہ کی مکمل تباہی پر ختم ہوا۔ رومیوں نے اس خوبصورت تہذیبی مرکز پر قبضے کے بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سترہ دنوں تک یہ شہر جلتا رہا اور یوں فنیقیوں کا یہ مایہ ناز شہر جو اس وقت تہذیب و تمدن کا زبردست مرکز تھا وحشی رومیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔

تیسری پیونک جنگ کے نتیجے میں بحیرہ روم، رومیوں کے حلقۂ اثر میں آچکا تھا لہٰذا ان کے لئے یونان فتح کرنا چنداں دشوار نہیں تھا۔ ۱۹۷ ق م میں رومی افواج نے مقدونیہ پر چڑھائی کی اور ایک حد تک یونان پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد رومیوں کی استعماریت مسلسل بڑھتی رہی۔ ۶۴ ق م میں شام اور ایشیائے کوچک رومی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ ۳۱ - ۳۰ ق م میں جبکہ روم میں باقاعدہ شہنشاہیت قائم ہو چکی تھی انہوں نے مصر پر بھی قبضہ کر لیا اور رومی مملکت کے حدود اسپین و فرانس سے لے کر دریائے فرات تک پھیل گئے۔

باقاعدہ رومی سلطنت یا شہنشاہیت ۳۰ ق م میں قائم ہوئی۔ ان کا پہلا بادشاہ آگسٹس تھا (۳۰ ق م تا ۱۴ء) یہ رومی سلطنت کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قائم رہی۔ دوسری صدی عیسوی تک آتے آتے رومی سلطنت زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھی اور تین بر اعظموں یعنی ایشیا، یورپ اور افریقہ پر اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ چکی تھی۔ اس وقت وہ دنیا کا سب سے متمدن حصہ سمجھی جاتی تھی۔[2]

قسطنطین اعظم (۳۲۳ء تا ۳۳۷ء) نے نئے شہر قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی بنیاد رکھی اور سلطنت کا دارالحکومت روم سے قسطنطنیہ منتقل کیا۔ اس کے ساتھ ہی روم کی اہمیت ختم ہونے لگی اور تہذیب وتمدن کا سرمایہ قسطنطنیہ منتقل ہوگیا۔ قسطنطین کی موت کے بعد یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک مشرقی رومی سلطنت (Eastern Roman Empire) جسے بازنطینی سلطنت بھی کہتے ہیں، اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا اور دوسری مغربی رومی سلطنت (Western Roman Empire) جس کا دارالحکومت روم تھا۔ روم متعدد وحشی قبائل کے ہاتھوں ۴۷۶ء میں مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور مغربی رومی سلطنت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی رومی سلطنت جسٹینین (Justanian)[۳] کی بادشاہیت میں زندگی وخوشحالی کی نئی سانسیں لے رہی تھی۔ یہ بازنطینی سلطنت اس کے بعد بھی کم وبیش ایک ہزار سال قائم رہی۔ مسلمانوں سے رومیوں کا تصادم حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوا۔ عربوں اور رومیوں کے مابین صدیوں معرکہ آرائی رہی بالآخر عثمانی خلیفہ محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کرکے اس سلطنت کو ختم کردیا۔[۴]

یونانی تہذیب سے متعارف ہونے کے بعد رومی تہذیب کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے۔ یہ قوت، مملکت کی تنظیم، سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں یونانیوں سے بازی لے گئے لیکن علم وفلسفہ، ادب وشاعری اور دیگر تمدنی معاملات میں وہ یونانیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکے۔ ان چیزوں میں یونانیوں کا سکہ تمام دنیا پر اور فاتح رومیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ یونانی صدیوں کا علمی وفنی پس منظر رکھتے تھے جبکہ اہل روم اپنے دور عسکریت میں تھے۔ ان کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ علوم وفنون کے شعبہ میں یونانیوں سے مرعوب رہیں چنانچہ قدیم ترین رومی مورخین ادائے مطلب کے لئے ایک طویل مدت تک یونانی زبان ہی استعمال کرتے رہے۔ یونانیوں کی اس بے محابا تقلید کا رومی نہ صرف اعتراف کرتے تھے بلکہ اس تقلید پر انہیں فخر بھی تھا۔[۵] یونانی علوم کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ ونفسیات اور ان کی عادات وخصائل بھی رومیوں کی طرف منتقل ہوگئے۔ اسی بناء پر رومیوں کو بجا طور سے یونانیوں کا جانشین کہا جاتا ہے یوں بھی رومی اپنی مغربی فطرت ومزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں

یونانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔

جہاں تک رومیوں کے سیاسی نظام کا تعلق ہے وہاں شہنشاہیت تھی۔ جس معاشرہ کا مزاج شاہانہ ہوتا ہے اس کی چند خصوصیات ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ رعایا بادشاہ کی شخصیت میں غلو کرنے لگتی ہے اور اس کو اوتار سمجھ لیتی ہے۔ چنانچہ رومیوں کا بھی عام عقیدہ یہ تھا کہ قیصر صفات الوہیت کا مالک ہے۔ شہنشاہیت کی دوسری بڑی خصوصیت مادہ پرستی ہوتی ہے۔ بے جا تکلفات و تعیّشات اور شاہانہ زندگی کے تمام تر لوازمات نے رومی معاشرے کو بھی بہت پیچیدہ بنا دیا تھا۔

رومی معاشرہ واضح طور پر تین طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ پہلا طبقہ امراء، دوسرا طبقہ عوام کا اور تیسرا طبقہ زرعی مزدوروں اور غلاموں کا تھا۔ ''رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلامی چلی آ رہی تھی، غلام خواہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، خالی خولی مال و اسباب سمجھے جاتے تھے۔ ان کے آقاؤں کو ان کی موت و زندگی کا اختیار تھا۔ بہر حال اس تدریجی اصلاح کی بدولت جس نے بارہ تختیوں (*The Twelve Tables*) کے فرسودہ قوانین کو ہیڈرین (*Hadrian*) کے جامع ضابطہ قوانین میں تبدیل کیا، غلاموں کی حالت قدرے بہتر ہوگئی، لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود رومی شہنشاہوں کی انسان نوازی یا دانشمندی نے پرانے قوانین میں کیں، غلاموں کا وجود جسمانی کلیتہً مالک کی مرضی کے تحت ہوتا تھا۔ سلطنت کے ہر ذی اقتدار شخص کے یہاں ہزاروں غلام تھے۔ جنہیں ذرا ذرا سے قصور پر اذیت پہنچائی جاتی تھی اور کوڑے لگائے جاتے تھے۔''[۶]

صرف یہی نہیں کہ رومی معاشرے میں غلام سیاسی، معاشی اور عام شہری حقوق سے بھی ہمیشہ محروم رہا بلکہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ بعض اوقات محض تفریح طبع کے لئے امراء انہیں آپس میں لڑوا کے مروا ڈالتے تھے۔ یہ کھیل اس طرح کھیلا جاتا تھا کہ آقاؤں کی ضیافت طبع کے لئے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دے کر ایک اکھاڑے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ اکھاڑے کے چاروں طرف تماش بینوں کے لئے نشستیں بنی ہوتی تھیں جن پر غلاموں کے آقا اور بسا اوقات خود شہنشاہ روم رونق افروز ہوتا تھا۔ کھیل شروع ہوتا تو غلام تلواروں اور نیزوں

سے ایک دوسرے پر پل پڑتے یہاں تک کہ بالآخر ان کا قیمہ بن جاتا۔ جو خوش قسمت موت کے اس کھیل سے زندہ بچ جاتے وہ فاتح سمجھے جاتے اور انہیں دل کھول کر داد کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ غلاموں کو رومی معاشرے کے کسی بھی طبقے کی اخلاقی حمایت حاصل نہیں تھی۔ رومی استعمار کی حرص و ہوس کے لئے، سامان عیش و عشرت فراہم کرنے کی خاطر، غلاموں کے ریوڑ دن بھر کھیتوں میں جتے رہتے تھے۔ کام کے اوقات میں انہیں بیڑیاں پہنا دی جاتی تھیں تا کہ وہ اپنے نگرانوں کی آنکھ بچا کر نکل نہ بھاگیں۔ ان پر بے تحاشہ کوڑے برسائے جاتے تھے کیونکہ ان کا آقا یا مقامی کارکن انہیں ستانے اور اذیت دینے میں لذت محسوس کرتا تھا۔ شام کو جب کام ختم ہو جاتا تو دس دس، پچاس پچاس مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر مویشیوں کی طرح انہیں غلیظ، بدبودار اور چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں سے پٹے ہوئے باڑوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس حالت میں بھی ان کے ہاتھ پاؤں بیڑیوں سے آزاد نہیں ہوتے تھے۔ مویشیوں کو تو کھلے اور وسیع باڑوں میں رکھا جاتا مگر یہ بدنصیب لوگ زندگی کی اس سہولت سے بھی محروم تھے، کھانے کے لئے انہیں صرف اتنا دیا جاتا تھا کہ ان کا رشتہ جسم و جاں برقرار رہے اور وہ اپنے آقاؤں کے لئے کام کرتے رہیں۔ [8]

ان حالات میں عیسائیت جب روم میں آئی تو غلامی کے ادارہ میں ایک معمولی سی تبدیلی یہ آئی کہ اس غلام کو آزادی عطا کی گئی جو رہبانیت اختیار کر لے بشرطیکہ تین سال تک اس کی ملکیت کا کوئی دعویٰ نہ کرے۔ اس ایک بات کے علاوہ غلامی کا دور دورہ اسی طرح رہا جیسا کہ عہد مشرکیت میں تھا۔ رومی معاشرہ میں غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانوناً تسلیم نہیں کی جاتی تھی جب کہ غلام مرد کی شادی آزاد عورت سے اور آزاد مرد کی شادی غلام عورت سے قطعاً ممنوع تھی۔ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کر لیتی تو اس کے لئے سزاؤں میں سے ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کر دی جائے اور غلام کو زندہ جلا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غیر محدود جاریہ بازی جس پر کلیسائی منصب دار بھی کاربند تھے۔ [9]

رومی معاشرے میں پیشوں کی تقسیم ذات بندی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہر پیشہ موروثی

بن گیا تھا اور قانونی طور پر یہ بات طے کردی گئی تھی کہ کوئی شخص اپنا موروثی پیشہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا معاشرہ غیر متحرک ہوگیا۔ باپ دادا کا پیشہ اختیار کرنے کی مجبوری نے لوگوں کو لکیر کا فقیر بنا کر ان کی ذہنی اپج اور کسب کی صلاحیت کو مضمحل کر دیا۔[۱۰]

حضرت عیسیٰ:

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تیسری صدی عیسوی تک رومیوں کا غالب مذہب شرک و بت پرستی ہی تھا ہر چند کہ سلطنت روما کے قیام کے ابتدائی سالوں میں ہی حضرت عیسیٰ کا ظہور ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت قرآن مجید کے مطابق حضرت آدمؑ کی طرح مروجہ طریقے سے ہٹ کر ہوئی۔ یہ بغیر واسطہ پدری کے عالم وجود میں آئے۔[۱۱] ان کی والدہ مریم بنت عمران نہایت عابدہ، زاہدہ اور صالح خاتون تھیں چنانچہ اسی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کی عورتوں میں سے بطور خاص منتخب فرمایا[۱۲] اور انہیں بغیر کسی ظاہری واسطے کے محض اپنے فضل و کرم سے اپنی ایک نبی کی ماں بننے کی سعادت بخشی۔[۱۳]

حضرت عیسیٰ کی ولادت بیت المقدس سے چند میل کے فاصلے پر کوہ ساعیر کے دامن میں ہوئی۔ یہ جگہ بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد حضرت مریم بادشاہ وقت ہیرودویس (Herediag) کے خوف سے زیادہ وقت فلسطین میں نہیں رہیں اور مصر کے کسی مقام پر چلی گئیں۔ حضرت عیسیٰ نے ابتدائی ۱۲ سال یہیں گزارے پھر واپس بیت المقدس آگئے۔[۱۴] ۳۰ سال کی عمر میں ان پر وحی کا نزول ہوا جس کے بعد حضرت عیسیٰ نے دعوت و تبلیغ کا آغاز کردیا۔ انہوں نے لوگوں کو شرک و بدعات سے روکا اور توحید کی دعوت دی۔[۱۵] توحید کے علاوہ ان کی تعلیمات کا اہم حصہ رسالت اور معاد سے متعلق تھا گو کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے انجیل عطا فرمائی تھی مگر احکام دین کے اعتبار سے وہ موسوی شریعت یعنی احکام توراۃ کے پابند تھے۔[۱۶]

حضرت عیسیٰ کی نبوت کا زمانہ مختصر تھا یعنی تقریباً ڈھائی یا تین سال۔ اس وقت دنیا میں ہر طرف ظلم و جہالت کا دور دورہ تھا۔ خود اہل کتاب یعنی یہودی بہت سی خرابیوں میں مبتلا

تھے، صدیوں کے ذہنی و علمی جمود نے ان کو علمی اعتبار سے مکمل طور پر فقیر بنا دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی بعثت کے وقت یہودیوں کے مندرجہ ذیل گروہ تھے۔ [۱۷]

۱۔ صدوقی: ان کا کہنا تھا کہ انسان کے نیک اور برے اعمال کا ثمرہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے نہ کہ آخرت میں۔

۲۔ فریسی (**Pharisees**): یہ لوگ رہبانیت کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے مگر پھر ترک دنیا میں بھی بدعملی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔

۳۔ کاہن: ان لوگوں نے مذہبی عبادات کی ادائیگی میں خلوص وللّٰہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ دنیاداری کو رواج دے رکھا تھا۔

۴۔ احبار: یا فقیہ، یہ مذہب کے اجارہ دار بن گئے تھے۔ جس چیز کو چاہتے حرام اور جس کو چاہتے حلال قرار دیتے، اس وقت دینی و علمی پستی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ہیکل سلیمانی کو تجارتی منڈی بنایا ہوا تھا اور خود مذہب بھی ایک تجارت بن گیا تھا۔

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے یہودی علماء کو اپنی مذہبی سیادت خطرے میں نظر آنے لگی جس کی وجہ سے وہ حضرت عیسیٰ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف مخالفت کا طوفان شدت اختیار کر گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ جس قصبے یا شہر کا رخ کرتے انہیں وہاں سے نکال دیا جاتا تھا۔ انہی دنوں میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے ان کے حواریوں کا ایک گروہ وجود میں آ چکا تھا۔ ان کے یہ ابتدائی شاگرد نہایت مخلص اور پاکباز تھے۔ ان میں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ تھے مگر دینی ثقاہت و وجاہت کے اعتبار سے ان کا درجہ بڑا تھا۔

بہرحال حضرت عیسیٰ کے خلاف دشمنوں نے رومی گورنر پیلاطس (*Pontsm Pilate*) کو اس قدر ابھارا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو پھانسی دینے پر آمادہ ہو گیا۔ رومیوں کی اس وقت کی اخلاقی کج روی اور پستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قومی تہوار کے موقع پر جب حکومت کی طرف سے رومیوں سے استفسار کیا گیا کہ آج کے دن براباڈا کو یا مسیح میں سے کس کو پھانسی دی جائے تو انہوں نے یک زبان ہو کر اس وقت کے صالح ترین شخص عیسیٰ کا نام تجویز کیا،

لیکن قرآنی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اس موقع پر دشمنوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچالیا اور ان کی جگہ کسی اور شخص کو مسیح سمجھ کر پھانسی دے دی گئی۔ ۱۸

ارتفاعِ عیسیٰ کے بعد یہ مذہب چند حواریوں کی کوششوں سے قائم تو رہا لیکن تیسری صدی عیسوی تک رومیوں کا غالب مذہب شرک و بت پرستی ہی تھا۔ یونانیوں کی طرح ان کے بھی متعدد معبود تھے جن کی پرستش کے لئے بڑے بڑے مندر تھے۔ تاہم رومیوں نے ان دیوی دیوتاؤں کو سیاست اور امور دنیا سے الگ تھلگ رکھا تھا۔ رومی مندروں میں تو ان کی پوجا کرتے تھے اور تھیٹروں میں ان کا تمسخر اڑاتے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا مذہبی جذبہ اس قدر سرد پڑ چکا تھا کہ وہ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ چنانچہ جب اغسطس (Augustus) کا بیڑا غرق ہوگیا تو اس نے غصے میں آکر نیپچون (Neptune)، جو کہ سمندروں کا دیوتا تھا، کے بت کو مسمار کردیا اور جب جرمینکس (Jermanicus) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیوتاؤں کی قربان گاہ پر خوب پتھراؤ کیا۔ ۱۹

یہ شرک و بت پرستی رومیوں کی اصلاح نفس میں بری طرح ناکام رہی۔ جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما انتہائی ترقی پر فائز ہوجانے کے باوجود مذہبی اور عمرانی اعتبار سے فساد کے درجہ اخیر تک پہنچ چکی تھی۔ اخلاقی انحطاط کی ایک خطرناک علامت یہ تھی کہ ان کے درمیان شادی ایک بے معنی رسم بن گئی تھی جبکہ قوانین مملکت کی تائید حاصل کرکے داشتہ بازی ایک ایسا ادارہ بن گئی تھی جو مراعات خاص کا مستحق تھا۔ ۲۰ اکثر لوگ شادی کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور جو کر لیتے تھے وہ صاحب اولاد ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اسقاط حمل، ضبط تولید اور نوزائیدہ بچوں کو ہلاک کردینا ان کے معاشرہ میں عام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آبادی کم ہونے لگی تو حکومت نے قانون کے ذریعہ نسل کشی کو روکنے کی کوششیں شروع کیں اور صاحب اولاد لوگوں کو محصولات کی معافی اور ملازمتوں میں ترقی کی سہولتیں دیں مگر یہ کوششیں بھی بہرحال ناکام رہیں اور رومی نسل، روم سے گویا ناپید ہوگئی۔ ۲۱

رومی معاشرے میں بیویوں کی حالت بھی زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ پہلی بیوی کے سوا

کسی کو قانونی حقوق حاصل نہیں تھے۔ ان حقوق سے محروم بیویوں کے بچے بھی جائز نہیں سمجھے جاتے تھے اور وہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے ایک حصہ کے بھی حق دار نہیں ہوتے تھے اور سماج میں ذات پات سے خارج شمار کیے جاتے تھے۔[۲۲] اونچے طبقے کے مرد اگر نچلے طبقے کی عورت سے شادی کرتے تو شرائط نکاح میں سے ایک شرط یہ ہوتی کہ اولاد کو کوئی حق وراثت نہیں پہنچے گا۔ ایسی شادیوں کی علامت یہ ہوتی تھی کہ دولہا اپنا بایاں ہاتھ دلہن کو تھما دیتا تھا گویا ہونے والی اولاد کو وراثت کا حق نہیں ہوگا۔[۲۳]

اہل روما کی عیش پرستی اور عشرت پسندی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ظالمانہ اور انسانیت سوز تفریحات کے بھی عادی ہو گئے تھے۔ انسانوں کو جانوروں سے لڑوانا، زیردستوں کو شمشیر زنی کا تختہ مشق بنانا اور بھوکے شیروں کے آگے غلاموں کو ڈال کر حیات و موت کی کشمکش کا منظر دیکھنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس طرح کے وحشیانہ تماشوں کے لئے سالانہ تعطیلیں ہوا کرتی تھیں اور میلے لگا کرتے تھے جن میں لوگوں کا اژدھام ہوتا تھا۔

تاریخی روایت ہے کہ (پہلی صدی عیسوی میں) جب پومپی آئی کا کوہ آتش فشاں پھٹا ہے تو دن کا وقت تھا اور لوگ ایمفی تھیٹر میں (جہاں بیس ہزار انسانوں کی گنجائش تھی) بیٹھے ہوئے درندوں کو زندہ انسانی جسموں کو اپنے پنجوں اور دانتوں سے نوچتے اور چیرتے پھاڑتے دیکھ رہے تھے۔ اس ظالمانہ لہو ولعب کی عین مشغولیت میں زلزلہ آیا اور آگ آسمان سے برسنا شروع ہوئی۔ کچھ لوگ جہاں بیٹھے تھے اور لیٹے تھے وہیں جل کر بھسم ہو گئے۔ کچھ باہر نکلے تو زبردست ہجوم اور گھپ اندھیرے میں کچل کر مر گئے، کچھ خوش نصیب تھے جنہوں نے کشتیوں اور جہازوں میں بھاگ کر جان بچائی۔ یہ شہر اٹھارہ سو سال تک دنیا کے نقشہ سے غائب ہو گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں اس کی کھدائی ہوئی تو شہر مٹی کی تہوں کے نیچے سے نشان عبرت بنا نکلا۔[۲۴]

عیسائیت کی اشاعت وترویج:

رومیوں کی تاریخ میں ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ عیسائیت کا سلطنت روما میں

سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کرنا ہے۔ قسطنطین جو کہ ایک نئے دارالحکومت ایک نئی حکمت عملی اور ایک نئے مذہب کے ساتھ حکمران ہوا [۲۵] (۳۲۳ء تا ۳۳۷ء) اور چونکہ اسے تخت و تاج عیسائیوں کی سرفروشی، فدا کاری اور زبردست قربانیوں کی وجہ سے ملا تھا لہٰذا اس نے عیسائیوں کو اس کا پورا صلہ دیا اور مسیحیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن درحقیقت یہ واقعہ مذہب عیسوی کے لئے بڑا ہی نامبارک ثابت ہوا کیونکہ دنیا دار لوگ دنیا کے کمانے کی خاطر مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی بن گئے۔

قسطنطین خود بھی اخلاقی طور پر مضبوط کردار کا آدمی نہیں تھا لہٰذا اس نے بھی اس منافقانہ طرز عمل کے سد باب کے لئے کچھ نہیں کیا۔ خود اس نے اپنی زندگی کے آخری سال میں کہیں جا کر ان مذہبی مراسم کی پابندی شروع کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔ [۲۶] قسطنطین کو اپنا ذاتی فائدہ بھی اسی میں نظر آیا کہ جہاں تک ہو سکے بت پرستوں اور عیسائیوں میں یگانگت اور ارتباط پیدا کیا جائے اور تو اور راسخ العقیدہ عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا۔ اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اس برائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ قدیم معبودوں کی جگہ مریم و مسیح کے بت پوجے جانے لگے۔ قدیم زمانے کے تعویذ، گنڈے، عملیات، فال گیری و غیب گوئی، جن بھوت بھگانے کے عمل سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیئے۔ اسی طرح چونکہ عوام اس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندہ اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے اس لئے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا۔

بت پرستی اور مسیحیت کا جو معجون مرکب تیار ہوا اس میں سے مسیحی روح اور حسن نکل چکا تھا اور اس لائق نہ تھا کہ رومیوں کی برسر انحطاط سیرت و اخلاق کو سنبھال سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عیسائیت نے رہبانیت [۲۷] کی بدعت نکالی جس نے رومی تہذیب و تمدن کو ابتری کے دہانے تک پہنچا دیا۔

حضرت عیسیٰ کے بعد دو سو سال تک رہبانیت کا پتہ نہیں چلتا اس کے بعد یہ رفتہ رفتہ

قانونی شکل اختیار کر گئی۔

آغازِ رہبانیت کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس مشرک معاشرہ میں شہوانیت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا توڑ کرنے کے لئے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی یہ دوسری شکل اختیار کی۔

رہبانیت کے فروغ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لئے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی۔ شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لئے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رجحانات کی بناء پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی، مسیحی علماء نے اس کا فلسفہ اور اس کے طریق کار بدھ بھکشوؤں، ہندو جوگیوں، قدیم مصری فقراء، ایرانی مانویوں اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیں۔ اور اسی کو روحانی ترقی کا ذریعہ قرار دیا۔

عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر ۲۶ (جو اس وقت رومی سلطنت کا صوبہ تھا) سے ہوا اور اس کا بانی سینٹ اینتھنی (St. Anthony) تھا (۲۵۰ء تا ۳۵۰ء) جسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے فیوم کے علاقہ پسپیہ کے مقام پر (جواب دیر المیمون کے نام سے معروف ہے) پہلی خانقاہ تعمیر کی۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اس کی تحریروں اور ہدایت سے ماخوذ ہیں۔ اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لئے خانقاہیں قائم ہو گئیں، جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ مصر کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ چرچ نے رہبانیت کو باقاعدہ طور پر قبول کر لیا۔ اس رہبانیت میں سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو شدید اذیت پہنچائی جاتی۔ اس سلسلہ میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسکندریہ کا سینٹ مکاریوس ہر وقت اپنے جسم پر ۸۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ چھ مہینے تک وہ ایک دلدل میں

سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یوسیبوس نے اس سے بڑھ کر ریاضت کی، وہ ایک سو پچاس پونڈ کا بوجھ اٹھائے پھرتا اور تین سال تک ایک خشک کنویں میں پڑا رہا۔ ۲۹؎

سینٹ سابیوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینہ بھر پانی میں بھیگ کر بدبودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بیساریون چالیس دن تک خاردار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور چالیس سال تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخومیوس نے پندرہ سال اور ایک روایت کے مطابق پچاس سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیئے۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پوری مدت میں وہ نہ کبھی بیٹھا، نہ لیٹا، آرام کے لئے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا اور اس کی غذا وہ تبرک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لئے لایا جاتا تھا۔ ۳۰؎

سینٹ سیمیون اسٹائلاٹ (۳۹۰ء تا ۴۴۹ء) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شامل ہوتا ہے۔ ہر ایسٹر سے پہلے پورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنویں میں جا رہتا تھا آخر کار اس نے شمالی شام (شام اس وقت سلطنت روم کا صوبہ تھا) کے قلعہ سیمان کے قریب ساٹھ فیٹ بلند ایک ستون بنوایا۔ جس کا بالائی حصہ صرف تین فیٹ کے گھیر کا تھا اور اوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اس ستون پر اس نے پورے تیس سال گزار دیئے۔ دھوپ، بارش، سردی، گرمی سب اس پر سے گزرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی ستون سے نہیں اترتا تھا۔ اس کے مرید سیڑھی لگا کر اسے کھانا پہنچاتے تھے اور اس کی گندگی صاف کرتے۔ پھر اس نے ایک رسی سے اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا یہاں تک کہ رسی اس کے گوشت میں پیوست ہو گئی۔ گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں سے گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر پھوڑوں میں ہی رکھ لیتا اور کہتا کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے۔ مسیحی عوام دور دور سے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔ ۳۱؎

انتہا درجہ کی جسم کشی کے ساتھ ساتھ رہبانیت کی دوسری خصوصیت گندا اور غلیظ رہنا تھا۔

نہانا یا جسم کو پانی لگانا راہبوں کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ سینٹ اینتھنی نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام جب سے داخل مسیحیت ہوا پورے پچاس سال اس نے نہ منہ دھویا نہ پاؤں۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سلویا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے کسی حصے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانوینٹ کی ایک سوتیں راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے اور غسل کا نام تو سن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

اس رہبانیت کی وجہ سے رومی معاشرے میں ازدواجی زندگی عملاً حرام ہو کر رہ گئی تھی۔ رہبانیت کی رو سے تجرد سب سے بڑی اخلاقی قدر تھا۔ لہٰذا راہب کے لئے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار عورت کی شکل تک نہ دیکھے اور اگر پہلے سے شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں اور اگر شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیروم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا یعنی مسیح کی ساس (*Mother-in-law of God*) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اولین مقام ہے۔" [۳۲] ان تعلیمات کی وجہ سے خوشگوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی تھی اور چونکہ مسیحیت میں طلاق و تفریق کا راستہ بند تھا اس لئے نکاح میں رہتے ہوئے ہی میاں بیوی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک انتہا پسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ اس زمانے میں ایک پادری کے لئے مجرد ہونا لازمی نہیں تھا۔ البتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح جکڑ پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لئے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔

اس رہبانیت کی وجہ سے صرف ازدواجی زندگی ہی متاثر نہیں ہوئی بلکہ تمام سماجی

رشتوں پر ضرب لگی۔ مسیحی ولیوں اور راہبوں کی نگاہ میں اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کی محبت گناہ تھی۔ ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لئے ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ ایک راہب ایواگریس (Evagrius) سالہا سال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکا یک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں ان خطوط کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی محبت کے جذبات نہ جاگ اٹھیں اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔ ؎۳۳

سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سفارشی خطوط لے کر اس خانقاہ میں پہنچیں جس میں وہ مقیم تھا اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں مگر اس نے ان کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ ؎۳۴

ایک اور ولی سینٹ پوئمن (St. Poemen) اور اس کے چھ بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتہ معلوم ہوا اور وہ ان سے ملنے کے لئے وہاں پہنچی۔ بیٹے ماں کو دور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں کو کہلوا دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔ ؎۳۵ اس سے بھی زیادہ دردناک قصہ سینٹ سیمیون اسٹائلائٹس (St. Simon Stylites) کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر ۲۷ سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا، ماں زندہ تھی۔ بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دور و نزدیک پھیل گئے تو اس کو پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بے چاری اس سے ملنے کے لئے اس کی خانقاہ پر پہنچی مگر اس "ولی اللہ" نے ماں سے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ تین دن اور تین راتیں وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑے رہنے اور روتے رہنے کے بعد مر گئی۔ ؎۳۶

ایک شخص میوٹیس (Mutius) خوشحال آدمی تھا۔ یکا یک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے ۸ سالہ اکلوتے بیٹے کو لے کر ایک خانقاہ میں پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبت دل سے نکال دے اس لئے پہلے تو بیٹے کو اس سے جدا کر دیا گیا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مدت تک طرح طرح کی سختیاں اس معصوم بچے پر کی

جاتی رہیں اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جا کر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لئے بھی تیار ہو گیا تو عین اس وقت راہبوں نے بچے کی جان بچائی۔ جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبہ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔ ۳۷

مسیحی رہبانیت کا نقطہ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو اسے انسانی محبت کی وہ تمام زنجیریں کاٹ دینی چاہئیں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی، بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیروم کہتا ہے "اگر چہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے، اگر چہ تیری ماں دودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے۔ اگر چہ تیرا باپ تجھے روکنے کے لئے تیرے آگے لیٹ جائے، پھر بھی تو سب کو چھوڑ کر اور ماں باپ کے جسم کو روند کر، ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف دوڑ جا۔ اس معاملہ میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے۔" ۳۸

اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مر جاتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انہیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰-۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے۔ اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایرئین (Arian) فرقے کے بشپ نے اتھاناسیوس کی پارٹی پر حملہ کیا۔ اس کے خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ کر نکالی گئیں۔ ان کو برہنہ کر کے خاردار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے تاکہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایرئین فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا۔ حتیٰ کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریس (Arius) کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا۔ اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرل (St. Cyril) کے مرید راہبوں نے ہنگامہ عظیم برپا کیا یہاں تک کہ مخالف فرقہ کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے

گئے۔ اسے قتل کیا، اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اسے آگ میں جھونک دیا۔ روم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ ۳۶۶ء میں پوپ لبریس (Liberius) کی وفات پر دو گروہوں نے پاپائی کے لئے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ دونوں کے درمیان سخت خونریزی ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک دن میں صرف ایک چرچ سے ۱۳۷ لاشیں نکالی گئیں۔ [۳۹]

افسوسناک امر یہ ہے کہ اس ترک دنیا کے ساتھ ساتھ ہی دولت دنیا سمیٹنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں حالت یہ ہوچکی تھی کہ روم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جیروم اپنے زمانے (چوتھی صدی عیسوی کے آخری دور) میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بشپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کلیساؤں کی طرف دولت کا یہ بہاؤ ساتویں صدی عیسوی (نزول قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرادی گئی تھی کہ جس سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوجائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگا پر نذرانہ چڑھانے، یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آرہی جس سے فرار ان کا طرہ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کا موجب ہوئی وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لئے بے پناہ عقیدت پیدا ہوگئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباس درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہوگئے اور انہوں نے ترک دنیا کے بھیس میں جلب دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبین دنیا ان سے مات کھا گئے۔ [۴۰]

عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بسا اوقات ذرا یا زیادہ مشق کرنے کے لئے ایک بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ ایواگریس بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے ان راہبوں کے ضبط نفس کا ذکر کرتا

ہے جو اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یک جا غسل کیا کرتے تھے اور ان کی دید سے، ان کے لمس سے حتیٰ کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی ان کے اوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی۔'' آخر کار اسی فلسطین کے متعلق نیسا (Nyssa) کا سینٹ گریگوری (م ۳۹۶ء) لکھتا ہے کہ وہ بدکاری کا اڈہ بن گیا ہے۔

دراصل انسانی فطرت کبھی ان لوگوں سے انتقام لئے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت بالآخر فطرت سے لڑ کر بداخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں سے گیارہویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنما ترین داغ ہے دسویں صدی کا ایک اطالوی بشپ لکھتا ہے ''اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بدچلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کر دیا جائے تو لڑکوں کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کر دینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے تو شائد چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے۔''

قرون متوسط کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں۔ ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلاف وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں اور کلیساؤں میں اعتراف گناہ (Confession) کی رسم بدکاری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔[۴۲]

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے آتے آتے رومی سلطنت کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے تار و پود بکھیر کر رکھ دینے والی رہبانیت تھی تو دوسری طرف انتہا درجہ کی عیاشی و بدکاری معاشرے میں جاری تھی۔ رہبانیت صحراؤں میں گوشہ نشین تھی اور شہروں میں فسق و فجور اپنی عروج پر تھا۔

رومی اور ایرانی اس وقت مشرق و مغرب کی امامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ وہ دنیا کے لئے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابیوں اور فساد کے

علمبردار و ذمہ دار تھے۔ مذہب عیسوی بھی انسانی مسائل کو نہ سلجھا سکا کیونکہ اس میں اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ اس کی بنیاد پر تہذیب و تمدن کی تعمیر ہو سکے اور پھر مسیحیت زیادہ عرصہ خالص بھی نہ رہ سکی۔ چوتھی صدی تک آتے آتے عیسائیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت اور رہبانیت کے اجزاء شامل تھے۔ الغرض رومی تہذیب اور مسیحیت کے پاس انسانی دکھوں کا کوئی شافی علاج نہ تھا اور انسان کسی نجات دہندہ کے انتظار میں تھا۔

❧ ◆ ☙

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ پیونک جنگیں ۱۴۶ ق م تا ۲۶۴ ق م کے درمیان لڑی گئیں۔ ایک سو اٹھارہ سالہ دور میں تین پیونک جنگیں ہوئیں۔

۲۔ گبن، جلد اول، ص ۱۔

۳۔ ہارمسورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۷، ص ۲۳۸۸۔

۴۔ ۱۴۶۰ء میں یونان بھی عثمانیوں کے قبضے میں آ گیا۔

۵۔ ندوی، ص ۴-۲۴۳۔ ۶۔ امیر علی، ص ۲۶۰۔

۷۔ محمد قطب، اسلام اور جدید ذھن کے شبہات، مترجم محمد سلیم کیانی، لاہور۔

۸۔ ایضاً۔ ۹۔ امیر علی، ص ۲۶۰۔

۱۰۔ تہذیبیں، جلد ۲، ص ۴۹۷۔ ۱۱۔ مریم: ۲۱۔

۱۲۔ آل عمران: ۳۷-۴۲۔ ۱۳۔ آل عمران: ۴۵۔

۱۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۴، حصہ دوئم، ص ۳۶۳۔

۱۵۔ المائدۃ: ۱۱۶۔ آل عمران: ۵۱۔ آل عمران: ۷۹۔ المائدۃ: ۷۲۔

۱۶۔ آل عمران: ۵۰۔ ۱۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۴، حصہ دوئم، ص ۳۷۴۔

۱۸۔ انجیل کے مطابق یہ شخص یہودا اسکریوتی تھا، جو کہ حضرت عیسیٰ کا ایک شاگرد تھا جسے ۳۰ دینار پر جاسوسی کے لئے تیار کرلیا گیا تھا اور اس نے رومی حکام کو حضرت عیسیٰ کے ٹھکانے تک جنگل میں پہنچایا تھا۔(بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

۱۹۔ ندوی، ص ۲۴۵۔

۲۰۔ امیر علی، روح اسلام، ص ۲۲۴۔

۲۱۔ تہذیبیں، ص ۴۹۷۔

۲۲۔ امیر علی ص ۲۲۴۔

۲۳۔ امیر علی، ص ۲۲۴۔

۲۴۔ ندوی، ص ۲۸۲۔

۲۵۔ گبن، جلد اول، ص ۵۰۵۔

۲۶۔ ندوی، ص ۵۱-۲۵۰۔

۲۷۔ رہبانیت کے معنی خوف کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے کہ کسی شخص کا خوف کی بناء پر (قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو یا دنیا کے فتنوں کا خوف یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہ ہائے عزلت میں جا بیٹھنا۔(بحوالہ مودودی، تفہیم القرآن، جلد ۵، ص ۳۲۴)

۲۸۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ۵، ص ۳۲۷، لاہور، ۱۹۸۴۔

۲۹۔ تفہیم القرآن، جلد ۵، ص ۳۲۷۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۲۸۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۲۰۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ ایضاً۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۳۳۲۔

۴۰۔ ایضاً۔

۴۱۔ غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا مگر نفس کشی کی مشق کے لئے اس قسم کے غسل کر لیے جاتے تھے۔

۴۲۔ تفہیم القرآن، جلد ۵، ص ۳۳۲۔

آٹھواں باب:

عربی تہذیب

عرب کا قدیم نام ''عـربة'' تھا جو بعد میں ''عرب'' ہوگیا، جو ملک کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کا نام بھی قرار پا گیا۔ تمام سامی زبانوں میں ''عـربہ'' صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے، عبرانی میں ''عربا'' بیابان اور میدان کو کہتے ہیں۔ خود عربی زبان میں ''عـــرابة'' کے معنی ریت کے ہیں اور ''اعراب'' اہلِ بادیہ اور صحرانشینوں کے لئے اب تک مستعمل ہے۔ [1]

قرآن مجید میں لفظ ''عرب'' ملک عرب کے لئے کہیں نہیں بولا گیا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سکونت کے ذکر میں ''وادِ غیر ذی زرع'' یعنی ''نا قابلِ کاشت وادی'' کہا گیا ہے۔ توراۃ میں لفظ ''عربا'' متعدد بار آیا ہے، جس سے وہ قطعہ زمین مراد لیا گیا ہے جو حجاز سے شام اور سینا تک وسیع ہے۔ [2] عام ملکِ عرب کے لئے زیادہ تر ''مشرق کی زمین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کبھی جنوب کا کیونکہ ملکِ عرب، فلسطین کے مشرق اور جنوب دونوں اطراف میں ہے۔ لفظ ''عرب'' سب سے پہلے ۱۰۰۰ ق م میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں استعمال ہوا۔ پھر اس کے بعد اس کا استعمال عام طور سے عبرانی، یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے۔ اسلام سے پہلے ہی یہ لفظ پورے ملک کو جو یمن سے شام تک وسیع ہے، محیط تھا۔ [3]

عرب حدود طبعی کے لحاظ سے ایک جزیرہ نما ہے لیکن اہل عرب اس کو جزیرہ العرب کہتے ہیں، اس کے مشرق میں خلیج فارس [4] (Persian Gulf) مغرب میں بحیرۂ احمر (Red

Sea) اور جنوب میں بحیرۂ ہند (Indian Ocean) اور شمال (وشمال مغرب میں) خلیج عقبہ، شام وفلسطین کے علاقے واقع ہیں۔

عرب زیادہ تر بے آباد، خشک اور شور ریگستان ہے۔ تمام ملک میں پہاڑوں کا جال ہے۔ ملک میں کوئی دریا نہیں لیکن عجیب قدرتِ الٰہی یہ ہے کہ یہاں کے پہاڑوں سے ہمیشہ چشمے جاری رہتے ہیں، جن سے دامن کوہ اور وادیاں عموماً سرسبز وشاداب رہتی ہیں۔ شاہانِ عرب نے انہیں چشموں کو روک کر بند بنائے تھے۔ عرب کے وہ مقامات جو سواحلِ سمندر پر واقع ہیں بالعموم سرسبز و شاداب ہیں۔ خصوصاً یمن، اس کے علاوہ عمان، حضرموت، نجد اور طائف سرسبزی و شادابی کے اعتبار سے ملک کا بہترین حصہ ہیں۔ اس ملک کا سب سے طویل پہاڑی سلسلہ ''جبل السراۃ'' ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے۔

آب و ہوا کے اعتبار سے ملک عرب نہایت گرم ہے۔ میدانوں میں جب بادِ سموم چلتی ہے تو کوسوں تک زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ جب ریگ کا طوفان آتا ہے تو پورے کا پورا قافلہ اور آبادی کی آبادی ریگ کے ڈھیر کے نیچے دب جاتی ہے۔ اسی لئے ملک عرب میں موسم اور آب و ہوا کے کسی واقف کار اور آبادی وصحرا کے کسی راہنما کے بغیر سفر کو ہمیشہ خطرناک سمجھا گیا ہے۔

اس ملک کا سب سے بڑا صحرا شمال میں شام وعرب کے درمیان ریگستانی میدان ہے جس کو عموماً بادیہ شام کہتے ہیں، تاہم غیر عرب اس کو بادیہ عرب بھی کہتے ہیں۔ دوسرا ریگستان جنوب میں یمن، عمان اور یمامہ کے درمیان واقع ہے۔ اس وسیع وعریض اور بے آب وگیا صحرا کو ربع الخالی کہتے ہیں (اسی کو ''دہنا'' اور ''صحرائے اعظم'' بھی کہتے ہیں)۔

عرب کے اقوام وقبائل:

مورخین عرب نے اقوام وقبائل کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ عربِ بائدہ

۲۔ عربِ عاربہ

۳۔ عربِ مستعربہ

عربِ بائدہ:

ان سے مراد عرب کے وہ قدیم ترین قبائل ہیں جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔ بائدہ کے معنی ''برباد ہو جانے والے'' کے ہیں۔ عربِ بائدہ کو مندرجہ ذیل شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) عادِ اولیٰ

(ب) عادِ ثانیہ

(ج) ثمود

(د) طسم و جدیس

(ہ) اہل معین

جہاں تک عادِ اولیٰ کا تعلق ہے وہ عرب کے سب سے پہلے اور ابتدائی باشندے تھے، جو ایک مدت کے اتحاد و اجتماع کے بعد ملک عرب سے نکل نکل کر اطراف کے ممالک مثلاً بابل، شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں پھیل گئے اور وہاں انہوں نے زور و اقتدار پیدا کیا۔ قومِ نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران جماعت ظہور پذیر ہوئی قرآن کی رو سے اسی کا نام عادِ اولیٰ ہے۔[۵]

مورخینِ عرب نے عاد کو عوض بن ارم بن سام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لئے ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح (۳۰۰۰ ق م) کا قرار دیا ہے۔ تاہم ان کی حقیقی عظمت و ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م کا سمجھا جاتا ہے۔[۶] اندرونِ عرب، عاد کی مرکزی آبادی، عرب کے بہترین حصے یعنی یمن، حضرموت میں سواحلِ خلیج فارس سے حدودِ عراق تک تھی۔ لیکن بعد میں عادِ اولیٰ، عرب سے نکل کر بابل، شام اور مصر تک پھیل گئے۔ عاد کوئی محدود یا مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ

وہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ایشیاء اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور وقوت کی تماش گاہ تھا۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں ان کے دستِ صنعت کا نتیجہ تھیں۔ قرآن مجید نے اس عظیم الشان قوم کی داستان بار بار دہرائی ہے۔ انہی کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ 7 بہرحال جب یہ قوم شرک اور گمراہی کی مرتکب ہوئی تو تباہ کردی گئی۔ البتہ حضرت ہود علیہ السلام مع اپنے متبعین کے عذاب سے ذرا پہلے عاد کی آبادی سے نکل کر حجاز چلے گئے۔ یہ ''عادِ ثانیہ'' کہلاتے ہیں۔ عادِ ثانیہ نے جزیرہ نمائے عرب آنے کے بعد بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اپنے عروج کو قائم رکھا۔ یہ لوگ حضر موت سے سواحلِ خلیج فارس کے طول میں عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔

عاد کے بعد شہرت وعظمت اور سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی۔ یہ عادِ ثانیہ کے ہم عصر تھے۔ جس طرح جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی اور مشرقی حصے پر، جو خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جاتا ہے، عادِ ثانیہ قابض تھے۔ اس کے مدمقابل عرب کے مغربی اور شمالی حصہ پر ثمود قابض تھے۔ ان علاقوں کا نام اس زمانے میں ''وادی القریٰ'' 8 تھا۔ ثمود کے ملک کا دالحکومت حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ آج کل اس شہر کو ''مدائن صالح'' کہتے ہیں۔ قوم ثمود کے سیاسی حالات بالکل معلوم نہیں۔ مورخین صرف اس قدر بیان کرتے ہیں کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی۔ فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا پتھروں کے عمارات و مقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ثمود کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اس قوم نے بھی اپنے پیغمبر کو جھٹلایا، شرک اور گمراہی کے راستے پر چلتے رہے، یہاں تک کہ ہلاک کردیئے گئے۔

عربِ بائدہ کی ایک شاخ طسم و جدیس بھی تھی۔ یہ جنوبی عرب کے علاقے یمامہ، بحرین اور عمان میں آباد تھے۔ یہ عاد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ اولاً سیاسی طاقت طسم کو حاصل تھی، بعد میں جدیس غالب آ گئے۔ یمامہ میں جس کو قدیم نام کے لحاظ سے ہجر یا قریہ کہنا

چاہیئے، آثار قدیمہ کے نشان اسلام کے عہد تک باقی تھے۔ ان اقوام کی تباہی و بربادی کے بعد ایک مدت تک یہاں ویرانی رہی تا آنکہ آخر میں اسماعیلی و قحطانی عربوں نے ادھر کا رخ کیا اور ان جگہوں کو آباد کیا۔

عرب بائدہ ہی میں اہل معین بھی تھے، جن کا تعلق جوفِ یمن سے تھا۔ عام طور سے ان کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م سمجھا جاتا ہے۔ مملکت معین کا خاص شہر قرن تھا۔ زمین نہایت زرخیز و سرسبز تھی۔ یہ تجارت پیشہ قوم تھی جو زیادہ تر خوشبودار لکڑی، بخورات اور جانوروں کی تجارت کرتی تھی۔ معین کے کھنڈرات اب تک باقی ہیں۔ علمائے آثار نے تقریباً پچیس (۲۵) شاہان معین کے نام دریافت کیے ہیں۔ [۹] اس کے علاوہ بھی بہت سے قبائل بائدہ کے نام سے منقول ہیں۔ [۱۰] لیکن نام کے سوا ان کے حالات کا کوئی علم نہیں۔

عربِ عاربہ (بنو قحطان) کا تمدن:

عرب عاربہ سے مراد بنو قحطان ہیں، جو عربِ بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا (مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کا تعلق انہی سے تھا)۔

اسلام سے قبل عرب عاربہ میں پانچ متمدن سلطنتیں گزریں۔ جن میں اہم معینی اور سبائی و حمیری ہیں۔

۱۔ **معینی:** معینی سلطنت جنوبی عرب میں تھی، اس کے صدر مقام قرن اور معین تھے۔ سطورِ بالا میں اس کا ذکر عربِ بائدہ کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔ کتبوں سے اس سلطنت کے تقریباً پچیس (۲۵) حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے۔ محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم عصر تھیں یا متقدم و متاخر۔ ایک یورپی محقق گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت، سبائی حکومت سے بہت پہلے گزری تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، (اسی حوالے سے اہل معین کا تذکرہ عربِ بائدہ کے ضمن میں بھی کیا گیا ہے۔) جبکہ ایک دوسرے یورپی محقق ولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بناء پر سبائی اور معینی

حکومتیں ہم عصر ہیں۔[۱۱]

۲۔ سبائی حکومت: جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو برس قبل سبا کی حکومت قائم تھی، اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا۔ اس زمانے کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں۔ ۱۱۵ ق م تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے اس کے بعد حمیر حکومت سبا پر قابض ہو گئے۔ ان کے زمانے میں ایک بار رومی بادشاہ نے عرب پر چڑھائی کی کوشش کی، یہ پہلی کوشش، آخری بھی ثابت ہوئی۔ اے لیس گالس جس نے ۱۱۸ ق م میں عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا اس کے رہبر دغا بازی سے اس کو لشکر سمیت صحرا میں لے گئے، ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا۔[۱۲] یمن میں سبا کی تہذیب اس وقت پھل پھول رہی تھی جب ابھی شہر روم کی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی۔

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اسی زمانے کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ۵۲۵ء میں اہل حمیر کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔ یمن پر حبشیوں کی حکومت تقریباً ۷۴ سال تک رہی۔ ساتویں صدی کے آغاز میں ایرانیوں نے حبشیوں کو شکست دے کر یمن پر قبضہ کر لیا۔ یاد رہے آلِ حمیر نے اپنے دور میں ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لیے تھے۔ بہر حال ظہور اسلام تک یمن پھر ایرانی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ آخری ایرانی گورنر باذان نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول کر لی تھی جس کے ساتھ ہی یمن اسلامی عمل داری میں شامل ہو گیا۔

سبا، حمیر کے دور میں جنوبی عرب کا سیاسی اور معاشی نظام بہت ترقی یافتہ تھا۔ موسیو گستالیبان نے قبل مسیح کے قدیم حوالوں سے یمن کی مدنیت، شہر مآرب اور سد مآرب کی تفصیل بیان کی ہے جو عرب مورخین کے بیانات کی تصدیق کرتی ہے۔[۱۳] سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کے بارے میں مشہور جرمن مستشرق نولد یکی لکھتے ہیں:

> "ولادتِ مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و مشرقی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور اپنی بارش گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن

کے اس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذباتِ مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان و روم نے اس کو ''دولت مند عرب'' کا جو لقب دیا تھا وہ بے جا نہ تھا...... توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

کتابت کا فن جو اہل سبا نے بہت ہی ابتدائی زمانہ سے شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا، یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری طرف ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا۔'' [۱۴]

سبا اور حمیر کے زمانے کا تمدن ہر اعتبار سے ترقی یافتہ تھا۔ ان کی کئی شاندار عمارات میں سے ایک قصر غمدان تھا جس کا تذکرہ بڑے طلسماتی انداز میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح مشہور و معروف سد مآرب ہے، یہ شاندار بند تھا جسے سبا نے پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق م میں تعمیر کیا تھا۔ [۱۵] شہر مآرب کے جنوب میں دو پہاڑ ہیں جنہیں کوہِ ابلق کہا جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیا وادی اذنیہ ہے۔ پہاڑوں سے پانی جمع ہو کر وادی میں ایک دریا سا جاری ہو جاتا ہے۔ سبا نے ان پہاڑیوں کے بیچ میں اس بند کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند تقریباً ۱۵۰ فیٹ چوڑی ایک دیوار تھی۔ اس بند میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں جو حسبِ ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں۔ بند کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے دروازے تھے، جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمین کو سیراب کرتا تھا، بعد میں جب ملک میں سیاسی انتشار پھیلا اور بند کی نگرانی کی طرف سے غفلت برتی گئی تو یہ بتدریج تباہ ہو گیا، تاہم اس کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ [۱۶]

بنو قحطان کی ان اہم حکومتوں کے علاوہ ایک حکومت حضر موت تھی جس کا صدر مقام یمن کا مشہور مقام حضر موت تھا، اسی طرح جنوبی عرب کے علاقے عدن میں قتبانی حکومت قائم ہوئی۔ نابتی حکومت جو شام کے حدود سے متصل تھی اور قوم ثمود کی قائم مقام تھی، ان سب کی تمدنی ترقیاں عروج پر تھیں۔ اسلام سے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں ان کی جگہ یمن میں صرف

بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے۔ البتہ عراق میں آل منذر کے خاندان کے تحت حکومت حیرہ اور شام کی حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جن کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ حکومت حیرہ:

حیرہ کی حکومت عراق عرب میں قائم قحطانی عربوں کی نیم خود مختار حکومت تھی۔ ایرانی بادشاہ، شاپور اوّل کے عہد (۲۴۰ء) میں حکومت ایران نے نہر فرات کے کنارے حیرہ کی مملکت کی بنیاد رکھ کر عمرو بن عدی کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔ یہ ایک طرح کی بفر اسٹیٹ تھی۔ حیرہ کی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ایران پر اس کی سمت سے حملہ آور کے خلاف مدافعت کرے۔ اس کے عوض ایران نے اسے ٹیکس کی ادائیگی سے معافی دے رکھی تھی۔ ایرانی حکومت عموماً حیرہ کے عربوں پر قحطانی عربوں کے مشہور قبیلہ بنو قضاعہ کی ایک شاخ بنولخم کے کسی فرد کو مقرر کرتی تھی اسی لئے اس کو آل لخم یا لخمی حکومت بھی کہتے ہیں۔ پایہ تخت حیرہ کی مناسبت سے یہ ملک حیرہ ہی کہلائے جاتے تھے، نیز متعدد حکمرانوں کے نام "منذر" ہونے کی وجہ سے اس حکومت کو مناذرہ کی حکومت بھی کہتے تھے۔ حیرہ پر مناذرہ کے بائیس بادشاہوں نے تین سو چونسٹھ (۳۶۴) سال تک حکومت کی۔ قبیلہ لخم کی امارت کا نظام جو بوجوہ ۶۰۲ میں ختم کر دیا گیا، اس کے بعد یہاں ایرانی حکومت اپنی طرف سے ایرانی گورنر مقرر کرتی تھی۔ جس کی اطاعت حیرہ کے تمام امرائے عرب کیا کرتے تھے۔ یہ دستور ۶۳۳ء تک باقی رہا جبکہ حیرہ کو مسلمان سپہ سالار حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا۔ ۱۷ حیرہ کا شہر تمدن کے ایک خاص معیار تک پہنچ گیا تھا۔ آراستگی اور خوبی میں دارالسلطنت ایران اور قسطنطنیہ کا مقابلہ کرتا تھا۔ ۱۸ بادشاہوں کے دربار میں شعراء جمع رہتے، حیرہ کا شہر عالی شان محلات، شاداب باغات اور نظر فریب نہروں کی وجہ سے اس عہد کا بارونق شہر سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ حکومت غسانیہ:

شام کی سرحد پر غسانیہ (آل جفنہ) کی حکومت رومیوں کے زیر اثر قائم تھی۔ قحطان

کی ایک شاخ بنو کہلان کے عربوں کی یہ ایک نیم خود مختار حکومت تھی، جس کا پایہ تخت بصریٰ کا شہر تھا۔ یہ حکومت حوران اور بلقاء کے دونوں منطقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنے وقت کی خاص متمدن حکومت تھی، آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات نے ان کی ترقی کی عظمت کو ثابت کر دیا ہے۔ یہ حکومت تیسری صدی عیسوی میں وجود میں آئی اور اس کا خاتمہ ۶۳۳ء میں عہد فاروقی میں ہوا۔ یوں آل غسان کے حکمرانوں نے کم و بیش چار سو سال حکومت کی۔ ان حکمرانوں نے رومیوں کے زیر اثر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ بنو کہلان کے عربوں کی اس حکومت کو غساسنہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یمن سے ہجرت کے بعد یہ لوگ تہامہ میں نہر غسان کے کنارے آباد ہوئے تھے اسی نسبت سے وہ غسان کے نام سے معروف ہوئے۔ انہیں بانی خاندان کے نام سے آل جفنہ بھی کہتے ہیں۔ [19] غسانیوں کا آخری فرمانروا جبلہ بن ایہم تھا۔ [20]

عربِ مستعربہ (عدنانی):

یعنی بنو اسمٰعیل۔ یہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد تھی جو حجاز میں آباد ہوئی۔ حضرت اسمٰعیل جب مکہ میں آباد ہوئے جو جزیرۃ العرب کا وسطی علاقہ ہے، تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے۔ حضرت اسمٰعیل نے اس خاندان میں شادی کی۔ اس سے جو اولاد ہوئی وہ عربِ مستعربہ کہلائی۔ عرب عاربہ یعنی بنو قحطان اور عرب مستعربہ یعنی بنو اسمٰعیل کی تہذیبی حالت میں نمایاں فرق تھا۔ بنو قحطان نے جنوبی اور شمالی عرب میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں اور تہذیب و تمدن کے بلند تر معیار تک پہنچے جس کا تذکرہ اوراق گزشتہ میں کیا گیا جبکہ عرب مستعربہ یعنی بنو اسمٰعیل جو وسطی عرب یعنی حجاز میں آباد تھے، بادیہ نشینی اور قبائلی زندگی گزارتے رہے۔ شمالی و جنوبی عرب کی مقابلتاً متمدن ریاستوں کا کوئی خاص اثر وسطی عرب پر نہیں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی، وسطی اور جنوبی عرب میں سرحدی اتصال کے باوجود تہذیب و تمدن کا اتنا واضح فرق کیوں نظر آتا ہے؟

اس کی سب سے قوی وجہ ان علاقوں کے مختلف جغرافیائی حالات و عوامل ہیں۔ کسی جگہ کی تہذیب و تمدن کے تشکیلی عناصر میں وہاں کے طبعی حالات کو ایک طاقت ور عامل سمجھا جاتا

ہے۔ یہ انسانی خدوخال سے لئے کر طرزِ معاشرت و معیشت تک ہر معاملہ میں حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ وسطی عرب کے ریگستانی علاقوں کے عربوں کا گلہ بان ہونا اور شمالی یا جنوبی عرب کے رہنے والوں کا اہل زراعت وتجارت ہونا کچھ اُن کی اپنی پسند یا صوابدید پر منحصر نہیں تھا۔ بلکہ یہ وہاں کے جغرافیائی حالات کا حکم تھا کہ وہ ایسا کریں اور جہد للبقا کے لئے انہوں نے ایسا ہی کیا۔[۲۱] جس کی وجہ سے دو مختلف قسم کے تہذیبی رویئے سامنے آئے۔

وسطی عرب میں بھی دو طرح کی معاشرت نظر آتی ہے، یہ معاشرتی تفاوت دراصل طرزِ معیشت کی بناء پر۔

۱۔ حضری (یعنی اہل المدر)

۲۔ بدوی (یعنی اہل الوبر)

شہروں کے رہنے والے حضری تھے۔ ان کا پیشہ زراعت اور تجارت تھا۔ بدویوں کی نسبت ان کی تعداد بہت کم تھی اسی لئے وسطی عرب میں شہروں کی تعداد بہت کم تھی مثلاً حجاز میں مکہ، مدینہ اور طائف اس کے علاوہ خیبر اور نجد وغیرہ۔ یہاں کے رہنے والے زراعت اور تجارت پیشہ تھے۔حجاز میں قریش کے مختلف بطون پھیلے ہوئے تھے۔

وسطی عرب کے عربوں کے دوسرے گروہ کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ یہ اہل البادیہ تھے۔ یہ منتشر اور مسافرت میں رہتے۔ انہیں اپنے مویشیوں کے لئے نئی چراگاہوں اور نئے چشموں کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا تھا۔ یہ کثیر التعداد تھے۔ یہ اہل البادیہ حضارت اور مدنیت سے دور بھاگتے تھے۔ حضری باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہیں غلام سمجھتے تھے۔ یہ بدوی اپنی آزادی کو انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ یہ کبھی مفتوح نہیں ہوئے۔ ان کے پڑوس میں دو بڑی مملکتوں کی موجودگی کے باوجود انہیں کوئی فتح نہیں کرسکا۔ ان میں وحشت کا عنصر زیادہ تھا۔ جنگجویانہ اوصاف کے حامل تھے۔ اسلحہ کا استعمال ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ ریگستانی راہوں پر قافلوں اور مسافروں کو لوٹ لینا ان کی معاشی مجبوری تھی۔ وہ آرام وآسائش کی متمدن زندگی سے آشنا ہی نہیں تھے، ان کی معاشرت میں حیرت انگیز سادگی تھی۔ وہ خیموں میں زندگی گزارتے،

پانی اور چارے کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہتے اور لوٹ اور لڑائی پر زندگی بسر کرتے تھے۔

بہرحال عرب خواہ اہل حضارۃ ہوں یا اہل البادیہ، ان کا طرزِ زندگی ''قبائلی'' تھا۔ وسطی عرب میں عہد جاہلیہ میں قبیلہ ہی وہ وحدت تھی جس پر عربوں کی اجتماعی زندگی کا دار و مدار تھا۔ حجاز کا سب سے بڑا قبیلہ قریش تھا۔ جس کے مختلف بطون گرد و نواح میں پھیلے ہوئے تھے۔ قریش کے اجداد میں ایک اہم شخصیت قصی بن کلاب کی تھی جس نے مکہ میں ایک شہری نظام متعارف کرایا۔ قصی بن کلاب کا زمانہ اسی سے قریش کی حقیقی عظمت کا آغاز ہوتا ہے۔ قصی نے مکہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے قبائل قریش کو منظم کیا، مکہ سے بنو خزاعہ کو نکال کر وہاں قریش کی بستیاں بسائیں۔ اس نے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی، جس کے چودہ عہدے دار تھے جن پر قریش کے مختلف خاندانوں کے لوگ مقرر تھے۔ خود قصی کی حیثیت رئیس اعلیٰ کی تھی۔ اس ریاست کا ایوانِ حکومت خانہ کعبہ سے متصل دارالندہ کی عمارت میں تھا۔ یہ شہری ریاست اپنے عہد کی ایک متمدن ریاست تھی جو قریش کی نسبتاً ترقی یافتہ سوسائٹی کی خبر دیتی تھی۔ دراصل قصی نے حدودِ شام میں تربیت پائی تھی، ہوسکتا ہے قصی نے تہذیبِ زندگی، نظمِ حکومت اور تاسیس قومیت کے اصول شام ہی کے ملک سے سیکھے ہوں اور جوانی میں حجاز آ کر اسی اصول پر قریش کے منتشر قبائل کو یکجا کیا اور ان میں ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ریاست کے مختلف عہدے قبائل قریش کے درمیان تقسیم تھے جو وراثتاً انہی خاندانوں میں رہتے تھے اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ نظام بھی قبائلی ہی تھا۔

گویا وسطی عرب کے صحرا ہوں یا شہر، طرزِ زندگی بہرحال قبائلی تھا۔ اور جہاں قبائلیت ہوتی ہے وہاں سیاسی لامرکزیت ہوتی ہے۔ عرب معاشرے میں ہر قبیلہ ایک اکائی اور سیاسی اعتبار سے خود مختار تھا۔ پوری وسطی عرب میں کسی ایسی منظم حکومت کا پتہ نہیں چلتا جس کے سامنے سارے قبائل جوابدہ ہوں۔ اس لئے قبائل کو من مانی کرنے کی یک گونہ آزادی تھی۔ کسی مرکزی حکومت کی عدم موجودگی خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ملک میں معاشی وسائل محدود ہوں، آئے دن کی جنگوں کا باعث تھی۔ عرب قبل اسلام کی ان قبائلی جنگوں کو ''ایام العرب'' کہتے ہیں۔

المیدانی نے **مجمع الامثال** کے ۲۹ ویں باب میں ''ایام العرب'' سے بحث کرتے ہوئے زمانہ قبل از اسلام کے ۱۲۳۳ ایام کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایام کسی ایک نسلی گروہ کے مابین یا دو مختلف نسلی گروہوں کے درمیان ہی موجود نہ تھے بلکہ ایک ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل آپس میں دست بگریباں ہو جاتے تھے۔ اسی طرح عرب و عجم کی متحارب جماعتیں بھی مصروف جنگ رہتی تھیں۔ چند مشہور ایام العرب میں سے ایک جنگ بسوس تھی جو ربیعہ کے دو قبائل بنو بکر اور بنو تغلب کے درمیان ہوئی اور جس کی اصل وجہ چراگاہ میں اونٹ کو چرانے کا حق تھا۔ دوسری مشہور جنگ حرب داحس والغبراء تھی جو دو گھوڑوں کی مسابقت اور شرط کی رقوم کی ہار جیت پر اختلاف ہو جانے کے باعث مضر کے دو قبائل عبس اور ذبیان کے درمیان ہوئی۔ تیسری مشہور جنگ حرب فجار تھی جس میں ایک فریق قریش اور کنانہ تھے اور دوسرے فریق ہوازن (قیس عیلان) تھے۔ ایام العرب میں چوتھی قابل ذکر جنگ حرب ذی قار کے نام سے مشہور ہے جو کہ ربیعہ کے قبائل اور ایران کی شاہی فوج کے مابین شاہان حیرہ کے امانت رکھے ہوئے سامان کی واپسی کے تنازعہ پر ہوئی۔ ۲۲

یہ جنگیں عرب معاشرے کا المناک باب تھیں۔ جنگ بسوس کا نقشہ عرب شاعر مہلہل نے اس طرح کھینچا ہے:

[دونوں خاندان مٹ گئے
ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی
بچے یتیم ہوئے
آنسو خشک نہیں ہوئے
لاشیں دفن نہیں کی جاتیں۔]

جہاں تک ان کی معیشت کا تعلق ہے۔ حضری عربوں کا پیشہ تجارت تھا۔ ان کے تاجر حبشہ، عراق، ایران، شام بلکہ ایشیائے کوچک تک جاتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں سے جو ان کے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ وہ تجارتی ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ چونکہ عرب میں کسی مرکزی

حکومت کی عدم موجودگی کی وجہ سے امن و امان کی صورت حال تسلی بخش نہیں تھی اور تجارتی قافلوں کولوٹ لینا عربوں کی معاشی ضرورت تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے قریش اور دیگر قبائل عرب نے تجارتی قافلوں کی بسلامت آمد و رفت کی غرض سے بعض ممالک سے معاہدے بھی کیے تھے۔ مثلاً مکہ میں عبدمناف کے بیٹوں میں ہاشم نے شاہان روم اور آل غسان سے۔ عبدشمس نے نجاشی الاکبر سے، مطلب نے ملوک حمیر سے اور نوفل نے اکاسرہ ایران سے، ان کے ممالک میں تجارتی قافلوں کی بحفاظت آمد و رفت اور عربوں کی نو آبادیوں کے لئے اجازت حاصل کی اور معاہدے کیے۔ اسی طرح رابیہ (حضرموت) میں قریش، ملوک کندہ کی حفاظت میں اپنا مال لے جاتے تھے۔ تمام قبائل عرب میں قریش سامان تجارت لے کر جاتے تھے اور ایک تو اس وجہ سے کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور دوسرے ان معاہدوں کی وجہ سے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جاتی تھی۔[۲۳]

قرآن مجید میں سورۃ قریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی احسان کی طرف اہل قریش کو متوجہ کیا ہے۔ ایک تو ج کی وجہ سے قریش کو کھانے پینے کی فراغت تھی اور چونکہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ کی عام عظمت اہل عرب کے دلوں میں موجود تھی۔ اس کی بناء پر وہ ''جیران اللہ'' یعنی خدا کے پڑوسی سمجھے جاتے تھے۔ لوگ ان کو نہیں ستاتے تھے اور ان کے تجارتی قافلے بے دھڑک گزرا کرتے تھے۔

تجارتی غرض سے پورے جزیرہ نمائے عرب میں سال کے مختلف مہینوں میں بازار لگا کرتے تھے۔ عام تاجروں کے علاوہ بڑے سرداروں کے اسباب تجارت بھی ان بازاروں میں اسی وقت بحفاظت آسکتے تھے جب ان کی باربرداری اور صیانت کی ضمانت قرب و جوار کے قبائل نے لی ہو۔ عرب کے مختلف بازاروں میں اسباب تجارت کو بحفاظت پہنچانے کی غرض سے تاجروں کو ایک رقم دینا پڑتی تھی جسے ''خفارہ'' کہتے تھے۔ جس کے لفظی معنی ہیں کسی کو اپنی پناہ میں لینا۔ خواہ معاوضہ کے ساتھ یا بلا معاوضہ۔ دومۃ الجندل کے بازار میں جو ربیع الاول کے پہلے پندرہواڑے میں لگتا تھا، تجار، بنوکلب و جدیلہ کی حفاظت میں خرید و فروخت کرتے تھے۔

مشقر کے بازار میں جو جمادی الآخرۃ میں لگتا تھا، بنو عبدالقیس اور بنو تمیم کا عمل دخل تھا اور ان کی رضامندی کے بغیر یہاں مال لانا ممکن نہ تھا۔ رابیہ (حضر موت) میں بنو آکل المرار (ملوک کندہ) اور آل مسروق بن وائل حضرمی کے زیر خفارہ مال تجارت لایا جاتا تھا۔ عکاظ کا مشہور بازار جو اشہر حرام (ذوالقعدہ اور ذی الحجہ) میں لگتا تھا البتہ خفارہ سے پاک تھا۔ خفارہ کی رقم عشور کے علاوہ ہوتی تھی جو تجار کو بازار کی زمین استعمال کرنے اور راہداری کے عوض دینا پڑتی تھی۔[۲۴]

الغرض ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد لاقانونیت، جس کا مزاج لامرکزیت اور جس کی معیشت غنائم پر ہو اس میں ذاتی و اجتماعی حفاظت کے لئے جو طریقہ رائج ہوگا وہ قبائلی ہوگا۔ کسی مضبوط حکومت اور مذہب کی عدم موجودگی میں انفرادی اور اجتماعی بقا کی ضمانت قبائل کی باہمی عصبیت پر ہوگی۔ چنانچہ عرب جاہلیہ میں معاشرے کی ہیئت ترکیبی قبائلی نوعیت کی تھی اور قبائلی عصبیت کے باعث لوگ اپنی جان اور اپنے مال کو محفوظ تصور کر سکتے تھے۔ عربوں کی اس قبائلی عصبیت کی اساس اتحاد نسب تھی۔ چنانچہ ایک باپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد ایک رشتہ اتحاد میں پروئے ہوئے تھے۔ جب کسی قبیلے کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور یہ تمام حصے الگ الگ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور صرف خاص خاص موقعوں پر مشترکہ مفاد اور حفاظت کے لئے یا کسی غیر معمولی فوجی مہم کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے۔

ان قبائل کے داخلی طبقات یہ تھے۔

۱۔ شعب (جمع شعوب): یہ بعید ترین نسبی تعلق ہوتا تھا اس کی مثال عدنان اور قحطان ہیں۔

۲۔ قبیلہ (جمع قبائل): ایک شعب سے تعلق رکھنے والے مختلف نسلی گروہ الگ الگ شاخوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ ان میں ہر شاخ ایک قبیلہ کہلاتا تھا مثلاً عدنان کی نسل سے تعلق رکھنے والے دو بڑے قبائل میں تقسیم ہوئے جن میں ایک مضر تھے اور دوسرے ربیعہ۔ قبائل کو ''جماجم'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

۳۔ عمارۃ (جمع عمائر یا عمارات): ایک قبیلہ مختلف نسلی سلسلوں میں بٹ جاتا تھا ان میں سے ہر سلسلہ کو عمارہ کہا جاتا تھا مثلاً مضر کا قبیلہ مختلف عمائر میں تقسیم ہوا جن میں سے ایک

قریش اور دوسرے بنوغفار تھے۔

۴۔ **بطن** (جمع بطون یا ابطن): عمارہ کی نسلیں مختلف شاخوں میں پھیل جاتی تھیں ان میں سے ہر شاخ کو بطن کہتے تھے۔ مثلاً قریش کی متعدد شاخوں میں سے ایک بنوعبد مناف اور دوسری بنومخزوم وغیرہ تھی۔

۵۔ **فخذ** (جمع افخاذ): بطن کے متعدد انساب الگ الگ فخذ کہلاتے تھے مثلاً بطن عبد مناف میں بنو ہاشم اور بنوامیہ کے فخذ تھے۔

۶۔ **فصیلہ** (جمع فصائل): فخذ کی مزید تقسیم کو فصیلہ کی اصطلاح سے ظاہر کرتے تھے مثلاً بنو ہاشم میں بنوابی طالب اور بن عباس کے فصیلے تھے۔

۷۔ **اسرہ یا عائلہ**: فصیلہ متعدد خاندانوں میں تقسیم ہوتا تھا ہر خاندان کو ایک الگ اسرہ یا عائلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ مثلاً آل ابی طالب کے اسروں میں آل جعفر، آل علی اور آل عقیل کے نام ملتے ہیں۔[25]

قبائل کے ان طبقات کے درمیان اتحاد اور یک جہتی کا فقدان ہوتا تھا تاہم جب دوسروں سے مقابلہ پیش آ جائے تو یہ ایک ہو جاتے تھے۔ عربوں کا یہ قول مشہور تھا، میں اور میرا بھائی، چچا کے لڑکے سے جنگ کر سکتے ہیں لیکن غیر کے مقابلے میں، میں اور میرا چچا زاد دونوں ایک ہیں۔[26] اس قبائلی عصبیت کی حد یہ تھی کہ ہر شخص اپنے بھائی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا تھا، خواہ اس کا بھائی ظالم ہو یا مظلوم۔ بقول ابن خلدون انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز، رشتہ دار پر ظلم ہوتے برداشت نہیں کر سکتا۔[27]

اب ایسی حالت میں جبکہ طاقت و عصبیت کا دار و مدار قبائل پر ہو اور ملک میں عام لاقانونیت کا چلن ہو، کوئی مربوط سیاسی نظام بھی نہ ہو تو ہر قبیلہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرے۔ قوت میں یہ اضافہ، کثرت تعداد ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اولاد نرینہ کی کثرت انتہائی طمانیت کی بات تھی۔ عرب جاہلیہ میں سرداری کے لوازمات میں سے ایک کثیر العیال ہونا بھی تھا۔ جماعت کی تعداد، اکثریت کی قوت

اور رشتہ داریوں کے زیادہ سے زیادہ پھیلنے کو عرب عزت و غلبہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عرب متعدد عورتوں سے بیک وقت نکاح کیا کرتے تھے۔

یوں تو عربی معاشرے میں عورتوں کی کوئی خاص عزت و مرتبہ نہیں تھا مگر صاحب اولاد خواتین کے شرف و عزت میں یقیناً اضافہ ہو جاتا تھا۔ عربوں میں کثیر الاولاد عورت کو ''ناتق'' کہتے تھے اور یہ عورتوں میں پسندیدہ صفت سمجھی جاتی تھی۔

جہاں تک عربوں کی مذہبی حالت کا تعلق ہے تو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی تعلیمات کو بھلا کر اہل عرب بت پرست بن چکے تھے۔ عرب میں ہر قبیلہ، ہر شہر اور ہر علاقے کا اپنا خاص بت تھا، بلکہ ہر گھر کا بت جدا تھا۔ بتوں کے بارے میں اس قدر غلو اور انہاک تھا کہ اگر کوئی شخص بت نہ تراش سکتا یا بت خانہ نہ بنا سکتا تو حرم کے سامنے یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا ایک پتھر گاڑ دیتا اور اس کے ارد گرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے ان پتھروں کو وہ ''انصاب'' کہا کرتے تھے۔ ۲۸ خود خانہ کعبہ کے اندر اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بت تھے۔ ۲۹

بخاری میں ابو رجاء العطاروی سے روایت ہے ''ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے اگر اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے، پھر اسی کا طواف کرتے۔'' کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔ ۳۰

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لُحی تھا۔ اس کا اصل نام ربیعہ بن حارثہ تھا۔ عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے۔ وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا ان کو کیوں پوجتے ہو انہوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں۔ لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں۔ قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں۔ عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس نصب کیے۔ کعبہ چونکہ عربوں کا مرکز تھا اس لئے تمام قبائل میں

بت پرستی کا رواج ہوگیا۔ ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا۔ یہ سمندر کے کنار قدید کے قریب نصب تھا۔ اوس اور خزرج اسی پر قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام یہیں اتارتے تھے۔ ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔ سب سے بڑا بت ہبل تھا جو کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔[۳۱]

بتوں کے علاوہ بھی عربوں کے متعدد اور مختلف معبود تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لئے ان سے شفاعت کے طلبگار ہوتے۔ ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے۔ کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی۔[۳۲] قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا۔ کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا۔ بنو تمیم دبران کی، لخم و جذام مشتری کی، بنو قیس شعریٰ اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتے تھے۔[۳۳]

عرب میں یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت بھی موجود تھی۔ یہودیوں نے جنہیں آشوریوں، یونانیوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے گھر سے بے دخل کیا تھا، عرب میں پناہ لی تھی اور عربوں میں بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرلیا تھا۔ خصوصاً یثرب میں ان کا غلبہ تھا۔ عیسائیت بھی چند قبیلوں کی حد تک پھیل چکی تھی۔ مثلاً بنو حارث (نجران)، بنو حنیف (یمامہ)، بنو تغلب (بین النہرین)، بنی عبدالقیس (بحرین) اور خزاعہ (دومۃ الجندل) عیسائیت کے پیروکار بن چکے تھے۔ اگرچہ عیسائیت کی تبلیغ پانچ صدیوں سے ہو رہی تھی تاہم عرب میں اسے بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مجوسیت کے نام لیوا بالخصوص آل حمیر میں موجود تھے۔

بت پرستی تو خیر بے روح چیز تھی لیکن یہودیت و عیسائیت بھی ان عربوں کی تہذیب نفس میں بری طرح ناکام رہی تھی۔ اخلاقی اعتبار سے عرب صریح جہالت میں مبتلا تھے۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور عام طور سے پی جاتی تھی۔ شراب کی دوکانیں برسرراہ ہوتی تھیں اور علامت کے طور پر ان پر جھنڈا لہراتا تھا۔ ان عربوں کی زندگی میں جوا کھیلنا بڑی خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی سمجھی جاتی تھی۔ عالم قتادہ (تابعی) کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھربار کو داؤں پر لگا دیتا تھا پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ

میں جاتے دیکھتا اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آجاتی۔ ۳۴؎

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے، اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے۔ عرب اور بالخصوص اہل مکہ شراب، جوئے اور گانے بجانے کے والہ و شیدا تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح عرب میں بھی ناچ گانا ادنیٰ طبقے کی عورتوں کا پیشہ تھا، جنہیں قیان (Kiyan) کہتے تھے اور جن کی عصمت فروشی ضرب المثل تھی۔ اس کے باوجود ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور بڑے بڑے سرداران سے مفاخرانہ عشق بازی کرتے تھے۔ ان لوگوں کی اخلاقی گراوٹ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے گھروں میں ضیافتیں دیا کرتی تھیں جن میں شہر کے رؤساء و امراء شامل ہوتے تھے۔ ۳۵؎ بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے نامور شاعر امراء القیس ایک قصیدہ میں اپنی پھوپی زاد کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ ۳۶؎

ہندوؤں کی طرح عربوں میں تعدد ازدواج کا رواج تھا۔ یمن کے نیم صابی اور نیم یہودی قبائل کے یہاں تو ایک عورت کا بیک وقت کئی مردوں کی بیوی ہونے کا دستور تھا۔ سامان اور حیوان کی طرح عورتیں بھی وراثت میں منتقل ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک متوفی مرد کی بیوائیں دوسرے املاک کی طرح اس کے بیٹوں کو ورثے میں ملتی تھیں۔ حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی۔ کھانے میں بہت سی چیزیں تھیں جو مردوں کے لئے خاص تھیں اور عورتیں اس سے محروم تھیں۔ ۳۷؎

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا بھی بعض قبائل میں دستور تھا۔ عرب کے بعض شرفاء و رؤسا ایسے موقعوں پر بچیوں کو خرید کر ان کی جانیں بچاتے تھے۔ زید بن عمرو بن نفیل ۳۸؎ قریش کے پہلے شخص تھے جنھوں نے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی مخالفت کی، جب کوئی شخص ایسا کرتا تو وہ جاکر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صعصہ بن ناجیہ کا بیان ہے ''اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا۔'' ۳۹؎ بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی بناء پر

لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی، ایسے میں جاہلی باپ دھوکہ دے کر اپنی بچی کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا۔

عرب میں قبائلی نظام تھا اور قبائلی نظام کی بقا شدید عصبیت میں پنہاں ہوتی ہے۔ اس جاہلی عصبیت کے مزاج کو اس مشہور عربی جملے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ''انصر اخاک ظالما او مظلوما ''یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔اس پر مستزاد یہ کہ عرب فطرتاً جنگجو واقع ہوئے تھے۔ دراصل ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جنگ ان کے لئے زندگی کی ایک ضرورت ہی نہیں بلکہ تفریح و دلبستگی کا سامان بھی بن گئی تھی، جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا۔ایک شاعر فخر یہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لئے ہم اپنے برادر اور حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ؎

و احیانا علی بکر اخینا اذا مالم نجد الا اخانا (حماسہ)

پورا ملک عرب گویا شکاری کا جال تھا۔کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکے سے قتل کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ بڑی سلطنتوں کو بھی اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لئے چوکی، پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائلی سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی۔

المختصر جہاں تک چھٹی صدی کا تعلق ہے تو اس زمانے میں عربوں سمیت روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نہیں تھی جو من حیث القوم صالح کہی جا سکے اور کوئی معاشرہ ایسا نہیں تھا جو اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہو۔اس عالمگیر تاریکی کا نقشہ سورۃ روم میں کھینچا گیا ہے۔

ظھر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون. (الروم:۴۱)

ترجمہ [خرابی پھیل گئی ہے خشکی اور تری میں۔لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں تا کہ اللہ ان کے بعض اعمال کا مزا چکھا دے اور وہ باز آ جائیں۔]

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ ندوی، سیّد سلیمان، تاریخ ارض القرآن، ص ۵۷، ۵۸۔
۲۔ ایضاً، ص ۵۹ (بحوالہ بائبل، کتاب استثناء)
۳۔ ایضاً۔
۴۔ عرب اس کو خلیج عرب (Arabian Gulf) کہتے ہیں۔
۵۔ الاعراف: ۹ ترجمہ [(اے عاد کے لوگو) خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اپنی خلافت (یعنی حکومت) عطا کی۔]
۶۔ تاریخ ارض القرآن، ص ۱۲۹۔
۷۔ ابن قتیبہ، المعارف، ص ۶۵، (مترجم علی محسن صدیقی) قرطاس، کراچی، ۱۹۹۹ء۔
۸۔ اس کو وادی القریٰ اس لئے کہتے تھے کہ عہد قدیم میں یہ وادی چھوٹی آبادیوں سے جا بجا آباد تھی۔ اس کے کھنڈرات اب بھی باقی ہیں۔ راقمہ نے بھی یہ کھنڈرات ۱۹۹۷ء میں دیکھے ہیں۔
۹۔ تاریخ ارض القرآن، ص ۳۱۶۔
۱۰۔ مشہور جاہلی شاعر نابغہ ذبیانی، جو اسلام سے کچھ پہلے گزرا ہے۔ اس نے ایک قصیدہ میں عرب کے قبائل بائدہ کا ذکر کیا ہے۔ دیکھئے ارض القرآن، ص ۲۲۰۔
۱۱۔ نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی، جلد اول، ص ۱۱۰، اعظم گڑھ، انڈیا، طبع چہارم (تاریخ ندارد)۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۱ (بحوالہ آر، نکلسن، لٹریری ہسٹری آف دی عربس، کیمبرج، ص ۴-۶)۔
۱۳۔ دیکھئے موسیو گستاولیبان، تمدن عرب، صفحات ۱۹۲ تا ۱۹۵ء۔ جواد علی، عرب قبل الاسلام،
۱۴۔ پروفیسر نولدیکی، Historians History of the World، جلد ۸۔
۱۵۔ اس کا ذکر قرآن مجید، سورۃ سبا، آیات ۱۵، ۱۶ میں بھی آیا ہے۔
۱۶۔ ارض القرآن، جلد اول، ص ۲۵۴۔
۱۷۔ المصری، احمد امین، فجر الاسلام، ص ۱۷، الجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۶۵ء۔
۱۸۔ گستاولیبان، تمدن عرب، ص ۱۹۶۔
۱۹۔ تاریخ ارض القرآن، جلد ۲، ص ۳۸۳۔

۲۰۔ دورِ عمر فارق میں شام کی فتح کے دوران جبلہ مسلمان ہوگیا، بعد میں مسلمانوں کے جذبۂ مساوات کی تاب نہ لاتے ہوئے مدینہ سے بھاگ کر قیصر کے پاس چلا گیا اور قسطنطنیہ میں ہی ۲۰ھ میں فوت ہوا۔

۲۱۔ ظہیر، نگار سجاد، عرب اور موالی، ص ۲۲، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۶ء۔

۲۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، جلد اول، ص ۱۹۵ تا ۱۹۸، نیز ص ۳۰۷، مصطفیٰ بابی حلبی، مصر، ۱۹۵۵ء، عز الدین ابی الحسن علی بن محمد، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، جلد اول، ص ۵۰۲ تا ۶۸۴، دار صادر بیروت، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء۔

۲۳۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، جلد اول، ص ۷۵، ۷۸، دار صادر، بیروت، ۱۹۸۵ء، تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۲۵۲، صدیقی، علی محسن، ''عرب جاہلیہ میں موالی''، مشمولہ ماہنامہ آگھی، جلد ۲، شمارہ ۵، بابت مئی ۱۹۹۰ء، ص ۶۷۔

۲۴۔ مرزوقی، شیخ ابی علی الاصفہانی، الازمنہ و الامکنہ، جلد ۲، ص ۱۶۱، ۱۶۷، حیدر آباد دکن، ۱۳۳۳ھ، صدیقی، علی محسن، ''عرب جاہلیہ میں موالی''، ص ۶۹۔

۲۵۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب، جلد ۵، ص ۷۷، بولاق، مصر، ۱۳۰۷ھ۔

۲۶۔ جرجی زیدان، تاریخی تمدن الاسلامی، جلد ۴، ص ۱۹، دار الہلال، قاہرہ، ۱۹۴۷ء۔

۲۷۔ ابن خلدون، مقدمہ، ص ۱۰۸، دار صادر، بیروت۔

۲۸۔ امام بخاری، صحیح بخاری، مترجم امجد العلی، کراچی، جلد ۲، ص ۶۳۔

۲۹۔ ندوی، ص ۷۰۔

۳۰۔ نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی، جلد اول، حصہ اول، ص ۱۲۰-۱۲۱، طبع چہارم، اعظم گڑھ۔

۳۱۔ ندوی، ص ۷۱، (بحوالہ کتاب الاصنام)۔

۳۲۔ شبلی، ص ۱۱۹۔

۳۳۔ ندوی، ص ۷۱، (بحوالہ تفسیر طبری)۔

۳۴۔ امیر علی، روح الاسلام، ص ۶۵۔

۳۵۔ شبلی، ص ۱۲۷۔

۳۶۔ امیر علی، ص ۲۲۸۔

۳۷۔ سورۃ الانعام: ۱۴۰۔

۳۸۔ شبلی، ص ۱۲۵۔

۳۹۔ ندوی، ص ۷۳، (بحوالہ کتاب الاغانی)۔

نواں باب:

بعثتِ محمدی اور اسلامی تہذیب کا آغاز

اس ہمہ گیر تاریکی میں جس سراج منیر نے روشنیاں پھیلائیں وہ حضرت محمد ﷺ تھے۔ الٓـر كِتٰبٌ اَنزَلْنٰهُ اِلَيْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ. (ابراہیم:۱)

آپؐ نے قرآن کے حوالے سے دین اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسلام کوئی نیا دین نہیں تھا بلکہ اس کی ابتداء حضرت آدمؑ سے ہوئی تھی۔ مختلف انبیاء نے مختلف زمانوں میں اپنی تعلیمات کا پرچار کیا اور بالآخر اسے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں مکمل کیا گیا۔

''اسلام'' کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی سلامتی، عیوب و آفات سے پاک اور آفتوں سے بہت زیادہ محفوظ ہیں۔[1] اصطلاحاً اسلام سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے سامنے بلا چوں و چرا سر جھکا دیا جائے۔ اور غیر مشروط اطاعت کی جائے۔ اسلام کے قریب قریب ہم معنی لفظ ''صلح'' ہے۔ صلح کے معنی سلامتی، رضا مندی، دوستی اور مصالحت کے ہیں۔ صلح کے مخالف لفظ ''فساد'' ہے۔[2] فساد کے معنی خراب ہونے اور بگڑ جانے کے ہیں۔ یہ اسلام کی ضد ہے۔

اسلام جسے قرآن ''دین'' سے تعبیر کرتا ہے پہلے عقائد و ایمانیات کے ذریعہ انسانی فکر کی تطہیر کرتا ہے۔ پھر اسی مطہر فکر پر عبادات و معاملات کے ذریعہ صالح اعمال کی بنیاد رکھتا ہے

اور یوں ایک مکمل تہذیبی نظام نوع انسانی کو عطا کرتا ہے۔ یہ اسلامی تہذیب فی نفسہٖ چند ایسی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے جو کسی دوسری عالمی تہذیب میں نہیں ہوسکتیں۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیات:

ا۔ **آفاقیت:** اسلام چونکہ ایسا دین ہے جو پوری دنیا کے لئے ہے۔اس کا مخاطب انسان ہے جو دنیا کے کسی بھی علاقہ سے تعلق رکھتا ہو لہٰذا اس دین پر تعمیر ہونے والی تہذیب بھی مقامی نہیں آفاقی ہوگی۔ رومی یا ایرانی یا ہندوستانی یا چینی تہذیبیں، مقامی تہذیبیں تھیں اور یہودیت، عیسائیت یا بدھ تہذیب کو بھی آفاقیت کا دعویٰ نہیں جبکہ اسلامی تہذیب جو جغرافیائی حدوں سے بالاتر ہے اور اپنے میلان و رجحان کے اعتبار سے پوری انسانیت پر حاوی ہے۔ محمد ﷺ کوئی علاقائی پیغامبر نہیں تھے بلکہ رحمۃ للعالمین (تمام دنیا کے لئے رحمت تھے) اور اسلام کا پیغام تمام دنیا کے لئے ہے۔اس سلسلے میں چند قرآنی ارشادات ملاحظہ ہوں۔

☆ اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْن. (الانعام:۹۰)

[نہیں ہے مگر نصیحت تمام دنیا کے لئے۔]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

☆ تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا.

(الفرقان:۱)

[برکت والا ہے وہ (خدا) جس نے اپنے بندہ پر فیصلے والی کتاب اتاری تاکہ وہ تمام دنیا کو ہوشیار کرنے والا ہو۔]

☆ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا. (سبا:۲۸)

[اور ہم نے نہیں بھیجا تم کو (اے محمدؐ) لیکن تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر۔]

ان حوالوں سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوتی ہے کہ سارے مذاہب میں صرف

اسلام نے ہی اپنی آفاقیت اور اپنے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''مجھ سے پہلے تمام انبیاء صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اور میں تمام قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔''

یہی وجہ ہے کہ ہر دوسری تہذیب صرف ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم کے ناموروں پر فخر کرسکتی ہے لیکن اسلامی تہذیب ان تمام اقوام وقبائل کے سپوتوں پر فخر کرسکتی ہے، جنھوں نے مشترکہ طور پر اس تہذیب کو اپنایا ہو۔ سلمان فارسی، عمر بن خطاب، بلال حبشی، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، الکندی، الفراء، الفارابی، ابن رشد اور سینکڑوں دوسرے مشاہیر مختلف قوموں اور ملکوں سے تعلق رکھنے کے باوجود فرزندان اسلام ہی تھے جن کے ذریعے سے اسلامی تہذیب نے انسانیت کے سامنے فکر سلیم کے بہترین نتائج وثمرات پیش کیے۔

اسلامی تہذیب قومی یا نسلی تہذیب نہیں بلکہ صحیح معنوں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو اس کی فکر (ایمانیات) کو قبول کرے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی امت بنائی ہے، جس میں بلا امتیاز رنگ ونسل ہر انسان داخل ہوسکتا ہے۔

۲۔ **الہامیت:** اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت یہ کہ یہ الہامی تعلیمات پر مبنی ہے اس نظام کی فکری بنیادیں عقل انسانی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ ہدایات پر مشتمل ہیں۔

هُوَ الَّذِي ارسَلَ رسُولَه بالهدىٰ و دين الحقّ ليُظهره علىٰ الدِّين كُلِّه ولَو كَرِهَ المشركون. (الصّف:۹)

[وہی (پاک ذات) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دیگر ادیان پر غلبہ عطا کرے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔]

جب کہ دوسری تہذیبیں، بدھ مت، مانویت، زرتشتیت اور کمیونزم وغیرہ انسانی فکر کے نتائج ہیں بلاشبہ ان میں سے بعض انسانی مسائل کے حل کرنے کی بڑی مخلصانہ کوشش ہیں،

لیکن انسان بہرحال انسان ہے، مخلوق خالق کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا لہٰذا انسانی ذہن کی پرواز بھی ایک حد سے آگے نہیں جاسکتی۔ انسانی ذہن کی اسی کمزوری کی وجہ سے یہ سارے نظام ہائے حیات جزوی اور وقتی ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام خالق کی طرف سے آیا ہوا نظام حیات ہے جس میں کسی کے لئے اپنی طرف سے کسی بات کے بڑھانے یا گھٹانے کی گنجائش نہیں۔ اس کے تمام بنیادی اصول غیر متبدل ہیں۔

یوں تو یہودیت اور عیسائیت بھی الہامی مذاہب تھے لیکن اب ان کی تعلیمات محفوظ نہیں کچھ اس وجہ سے کہ وہ مذاہب اپنے زمانوں میں ضبط تحریر میں نہیں لائے جاسکے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ بعد میں ان مذاہب کے پیروکاروں نے ان میں بے شمار تبدیلیاں کیں اور اپنی من مانی باتیں داخل کردیں۔ ان میں سے کوئی پیغام بھی اپنی اصلی اور خالص شکل میں نہیں ہے۔ چنانچہ اسلام ہی موجودہ دنیا کا واحد الہامی مذہب رہ جاتا ہے اور یہ الہامیت اسے تمام دوسرے نظام ہائے حیات سے مختلف اور ممتاز کرتی ہے۔

۳۔ **جامعیت:** اسلام زندگی کا ایک نہایت منظم ضابطہ ہے۔ حیات انسانی کا کوئی گوشہ اسلام کی ہدایات سے محروم نہیں رہا ہے۔ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی، دینی ہو یا دنیاوی، قومی ہو یا بین الاقوامی، معاشی ہو یا معاشرتی، عدالتی ہو یا سیاسی ہر شعبہ ہائے حیات کے لئے اسلام مکمل اور جامع تعلیمات کا حامل ہے۔

جب کہ بعض مفکرین نے جو نظریات پیش کیے وہ پوری زندگی کا احاطہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ مثلاً بدھ اور جین مت کی تعلیمات میں خدا کی ذات، صفات، حقوق اللہ اور اس کی اطاعت و وفاکیشی کا سرے سے کوئی باب ہی نہیں۔ اسی طرح دنیاوی معاملات میں بھی یہ مذاہب تشنہ تعلیمات فراہم کرتے ہیں۔ بدھ نے اپنے تمام اہل وعیال، حکومت و خاندان کو چھوڑ کر ایسا سنیاس لیا کہ پھر کبھی اپنی پیاری بیوی اور اکلوتے بیٹے سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ ان حالات میں بدھ کی سیرت ان انسانوں کی کیا راہنمائی کرسکتی ہے جو اس دنیا میں رہتے بستے ہیں'' کیا بدھ کی زندگی میں ایسی جامعیت ہے جو تارک الدنیا بھکشوؤں اور کاروباری انسانوں دونوں کے لئے

قابل تقلید ہو؟'' اسی لئے اس کی زندگی کبھی بھی اس کے ماننے والے کاروباریوں کے لئے قابل تقلید نہ بنی ورنہ چین، جاپان، سیام وانام تبت و برما کی تمام سلطنتیں، صنعتیں اور دیگر کاروباری مشاغل فوراً بند ہو جاتے اور بجائے آباد شہروں کے صرف سنسان جنگلوں کا وجود رہ جاتا۔[۳]

اسی طرح سے اب تک آنے والے انبیاء و پیغمبروں کی سیرتیں قابل تقلید ہونے کے باوجود نہ تو اس قدر جامع تھیں کہ زندگی کے تمام معاملات کا احاطہ کرتیں اور نہ ہی بدقسمتی سے وہ محفوظ رہ سکیں۔ حضرت موسیٰ کی زندگی کا ایک ہی پہلو نہایت واضح ہے اور وہ ہے جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لئے دنیاوی حقوق، واجبات، فرائض اور ذمہ داری کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے شادی نہیں کی تھی لہٰذا معاملات کا یہ اہم ترین باب ان کی سیرت میں موجود نہیں پھر انہوں نے محکومی کی زندگی بسر کی اس لئے ان کی سیرت تمام حاکمانہ فرائض کی مثالوں سے خالی ہے۔

اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور اسلام کی ایک ایک تعلیم نہ صرف محفوظ ہے بلکہ بجا طور پر اپنی جامعیت کی دعویدار ہے۔ پھر اسلام ہر دو معاملہ میں عادلانہ توازن بھی قائم کرتا ہے۔ انفرادیت و اجتماعیت اور دین و دنیا میں توازن قائم کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ''میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ عائلی زندگی بھی گذارتا ہوں، پس اللہ سے ڈرو، تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔ ہر حق اس کے حقدار کو ادا کرو۔''

۴۔ **کاملیت:** اسلام ایک ایسا مکمل دین ہے جس کا اپنا نظام فکر، اپنا نظام عمل اور نظام نفاذ ہے۔ اسلام پہلے ایمانیات کے ذریعہ انسانی فکر کی اصلاح کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کا واضح تصور دے کر اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان ایمانیات کا دو طرح سے اظہار کرے ایک عبادات (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد) کے ذریعہ تو دوسرا تعلقات و معاملات میں اسلام کے متعین کردہ اصولوں پر پابندی کے ذریعہ۔ نیز سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام اپنے اسی نظام فکر و عمل میں سے قوت نافذہ بھی مہیا کرتا ہے اور وہ ہے خوف خدا اور آخرت کا تصور۔

ایک ایسی جگہ جہاں کسی پولیس یا فوج یا محتسب کا ڈر نہ ہو۔ایک مومن برائی سے کیوں بچتا ہے؟ کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ خدا دیکھ رہا ہے اور قیامت میں اس عمل کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ جس تہذیب کی بنیاد ایسے تصورات پر ہو اسے بجا طور پر اپنی کاملیت کا دعویٰ بھی ہوگا۔

❧ ♦ ❧

حواشی وحوالہ جات:

1. المنجد، ص ۴۸۸۔
2. ایضاً، ص ۳[illegible]
3. ندوی، سیّد سلیمان، خطبات مدراس، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۵۰۔

❧ ♦ ❧

دسواں باب:

اسلامی تہذیب کی فکری بنیادیں

(عقائد)

اسلامی تہذیب کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے وہ اسلامی عقائد ہیں۔ [1] انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ انہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں اور یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے بالفاظ دیگر عقیدہ، عمل کی اساس ہے۔

عقیدہ پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے۔ ایمان کے لغوی معنی محفوظ کرنے یا کسی شخص پر اعتماد رکھنے کے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی طمانیۃ النفس (اطمینان قلب) اور زوال الخوف (خوف کا نہ ہونا) کے ہیں۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو ''امون'' کہتے ہیں۔

اسلامی اصطلاح میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسان دل کی تصدیق سے حق کا اقرار اور اس کی متابعت کرے۔ چنانچہ جو شخص اسلام کے بنیادی اصولوں کی تصدیق کرتا ہے وہ مومن ہے اور جو اس کی تکذیب کرتا ہے وہ کافر ہے۔

ایمان اور اسلام بالعموم مترادف الفاظ ہیں لیکن جہاں الگ معنوں میں استعمال ہوئے ہیں وہاں ''اسلام'' ظاہری اقرار و عمل اور ''ایمان'' قلبی تصدیق کے معنی میں استعمال ہوتا

ہے۔اس اعتبار سے اسلام، ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔اس سلسلہ میں امام غزالیؒ [۲] اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام اور ایمان مترادف (ہم معنی) بھی ہیں، مختلف المعنی بھی اور بر سبیل تداخل بھی ہیں (یعنی ایک کے مفہوم کا ایک حصہ، دوسرے میں موجود ہے)۔

یہ اسلامی عقائد اسلامی تہذیب کے تشکیلی عناصر ہیں۔ یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح ضروری ہے کیونکہ انسان کے خیالات اور ارادوں پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔صالح عقائد موجب بنتے ہیں صالح اعمال کے اور صالح اعمال ایک صالح فرد کو جنم دیتے ہیں اور پھر صالح افراد کی وجہ سے ایک پاکیزہ معاشرہ اور ایک پاکیزہ تہذیب وجود میں آتی ہے۔ بالفاظ دیگر جب اشتراک فکر کا نتیجہ اشتراک عمل کی صورت میں ظاہر ہوگا تو وہ انسانوں کو ایک قوم بنا دے گا۔اس اعتبار سے اسلامی تہذیب کی تاسیس و تشکیل میں ان عقائد کا بڑا دخل ہے جو قومی سیرت کو بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اسلام کے یہ بنیادی عقائد اتنی تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ مجموعی طور پر قرآن پانچ عقائد (عقائد خمسہ) پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ پر ایمان

۲۔ ملائکہ پر ایمان

۳۔ الہامی کتب پر ایمان

۴۔ انبیاء علیہم السلام پر ایمان

۵۔ یوم آخر یعنی قیامت پر ایمان [۳]

یہ پانچوں ایمان مل کر ایک ناقابل تجزیہ کل بناتے ہیں یعنی ان کے درمیان ایسا ربط ہے کہ ان میں سے کسی ایک جز کا بھی اگر انکار کیا جائے تو اس سے کل کا انکار لازم آتا ہے۔ اسلام جس قسم کی تہذیب قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لئے انہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے نیز اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو یا جس کو ماننے

سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی اور اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی لیکن ہمارے اہل علم و حکمت نے اب تک جتنے مجردات و مفارقات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ توانائی (Energy)، حیات (Life)، جذب و کشش اور نشو و ارتقاء اور ایسے ہی دوسرے امور کی تصدیق ہم نے اس بناء پر نہیں کی ہے کہ ہم ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں بلکہ اس بنا پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجیہہ و تعلیل کے لئے ہمارے نزدیک ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے اور ظواہر اشیاء کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کیے ہیں وہ ان امور کے موجود ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اسلام جن مجردات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لئے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے۔ بلکہ اس کے لئے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے وہ خلاف عقل نہیں ہے۔[۴]

الغرض خدا کی حقیقت، خواہ انسانی سمجھ سے بالاتر ہو مگر اس کا وجود تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا معمہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ملائکہ کے وجود کی کیفیت انسان متعین نہیں کر سکتے مگر ان کے نفس وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کی ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے اگر چہ وہ ان کو ان ناموں سے یاد نہیں کرتے جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔[۵]

یہی معاملہ وحی اور رسالت کا ہے کہ اس ضمن میں کوئی سائنٹفک ثبوت تو پیش نہیں کیا جا سکتا مگر جن لوگوں کو خدا کا رسول کہا گیا ہے ان کی سیرتوں پر غور کرنے سے ایک شخص بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نوع انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے جیسے پائیدار، مفید اور وسیع اثرات کسی کتاب اور کسی راہنما نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان کے پیغام اور شخصیت میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ دنیاوی قائدین کو۔

قیامت کا آنا نہ صرف عقلی قیاسات کی رو سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔ انسان کا اپنے خدا کے آگے جوابدہ ہونا اور اپنے اعمال کے لئے مستوجب جزا و سزا ہونا کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا مگر عقل سلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے بارے میں جتنے نظریات قائم کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ، بہتر، نتیجہ خیز اور اقرب الی القیاس نظریہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔[۶]

الغرض اسلامی عقائد میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقاء کی کسی منزل پر پہنچ کر انسان ان کو رد کر دینے پر مجبور ہو بلکہ جیسے جیسے علم ترقی کر رہا ہے عقل اس کی اغلبیت کا حکم لگاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اپنے مخاطب انسان کو غور و فکر کرنے اور عقل استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بار بار انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر اور تدبر کرے تاکہ خدا اور اس کے اصولوں کی حقانیت کو جان سکے۔

بظاہر کبھی کبھی عقل و مذہب آپس میں متضاد نظر آتے ہیں ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ عقل انسانی نے بھی اپنا سفر تحقیق مکمل نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس کے نتائج و ثمرات نے قطعیت کا درجہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ عقل انسانی ابھی اس لائق نہیں ہو پائی کہ الٰہیات کی گتھیوں کو مکمل طور پر سلجھا سکے اور حیات و کائنات کے تمام تر اسرار و رموز کو قطعی اور واضح انداز میں بیان کر سکے جب کہ مذہب نے اپنا سفر مکمل کر لیا ہے اور ان تمام حقائق کو کھول کر واضح کر دیا ہے جو زندگی کی راہنمائی کے لئے ضروری ہیں۔

المختصر اسلامی عقائد پر ایمان، اسلامی تہذیب کی بنیادیں ہیں۔ انسان سے اسلام کا *اولین و بنیادی مطالبہ یہی ہے کہ وہ ان اصولوں (عقائد) پر ایمان لائے۔ ایمان کا مطالبہ اس* قدر شدت سے اسی لئے کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام تہذیب اسی پر مبنی ہے اور ایک مستحکم اور صالح معاشرہ کی بنیاد کا دار و مدار انہی عقائد پر ایمان میں پنہاں ہے۔

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۴۰۵، لاہور، ۱۹۸۱ء، طبع دوئم۔

۲۔ امام غزالی، احیاء علوم۔

۳۔ اگرچہ اس حدیث میں ایک چھٹی چیز کا بھی ذکر آتا ہے یعنی ''والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ'' لیکن درحقیقت یہ ایمان باللہ ہی کا ایک جزو ہے اور قرآن نیں اسی حیثیت سے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں اس کے علیحدہ ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایمان باللہ کا یہ جزا اہم بھی ہے اور خفی بھی۔ اس لئے ذہن میں اس کو متحضر رکھنے کی خاطر علیحدہ ذکر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ (بحوالہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول اور مبادی، ص ۱۲۲)

۴۔ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول اور مبادی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۵۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

گیارھواں باب:

توحید

توحید کے معنی ہیں اللہ کو ایک ماننا۔توحید کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ مانا جائے یعنی یہ اعتقاد رکھا جائے کہ الٰہ ہونے میں اور الوہیت کی خصوصیات میں اس کا کوئی ساجھی یا شریک نہیں ہے۔کمال توحید یہ ہے کہ نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوجائے جس سے وہ بے اختیار اللہ کو اپنی ذات،صفات اور افعال میں یکتا جان لے۔

عقیدہ توحید جملہ اسلامی عقائد کی بنیاد اور رسول اللہ ﷺ کے نصاب درس کا پہلا سبق ہے۔اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے باقی جتنے اعتقادات وایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کی نازل کردہ ہیں۔رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔یوم آخرت پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔حقوق وفرائض پر عملدرآمد اور اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ من جانب اللہ ہیں غرض اسلام میں ہر عقیدہ و ہر عمل کی بنیاد توحید پر ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے توحید کو تمام اقسام نیکی میں بمنزلہ دل کے قرار دیا ہے۔اگر وہ درست ہے تو سب نیکیاں درست ہیں اور اگر وہ فاسد ہے تو سب نیکیاں فاسد ہیں۔

دنیا کے تقریباً سارے ہی مذاہب میں خدا یا خداؤں کا تصور پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے اپنی تعلیمات میں وجود ذات باری کا مسئلہ نہیں چھیڑا کیونکہ یہ دنیا کے لئے پہلے ہی قابل قبول تھا۔ انسان فطرتاً ایک قادر مطلق اور خالق کائنات ہستی کا معترف ہے اور جماعت انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ اور زمانہ کا کوئی عہد بھی اس تخیل سے خالی نہیں ملتا البتہ اسلام کے مختصات میں جو چیز ہے وہ توحید ہے کیونکہ دوسرے مذاہب میں یا تو سرے سے توحید تھی ہی نہیں اور اگر تھی تو کامل نہیں تھی۔ اسی بناء پر قرآن نے بار بار کہا کہ کفار کو بھی خدا سے انکار نہیں کفار کو جو وحشت ہے وہ توحید سے ہے۔

"جب اکیلا خدا پکارا جاتا ہے تو تم منکر ہو جاتے ہو اور اگر کوئی شریک کر لیا جائے تو تم مان لیتے ہو اور جب خدا کا تنہا ذکر کیا جاتا ہے تو منکرین قیامت کے دل بدک جاتے ہیں۔" (الزمر: ۴۵)

توحید کامل کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں کوئی شریک نہیں اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے نیز اس کے اختیارات اور اس کے حقوق میں بھی کوئی شریک یا ساجھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب کی وجہ سے خدا کا وجود کا متعین ہوتا ہے بالکل وہی اسباب اس کے ایک ہونے کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔ نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو یا بظاہر وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے لیکن سب مل کر ایک کل بناتے ہیں اور اس کل کا ہر ہر پرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو۔

اسی بات کو امین احسن اصلاحی اس طرح کہتے ہیں کہ اس کائنات کے مختلف اجزاء میں کمال درجہ کی موافقت اور باہمی سازگاری ہے اور اس کائنات کی ہر چیز اپنی ہستی کی بقاء اور اپنے وجود کی نشو و نما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ حیات اس کے لئے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آ کر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں، زمین اس

کے لئے گہوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرمی اور شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہو لے تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ یہی حال دنیا کی ہر ہر چیز کا ہے۔

اب اگر ایک سے زائد خدا موجود ہوں کوئی بارش برسائے، کوئی پھل پھول لائے، زندگی عطا کرنے والا کوئی ہو اور موت دینے والا کوئی تو کائنات کی موافقت اور باہمی سازگاری بالکل باقی نہ رہ سکے گی اور بدنظمی و افراتفری پھیل جائے گی اور چونکہ یہ کارخانہ قدرت بغیر کسی ہنگامہ اور فساد کے نہایت ترتیب و تنظیم سے چل رہا ہے۔ عالمی نظام میں ایک یکسانیت اور ایک وحدت ہے۔ نظام شمسی، انسان، حیوان، ہوا، پانی، بارش، موسموں کا بدلنا، نباتات کا اگنا یہ سب ایک مقررہ نظام اور متعین اصول کے تحت ہیں جن میں سرمو فرق نہیں ہوتا۔ ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے لہٰذا اگر ایک کے علاوہ چند اور خدا بھی ہوتے تو نظام کائنات ان کی آپس کی رسہ کشی کی نذر ہو جاتا اور یہ ترتیب و نظم لمحہ بھر بھی قائم نہ رہ سکتا۔[3]

الغرض کائنات کی ترتیب و تنظیم، اس کا نظم و ضبط، اور کائنات کے حسن و جمال کے توازن و اعتدال کو دیکھ کر صرف اس بات کا ہی احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالق بہترین ہے۔ یکسر خیر و برکت ہے اس نے جو چیز بنائی ہے وہ کمال قدرت، کمال صنعت اور کمال خیر و برکت کا کامل نمونہ ہے۔

فتبرک اللہ احسن الخالقین○ (مومنون:۱۴)

[بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔]

توحید کی ضد شرک ہے۔ شرک کے معنی ہیں ساجھی بنانا۔ اصطلاحاً اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی خدائی میں کسی غیر کو شریک کرنا اور خدا کے ساتھ ساتھ کسی اور کی بھی ایسی تعظیم و تکریم کرنا جس کی حق دار صرف خدا کی ذات ہے۔ یا خدا کی صفات کو خدا کی ذات کے علاوہ کسی اور سے منسوب کر دینا۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی ذات،[4] صفات، اختیارات اور حقوق میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک ہے۔

ذات میں شرک یہ ہے کہ جوہر الوہیت میں کسی کو حصہ دار قرار دیا جائے مثلاً نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث، مجوسیوں کی ثنویت اور مشرکین عرب کا علانیہ دیوی دیوتاؤں کو خدا ماننا یہ سب شرک فی الذات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ وہ صفات جو خدا کے لئے مخصوص ہیں۔ کسی دوسرے کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ ان اوصاف سے متصف ہے۔ مثلاً کسی کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ غیب کی باتیں جانتا ہے۔ قرآن نے اس اعتقاد کو یہ کہہ کر مٹایا ہے کہ:

و عنده مفاتح الغيب لا يعلمها الا هو . (الانعام:۵۹)

[اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔]

اسی طرح کسی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ تمام نقائص اور تمام کمزوریوں سے منزہ اور بالکل بے خطا ہے، شرک فی الصفات ہی کی قسم ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں ان کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع وضرر پہنچانا، اس میں آیات قرآنی کے سوا ہر قسم کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے، ٹوٹکے وغیرہ شامل ہیں۔

''بے شک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈلوانے والے تعویذ شرک ہیں۔'' (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

حاجت روائی و دست گیری کرنا، حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا نیز انسانی زندگی کے لئے قانون وشرع تجویز کرنا، یہ سب اللہ کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔ اسلام واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ خدا کے آگے کسی کی نہیں چل سکتی۔ حضرت ابراہیم نے اپنے والد سے کہا تھا ''میں آپ کے لئے اللہ سے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔''

اسی طرح جب قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی

وانذر عشیرتک الاقربین

تو آپؐ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا ''اے اہل قریش! اے اولاد عبدالمطلب، اے عباس، اے صفیہ، اے فاطمہ میرے مال میں سے جو مانگو دے سکتا ہوں لیکن خدا کے یہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔''[۵]

اسی طرح بعض لوگ انبیاء یا علماء کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے۔ یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں۔ عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقبل سمجھتے ہیں، یہ بھی شرک ہے۔ شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تمیز، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پیغمبر کا اس میں کوئی دخل نہیں وہ صرف مبلغ، پیغام رساں اور شارح ہے۔[۶]

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کے لئے مانا جائے۔ مثلاً سجدہ تعظیمی، غیر اللہ کی قسمیں کھانا، غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز اور قربانی دینا، غرض یہ اللہ کا حق ہے[۷] کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کی ہدایت کو صحیح و غلط کا معیار مانا جائے اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد، ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لئے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ خدائی حقوق میں سے جو حق بھی دوسروں کو دیا جائے گا وہ اللہ کا شریک ٹھہرے گا خواہ اس کو خدائی ناموں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

قرآن مجید نے بڑی سختی سے شرک کی مذمت کی ہے اور اس کو سب سے بڑا اور قبیح گناہ قرار دے کر مشرکین کو سخت سزاؤں کی بشارت دی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ قرآن نے توحید کو اسلام کی بنیاد قرار دیا ہے جبکہ شرک توحید کی ضد کامل ہے اس لئے اس کی مذمت بھی زیادہ کی گئی ہے کیونکہ شرک کے بعد اسلام رہتا ہی نہیں اور دین کی جملہ مصلحتوں اور نیکیوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

توحید کے فوائد و اثرات:

توحید مجرد ایک علمی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت بھی ہے۔ انسان کی زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، توحید کے تصور سے انقلابی طور پر بدل کر رہ جاتی ہے۔ اس عقیدے کا سب سے بڑا اجتماعی فائدہ یہ ہے کہ یہ اپنے پیروکاروں میں زبردست وحدت و اخوت پیدا کرتا ہے۔ یہ انسانوں کو متحد کرنے والی طاقت ہے۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ توحید کے سوا کوئی دوسری چیز انسانوں کو جمع کرنے والی پائی گئی ہو۔ جب کہ اس کے برعکس شرک انسانیت کو بانٹتا اور انسانوں کو انسانوں سے جدا کرتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جو یہ شہادت دیتی ہو کہ تمام دنیا کے مشرکین کسی ایک یا چند مخصوص معبودوں پر کبھی جمع ہوئے ہوں۔ اس طرح شرک کبھی کسی دور میں بھی انسانیت کو جمع کرنے والی طاقت نہیں رہا بلکہ ایک تفرقہ پرداز طاقت رہا ہے۔ ۸

عقیدہ توحید کے انفرادی زندگی پر مرتب ہونے والے فوائد بھی بہت ہیں۔

ایمان باللہ کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے زاویہ نظر کو اتنا وسیع کر دیتا ہے جتنی خدا کی غیر محدود سلطنت وسیع ہے۔ انسان جب تک دنیا کو اپنے نفس کے تعلق سے دیکھتا ہے اس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے جس کے اندر اس کی اپنی قوت اس کا اپنا علم اور اس کے اپنے مطالبات محدود ہیں۔ چنانچہ اسی دائرے میں اس کی دوستی، دشمنی، محبت اور نفرت محدود رہتی ہے جس کے لئے بجز اس کے اپنے نفس کے اور کوئی معیار نہیں ہوتا، لیکن خدا پر ایمان لانے کے بعد وہ کائنات کو اپنے نفس کے نہیں بلکہ مالک کائنات کے حوالے سے دیکھتا ہے تو اسے خدا کے سوا کوئی قوت والا، کوئی ضار یا نافع نظر نہیں آتا۔ اب اس کی دوستی اور دشمنی، محبت اور نفرت اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کو مانتا ہوں وہ صرف میرا یا میرے خاندان یا میری قوم کا ہی خالق و مالک نہیں بلکہ زمین و آسمان کا خالق اور تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ عقیدہ اس کو وسعت نظر عطا کر کے "آفاقی" و "کائناتی" بنا دیتا ہے۔ ۹

توحید کا یہ عقیدہ انسان کو ذلت و پستی سے اٹھا کر عزت نفس کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس نے خدا کو نہ پہچانا تھا، دنیا کی ہر طاقتور چیز، ہر نفع یا نقصان پہنچانے والی چیز، ہر شاندار اور بزرگ چیز کے سامنے جھکتا تھا، اس سے خوف کھاتا تھا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا، لیکن جب اس نے خدا کی معرفت حاصل کی تو معلوم ہوا کہ جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ تو خود محتاج ہیں، جن کی وہ بندگی کر رہا تھا وہ خود اس کی طرح بندے ہیں، جن سے وہ امیدیں وابستہ کر رہا تھا وہ اس کی مدد تو درکنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے۔ ان دنیاوی طاقتوں کے بجائے حقیقی طاقت کا مالک خدا ہے۔ وہی حکمران اور صاحب امر ہے۔ مدد اسی کی طرف سے ملتی ہے۔ رزق دینے والا وہی ہے، مارنے اور جلانے والا وہی ہے اور نفع و ضرر پہنچانے کی اصل طاقت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان میں کمال درجہ کی خودداری اور عزت نفس پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ وہ کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ خوف کھاتا ہے۔ جب کہ مشرک اور کافر کا حال اس کے برعکس ہوگا یعنی وہ مخلوق کے آگے جھکنے والا، ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھ کر ان سے خوف کھانے والا اور امیدیں باندھنے والا ہوگا، اور یوں اپنے شرف اور اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔[10]

عزت نفس کے ساتھ ساتھ جو خوبی لازماً ایمان باللہ سے پیدا ہوتی ہے وہ انکساری و تخشع، عاجزی و فروتنی ہے کیونکہ توحید کا قائل جانتا ہے کہ وہ خدا کی طاقت کے آگے بالکل بے بس ہے اور خدا کی فرمانروائی سے نکلنا انسان تو انسان کسی بھی ہستی یا مخلوق کے بس میں نہیں، تمام عالم اس بے نیاز خدا کا محتاج ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ عزت، دولت، اقتدار، جاہ و حشمت، مال و اولاد غرض جو نعمت بھی ہے خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھیننے پر بھی قادر ہے۔ اس عقیدہ کے بعد غرور و تکبر کہاں رہ سکتا ہے بلکہ انسان سراپا انکسار بن جاتا ہے۔[11]

و عِباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارضِ ھوناً وَّ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سَلٰما. (الفرقان: ٦٣)

[خدائے رحمٰن کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور
جب جہلا ان سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔]

اس کے مقابلے میں کسی ملحد کو جب کوئی دنیاوی کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس کمال کو محض اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

عقیدۂ توحید کا ایک اور مثبت اثر رجائیت اور اطمینان قلب ہے۔ ایمان باللہ مومن میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی حال میں مایوسی اور شکستہ دلی سے مغلوب نہیں ہوتی۔ مایوسی کو کفر قرار دے کر مومن کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پر امید رہنے کی تلقین کی گئی ہے لہٰذا چاہے وہ دنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے۔ سارے اسباب کا رشتہ ٹوٹ جائے، وسائل و ذرائع ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیں مگر ایک خدا کا سہارا اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا کیونکہ خدا کہتا ہے۔

و اذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا
دعان (البقرہ:۱۸۶)

[اور اے میرے نبی میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا
دو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی
پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔]

مومن بڑے سے بڑے ارتکاب جرم و گناہ کے بعد بھی خدا سے مایوس نہیں ہوتا کیونکہ خدا کا اس سے رحمت و مغفرت کا وعدہ ہے۔

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ
ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً (الزمر:۵۳)

[(اے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی
ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔]

اس کے برخلاف کفار و مشرکین کے دل چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کا بھروسہ محدود

طاقتوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے مشکلات میں بہت جلد مایوسی ان کو گھیر لیتی ہے اور اکثر ایسی حالت میں وہ خودکشی تک کر گذرتے ہیں۔ مسلمان اس حیثیت سے تاریخ میں ممتاز ہیں کہ ان میں خودکشی کی وارداتیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ یہ خدا پر ایمان ہی کا نتیجہ ہے۔

اسی رجائیت کی اگلی منزل صبر و استقامت اور توکل علی اللہ ہے۔ یہ قوت انسان کو بجز ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس بھروسہ ان مادی اور وہمی اسباب و وسائل پر ہوتا ہے جو خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے بل پر جینے والا گویا تارِ عنکبوت کا سہارا لیتا ہے مگر جس نے خدا پر بھروسہ کیا اس نے سب سے مضبوط اور ناقابل شکست سہارا حاصل کیا۔

انبیاء علیہم السلام نے جس فوق البشری قوت سے دنیا کے ہولناک مصائب کا سامنا کیا وہ یہی صبر و توکل کی قوت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے ملک کے جبار فرمانروا سے مناظرہ کرتے ہیں، بے خوف آگ میں کود پڑتے ہیں۔ حضرت ہودؑ کو دیکھئے کس طرح عاد کی زبردست قوت کو چیلنج دیتے ہیں۔

فکیدونی جمیعاً ثُمّ لا تنظرون. انی توکلت علی اللہ ربی و ربکم مامن دابۃٍ الّا ھُو اخذٌ بنا صِیَتِھا. (ہود: ۵۵-۵۶)

[تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ میں تو اس خدا پر بھروسہ کر چکا ہوں جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔]

حضرت موسیٰؑ کو دیکھئے، خدا کے بھروسے پر فرعون کی زبردست طاقت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ قتل کی دھمکی دیتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ میں ہر متکبر کے مقابلے میں اس کی پناہ لے چکا ہوں جو میرا اور تم سب کا رب ہے۔ سب سے آخر میں نبی آخرالزماں ﷺ کو دیکھئے ہجرت کے موقع پر ایک غار میں تشریف رکھتے ہیں صرف ایک رفیق ساتھ ہے۔ خون کے پیاسے کفار سر پر آ پہنچتے ہیں مگر آپ اس وقت بھی کمال استقامت سے فرماتے ہیں:

لا تحزن ان اللہ معنا (التوبہ: ۴۰)

[ہرگز نہ گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔] ۱۴

اسی سے ملتی جلتی ایک اور صفت جرأت و بہادری اور شجاعت و شہامت کی ہے جو ایمان باللہ کا نتیجہ ہے۔ انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی جان، اپنے اہل و عیال اور اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے اس غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے کی قوت دراصل ان اشیاء میں ہے جو محض آلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں امراض کا علاج کرتا ہے۔ پہلے مرض کا علاج اس تعلیم کے ذریعہ کہ خدا اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ مال و اولاد سب سے بڑھ کر اس سے محبت کی جائے۔ عقیدہ توحید اپنے ماننے والے کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ مال و اولاد سب دنیا کی زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی ضائع ہونا یقینی ہے۔ رہا خوف تو اس کے لئے مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی حقیقی قوت انسان یا حیوان توپ یا تلوار میں نہیں بلکہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تمام دنیا کی قوتیں مل کر بھی اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کا اذن نہ ہو تو اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا اسی طرح اگر اس کی موت کا وقت آ ہی گیا ہے تو تمام تر دنیاوی طاقتیں مل کر بھی اس کو ٹال نہیں سکتیں۔

عقیدہ توحید سے ایک اور خوبی جو مومنین میں پیدا ہوتی ہے وہ قناعت و استغناء ہے۔ مومن بلا وجہ دوسروں سے دنیاوی معاملات میں مقابلہ یا مسابقت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ باعزت طریقے سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرکین و کفار اپنی کامیابی اور ناکامی کو اپنی کوششوں اور دنیاوی طاقتوں کی مخالفت یا مدد پر موقوف سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان پر حرص و ہوس کا غلبہ رہتا ہے، کامیابی حاصل کرنے کے لئے رشوت، خوشامد، سازش، جیسے بدترین ذرائع اختیار کرنے میں انہیں باک نہیں ہوتا۔

قناعت کا مطلب بے عملی نہیں۔ اسلام اپنے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ محنت اور جدوجہد کی تلقین کرتا ہے۔ اور جتا دیتا ہے کہ ہر شخص کے لئے اتنا ہی ہے جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح قیامت میں بخشش اور شفاعت کا معاملہ ہے بعض مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے

کاموں میں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بھی شریک ہیں اور ہم ان کی خوشامد کر کے سفارش کرالیں گے۔عیسائی سمجھتے ہیں کہ خدا کے بیٹے نے کفارہ بن کر ہمارے لئے نجات کا حق محفوظ کر دیا ہے۔ایسی ہی اور بہت سی غلط توقعات ہیں جو ایک طرف تو انسان کو گناہ کے چکر میں پھنسائے رکھتی ہیں تو دوسری طرف انہیں بے عمل بنا دیتی ہیں۔

تاسیس تہذیب میں عقیدہ توحید کا حصہ:

عقیدہ توحید سے یہ سارے جملہ اوصاف مسلمانوں میں پیدا ہوجاتے ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا۔اس سے افراد میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے۔نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندی قانون کی حس پیدا ہوتی ہے۔ اطاعت امر اور ضبط ونظم کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے اندر ہی اندر سدھر کر ایک صالح اور منظم سوسائٹی بنانے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ یہ دراصل توحید کا معجزہ ہے کہ وہ اپنے پیروکار کے اعمال ہی نہیں سدھارتا بلکہ اس کی روح میں انقلابی مثبت تبدیلیاں لاتا ہے۔دنیا کی کسی حاکمانہ قوت، یا تعلیم وتربیت، یا وعظ وتلقین سے اصلاح اخلاق اور تنظیم اعمال کا کام اتنے وسیع پیمانے اور اتنی گہری بنیادوں پر انجام نہیں پاسکتا۔دنیوی قوتوں کی رسائی صرف جسم تک ہوتی ہے اور وہ بھی ہر وقت اور ہر جگہ نہیں لیکن ایمان باللہ صرف فکر وعمل کو درست کرنے والی قوت ہی نہیں بلکہ اس پر عمل درآمد کرانے والی قوت بھی ہے، کیونکہ اللہ پر ایمان لانے والا جانتا ہے کہ وہ علیم وخبیر ہے اور دنیا میں خفیہ اور علانیہ جو کچھ بھی ہورہا ہے خدا کو اس کا علم ہے۔

اَوَلَا يَعلمون إن الله يعلمُ ما يُسِرُّون و مايُعْلِنُون (البقرہ:۷۷)

[کیا وہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ خفیہ اور علانیہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ کو اس کا علم ہے۔]

یوں توحید اسلام کے پورے قانون کے لئے ایک زبردست قوت نافذہ ہے۔[۱۳]

اسلام نے حرام وحلال کے جو حدود بھی مقرر کیے ہیں، اخلاق، معاشرت اور معاملات کے متعلق جو احکام بھی دیئے ہیں ان کے نفاذ کا اصلی انحصار نہ فوج اور پولیس پر ہے نہ وعظ و تلقین پر بلکہ اس کا اصل انحصار ایمان باللہ پر ہے۔جس کی وجہ سے ایک مومن اس وقت بھی کسی گناہ سے باز رہتا ہے جب اسے پولیس یا محتسب کا ڈر نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اس دنیا میں اگر وہ پولیس اور محتسب سے بچ بھی گیا تو قیامت کے دن خدا کی سخت پکڑ سے بچانے والا اسے کوئی نہیں ہوگا۔

اس طرح ایمان باللہ نہ صرف پاکیزہ اسلامی تہذیب کی تاسیس میں مدد کرتا ہے بلکہ بہترین قوت نافذہ کے طور پر بھی عمل کر کے اسے مستحکم اور مضبوط و پائیدار بناتا ہے۔

ملائکہ پر ایمان:

ملائکہ یا فرشتوں پر ایمان کا بیان توحید کے باب میں کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں پر ایمان کا عقیدہ دراصل توحید کا تتمہ اور اس کا ضمیمہ لازمہ ہے۔اس کا مقصد محض یہی نہیں ہے کہ فرشتوں کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے بلکہ مقصد اصلی یہ ہے کہ نظام وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے تاکہ ایمان باللہ خالص توحید پر قائم ہو۔

''ملک'' کے لغوی معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں۔اس سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔[۴۲]

ملائکہ کا ایک اجمالی تصور تمام قوموں اور مذہبوں میں کسی نہ کسی طرح موجود رہا ہے۔ کسی کے نزدیک وہ نوامیس فطرت اور قدرت کی وہ طاقتیں ہیں جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو چلا رہی ہیں۔کسی کے خیال میں وہ دیوتا ہیں جن میں سے ہر ایک کارگاہ عالم کا ایک ایک محکمہ کا صدر ہے مثلاً کوئی ہوا کا مالک، کوئی بارش کا، کوئی روشنی، حرارت اور آگ کا، کسی کے اعتقاد میں وہ خدا کے نائب اور مددگار ہیں۔کسی کے نزدیک وہ ارباب الانواع ہیں۔کسی کے

خیال میں وہ عقول ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ خدا کے تصورات ہیں اور کوئی ان کو خدا کی اولاد سمجھتا ہے۔ پھر کسی نے ان کا مادی وجسمانی وجود مانا ہے اور کسی نے ان کو مجردات اور مفارقات میں سے شمار کیا ہے الغرض ارباب مذاہب میں فرشتوں کے متعلق یہ اعتقاد عام رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی خدائی میں شریک ہیں اور اس لئے ان کے ہیکل یا بت بنا کر، یا ان کی تصویریں نقش کر کے ان کی عبادت کی گئی اور ان کو حاجت روا، فریاد رس اور شفیع قرار دیا گیا۔ عربوں میں فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھا جاتا تھا اور ان کی اسی حیثیت سے پوجا کی جاتی تھی۔

قرآن مجید نے ایک طرف خدا کے وجود، صفات اور افعال میں خالص اور کامل توحید قائم کی اور دوسری طرف ملائکہ کا صحیح تصور پیش کر کے شرک کا دروازہ بند کر دیا۔ قرآن مجید نظام وجود میں فرشتوں کی مندرجہ ذیل حیثیت متعین کرتا ہے۔

اولاً فرشتے وہ غیر مادی، ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثناء اور اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے وظیفہ سے غافل نہیں ہوتے اور ہردم اپنے رب کی تسبیح وتقدیس کرتے رہتے ہیں۔

وَلَہ مَن فی السّموت و الارض. و مَن عِندہٗ لا یستکبرونَ عن عبادتہ ولا یستحسِرون. یُسَبِّحُون اللَّیل و النَّھارَ لایَفترون (الانبیاء:۱۹-۲۰)

[اسی کے مملوک ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس (مقرب) ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے، تھکتے نہیں، شب و روز اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔]

اس تصور نے شرک کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رکھی کیونکہ جن پر خدائی کا گمان کیا جاسکتا تھا وہ سب عاجز و درماندہ ثابت ہوئے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ انسان مسجود ملائکہ ہے گویا وہ فرشتے جو نہایت برگزیدہ اور نیک ہستیاں ہیں انسان کے آگے وہ بھی سربسجود ہو چکے ہیں۔ اس طرح فرشتوں کی عبادت کرنا انسانوں کے لئے قطعی بے معنی ہو گیا اور اس طرح توحید کو خالص اور منزہ کیا گیا۔

ثانیاً: ملائکہ کی دوسری حیثیت جو قرآن مجید میں بتائی گئی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کے ذریعے اپنے پیغمبروں کے پاس اپنا کلام اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ چونکہ یہ فرشتے نہایت فرماں بردار اور نفسانی اغراض سے پاک ہیں اس لئے جو پیغام ان کے توسط سے بھیجا جاتا ہے اس میں وہ اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ تو کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ ان کی پیغام رسانی اور نگرانی میں کوئی شیطانی قوت ذرہ برابر بھی خلل نہیں ڈال سکتی۔

نَزَّلَهُ رُوحُ القدسِ مِن رَّبِّکَ بالحقِّ (النحل:۱۰۲)

[اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے ٹھیک نازل کیا ہے۔]

ثالثاً: فرشتوں کی جو تیسری حیثیت قرآن مجید میں متعین کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کے کارندے ہیں، اس طور سے ان کی حیثیت مدبرات امر کی ہے، یعنی وہ صرف ان امور کی تدبیر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کیے ہیں اس میں ان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے۔[۱۵]

ان فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی پر عذاب نازل کرتا ہے اور کسی پر رحمت، کسی کی روح قبض کرتا ہے اور کسی کو زندگی بخشتا ہے۔ کسی جگہ بارش برسواتا ہے اور کہیں قحط ڈلواتا ہے۔ وہ ہر انسان کے اعمال، اقوال اور خیالات تک کا پورا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ آدمی جب تک خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر کام کر رہا ہے یہ تمام کارکن اس کی ساری بری بھلی باتوں سے واقف ہونے کے باوجود امر الٰہی کے تحت اس کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں اور اس کے سارے کام بنائے چلے جاتے ہیں مگر جونہی اس کی مہلت عمل ختم ہوئی پھر وہی خادم اس کو گرفتار کر لیتے ہیں، جو ایک لمحہ پہلے تک اس کی خلافت کا کارخانہ چلا رہے تھے۔ وہی ہوا جس کے بل پر آدمی جی رہا تھا یکا یک اس کی بستیوں کو الٹ دیتی ہے۔ وہی پانی جس کا سینہ آدمی چیرتا پھر رہا تھا اچانک اسے غرق کر دیتا ہے۔ وہی زمین جس پر آدمی ماں کی گود جیسے اطمینان کے ساتھ بس رہا تھا یک لخت ایک جھٹکے میں اسے پیوند خاک کر دیتی ہے۔ یہ نقشہ قرآن مجید میں بڑی تفصیل سے بار بار کھینچا گیا ہے۔

اس لحاظ سے ایمان بالملائکہ، ایمان باللہ کا ایک لازمی جز اور توحید کو کامل ومنزہ اور

خالص کرنے والا عقیدہ ہے۔

❀♦❀

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۱، ص ۱۵۸۔

۲۔ شبلی نعمانی، الکلام و علم الکلام، حصہ دوئم، ص ۴۸۔

۳۔ ''اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے۔'' (الانبیاء:۲)

''اور نہ اس خدائے برحق کے سوا کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔'' (المومنون:۵)

۴۔ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، تفہیمات، جلد ۴، ص ۱۲۹، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

۵۔ ندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۴۲۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۴۳۰۔

۷۔ تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۵۹۹۔

۸۔ تفہیمات، جلد ۴، ص ۱۱۷-۱۱۸۔

۹۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۵۲۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۳-۱۵۵۔

۱۱۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔

۱۲۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۶۱۔

۱۳۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۶۹۔

۱۴۔ سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۵۵۴۔

۱۵۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔

❀♦❀

بارھواں باب:

رسالت

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ "رسالت" ہے۔ جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے اسی طرح اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے لفظی معنی "پیامبری" کے ہیں۔ جو شخص کسی کا پیغام کسی دوسرے شخص کے پاس لے جائے وہ "رسول" ہے۔ مگر اسلام کی اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے اور خدا کے حکم سے راہ راست کی طرف ان کی راہنمائی کرے اسی لئے قرآن میں رسول کے لئے "ہادی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ جو سیدھا راستہ دکھائے۔ [1]

انسان کی اصل کامیابی نیز اس کی تخلیق کا مقصد بھی اطاعت خداوندی ہے۔ خدا کی اطاعت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے احکام، اوامر اور نواہی سے آگاہی ہو۔ اس کا ایک ذریعہ تو انسان کی اپنی عقل اور اس کا اپنا نفس ہے جو بہت حد تک صحیح یا غلط میں تمیز کرسکتا ہے لیکن انسانی عقل کی رسائی محض ایک حد تک ہے اسی طرح انسانی نفس کی ہدایات واضح نہیں۔ اس داخلی قوت پر اثر انداز ہونے والی بہت سی خارجی قوتیں بھی ہیں جو انسان کو برائی کی طرف مائل کرتی رہتی ہیں لہٰذا اس کی کمی کو ایک خارجی قوت کے ذریعہ پورا کرنے کا انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے اسی خارجی انتظام کو نبوت یا رسالت کہتے ہیں۔

یہی بات امام غزالی اس طرح کہتے ہیں کہ انسان کے لئے سیکھنے سکھانے کا ابتدائی

درجہ محسوسات کا ہے۔ اس سے اگلا درجہ عقل ہے۔ عقل سے آگے ایک اور درجہ ہے جس کا نام نبوت ہے۔ [۲]

ایک پیغمبر یا رسول کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ پیغام الٰہی من وعن انسانوں تک پہنچادے بلکہ اس پر عمل کر کے دکھانا اور لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے اور یہ کام انبیاء محض ظن وتخمین کی بناء پر نہیں کرتے بلکہ ''علم الیقین'' کے ساتھ کرتے ہیں۔ چونکہ نبوت انسانی ضرورت ہے لہٰذا یہ بھی فطری ہے کہ انبیاء کی تعلیمات کو انسان قبول کرے اور اس کی تصدیق کرے۔ اگر کسی پیاسے کو پانی دیا جائے تو وہ یہ بحث نہیں کرے گا کہ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ پانی ہے تب میں اسے پیئوں گا بلکہ پیاس کی وجہ سے وہ فوراً پانی پی جائے گا۔ اسی طرح نبوت کی تصدیق اور نبی کی باتوں کو سچ سمجھنا خود انسان کی فطرت صحیح کا تقاضا ہے۔ [۳] ایک شخص جو حق کی تلاش میں ہو کسی نبی کی حق بات سنتا ہے تو کج بحثیوں میں نہیں پڑتا بلکہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور عملاً اس کا ساتھ دیتا ہے۔

اسلام سے قبل نبوت سے متعلق ایک عالمگیر غلطی پھیلی ہوئی تھی، ہر فرقہ اور ہر گروہ یہ سمجھتا تھا کہ انبیاء انسان کے درجہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہی خیال تھا جس نے رام کرشن، زرتشت اور حضرت عیسیٰؑ کو عین خدا یا کم از کم مظہر خدا بنا دیا تھا۔ اسلام نے نہایت وضاحت سے بتادیا کہ انبیاء بشریت کے دائرہ سے باہر نہیں۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم اله واحد (الکھف: ۱۱۰)

[اے محمد (ﷺ)! کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا واحد ہے۔]

دنیا میں جتنے مذاہب گزرے ہیں سب نے خدائی اور نبوت کے ڈانڈے ملا دیئے تھے، یا کم از کم قریب کر دیئے تھے۔ صرف اسلام کو یہ عزت حاصل ہے کہ اس نے دونوں کی حد بالکل جدا کر دی۔ خود رسول اللہ ﷺ پر بھی یہی اعتراض ہوا تھا کہ اگر خدا کو کوئی پیغمبر بھیجنا ہی تھا تو وہ ہمارے جیسے انسان کے بجائے کسی فرشتے کو بھیجتا۔ قرآن نے اس کا نہایت حکیمانہ جواب

یہ دیا تھا کہ ''اگر اس زمین پر فرشتے ہی چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ضرور ان پر ہم آسمان سے فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔'' (بنی اسرائیل: ۹۵)

بہر حال جو لوگ منصب رسالت پر فائز کیے گئے وہ گروہ انسانی سے ہونے کے باوجود چند باتوں میں عام انسانوں سے مختلف ہیں۔ ان اضافی خصوصیات میں پہلی صفت یا خصوصیت ''علم'' ہے۔ وحی کے ذریعہ رسولوں کو علم عطا کیا گیا ہے یہ وہ چیز ہے جو رسولوں کو دوسرے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے رہنماؤں کے پاس یہ علم نہیں وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں جس میں ہوائے نفس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو عقائد و قوانین وہ وضع کرتے ہیں وہ کامل حق نہیں ہوتا جب کہ رسولوں کو علم عطا کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے حق ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ انسانیت کی راہبری کا کام کر سکیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے نبوت کا اعلان اس طرح کرایا جاتا ہے۔

[اے پدر عزیز یقین مانیے کہ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا لہٰذا آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھے راستے پر چلاؤں گا۔]
(مریم: ۴۳)

اسی طرح حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت محمد ﷺ کا جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں واضح طور پر فرمایا گیا کہ ہم نے انہیں ''علم'' عطا کیا ہے۔

نبوت اور رسالت کی دوسری بڑی خصوصیت ''عصمت'' ہے۔ یعنی نبی اور رسول گناہوں سے پاک، برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اس عصمت کے تین اسباب بتاتے ہیں۔[۲]

اول تو یہ کہ رسولوں کی فطرت نہایت خالص، پاکیزہ پیدا کی جاتی ہے خصوصاً ان امور کی نسبت جو حدود شرعی کی حفاظت اور پاسبانی سے متعلق ہوتے ہیں۔

دوئم یہ کہ...... رسول کو اچھے کام کی خوبی اور برے کام کی برائی دونوں کا انجام وحی الٰہی سے معلوم ہو جاتا ہے (لہٰذا وہ گناہوں سے خود کو محفوظ کر لیتا ہے)۔

سوئم یہ کہ......رسول اور رذیل خواہشات کے درمیان خدا حائل ہو جاتا ہے اور رسول کی خصوصی حفاظت کرتا ہے۔

درحقیقت نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لئے بالکل ناگزیر تھا جس کے لئے رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ ایسا شخص جس سے غلطی اور برائی کا احتمال ہو لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں کرسکتا اور اس کا عمل دوسروں کے لئے اعلیٰ ترین اور قابل تقلید نمونہ (اسوۂ حسنہ) نہیں بن سکتا۔

رسالت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہبی ہے اکتسابی نہیں، جو محنت اور تلاش و جستجو کے بعد مل جائے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے اور اسی کو ملتا ہے جسے وہ مرحمت فرمانا چاہے۔ اس کے ملنے میں انسانی کوشش، ارادے اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس انتخاب کو قرآن کی زبان میں ''اصطفا'' کہتے ہیں۔ اصطفا کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے بہترین چیز کو چن لینا۔ جب حضرت محمد ﷺ کے مخالفین نے آپ کے نبی بنائے جانے پر اعتراض کیا اور اپنے لئے بھی برابر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

الله يعلم حيث يجعل رسالته (الانعام:۱۲۴)

[اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہئے۔]

امام غزالیؒ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ انسانی خوبیاں ہر انسان میں ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتی ہیں مثلاً اگر ذہانت کو لیا جائے تو ایک شخص کم ذہین ہوتا ہے دوسرا اس سے زیادہ ذہین اور تیسرا اس سے بھی زیادہ ذہین و فطین ہوسکتا ہے اور یہ ذہانت کوئی دنیاوی تعلیم یا محنت و مشقت سے حاصل نہیں کرسکتا بلکہ یہ خداداد صلاحیت ہے جو کسی کو زیادہ ملتی ہے اور کسی کو کم اور کسی کو بالکل نہیں۔ اسی طرح بعض اشخاص کو ملکہ نبوت عطا ہوتا ہے ہر ایک کو نہیں اور اس میں نبی کی اپنی محنت و مشقت یا تعلیم و تعلم کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ خود خدا کسی خاص شخص کو اس منصب کے لئے چنتا ہے۔[5]

چونکہ رسالت کا ادارہ اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کا کام کیا جاسکے لہٰذا جب سے کائنات میں انسان نے جنم لیا اس وقت سے اصولاً اس ادارے کو موجود ہونا

چاہئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ہی ہے، آدمؑ اولین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اولین نبی بھی تھے اور ان کی اولاد ان کی امت تھی، اس طرح تاریخ انسانی کا آغاز مکمل روشنی اور واضح ہدایت سے ہوا جہالت اور تاریکی سے نہیں۔ آدمؑ سے لے کر نبی آخر الزماں محمد ﷺ تک یہ سلسلہ قائم رہا۔٦؎ ہزاروں انبیاء دنیا میں مبعوث ہوئے۔ کوئی قوم ایسی نہیں جن میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ آیا ہو۔

و ان من امۃٍ الّا خلا فیھا نذیرٌ (فاطر:۲۴)

[کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ آیا ہو۔]

یہ انبیاء ایک ہی دین حق کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے۔ ان سب نے لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلایا اور برائیوں اور شرک سے بچنے کی تلقین کی۔ ان میں سے بعض انبیاء کا تذکرہ قرآن مجید میں تصریح کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان پر تصریح کے ساتھ ایمان لانا ہر مسلمان پر فرض ہے اور جن انبیاء کے نام نہیں لئے گئے ان پر بلا تصریح ایمان لانا ضروری ہے اس کے لئے یہ اعتقاد ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کو دین حق کی طرف بلانے والے تھے۔ قرآن پاک میں تین طرح کے انبیاء کا ذکر نام کے ساتھ کیا گیا ہے۔٧؎

۱۔ ایک وہ جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے۔ مثلاً حضرات ہودؑ اور شعیبؑ۔

۲۔ دوسرے وہ جن سے یہود و نصاریٰ واقف تھے عرب لاعلم تھے۔ مثلاً حضرات داؤدؑ، سلیمانؑ۔

۳۔ تیسرے وہ جن سے عرب بھی واقف تھے اور ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں بھی جن کے تذکرے تھے۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بلا امتیاز انبیاء پر ایمان لائیں اور دوسرا مطالبہ یہ کرتا ہے کہ انبیاء کی اطاعت کریں۔ یہ شرط ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں ایک نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی بلا چوں و چرا تعمیل کرے اور مصلحت

خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہر صورت یقین رکھے کہ وہ سراسر خیر اور سراپا حق ہیں۔

وما ارسلنا من رَّسولٍ الّا لِیُطاع بِاذن اللہ (النساء:٦٤)

[ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔]

رسالت محمدی اور ختم النبوت:

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ رسالت کے عام احکام سے متعلق تھا مگر ان کے علاوہ چند امور ایسے بھی ہیں جو خاص طور پر رسالت محمدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ نفس منصب رسالت کے اعتبار سے حضرت محمد ﷺ اور دوسرے انبیاء میں کوئی فرق نہیں اور قرآن مجید[8] کا صریح فیصلہ ہے کہ رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے چند امور میں حضرت محمد ﷺ کو دوسرے انبیاء کے مقابلے میں امتیاز عطا فرمایا ہے۔[9] اور یہ امتیاز محض سطحی نہیں ہے کہ اس کو ملحوظ رکھنے یا نہ رکھنے کا کوئی اثر نہ ہو، بلکہ درحقیقت اسلام کے نظام دینی میں اس کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے اور عملاً اسلام کے تمام معتقدات اور قوانین کی بنیاد رسالت محمدیؐ کی اسی امتیازی حیثیت پر قائم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ ان کی تعلیمات کا دائرہ کسی خاص علاقہ یا خاص قوم تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کی مخاطب پوری انسانیت ہے اور اس کی تعلیمات تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہیں۔ یہ عالمگیریت کسی اور پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہر نبی یا پیغمبر کسی خاص زمانہ میں، کسی مخصوص علاقہ یا قوم پر بھیجے گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو بہت زیادہ وسعت ملی مگر خود انہوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں بلکہ مسیح علیہ السلام سے خود انجیل میں یہ قول منقول ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے آئے ہیں۔ انبیاء اور پیشوایان ادیان کے پورے گروہ میں تنہا محمد ﷺ ہیں جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی دعوت کل نوع انسانی کے لئے ہے۔

[پاک ہے وہ جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب اپنے بندے پر اتاری تا کہ تمام اہل عالم کے لئے متنبہ کرنے والا بنے۔] (الفرقان:۱)

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین (الانبیاء:۱۰۷)

[اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔]

حضرت محمد ﷺ کو دوسرا امتیاز یہ حاصل ہے کہ ان کی تعلیمات اور ان کی سیرت نہایت سند کے ساتھ موجود ہیں جس کی وجہ سے قابل عمل تعلیمات کا قابل ذکر ذخیرہ موجود ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (الحجر:۹)

[اس ذکر (قرآن) کو ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔]

جب کہ دوسرے انبیاء اور رسولوں کی تعلیمات تحریفات کا شکار ہو گئیں یا تلف ہو گئیں اور ان کی سیرتیں بھی محفوظ نہ کی جا سکیں چنانچہ انبیاء اور پیشوایان ادیان میں سے کسی کا اتباع اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف محمد ﷺ ہیں کہ ان کی تعلیمات قرآن کی شکل میں رہتی دنیا تک کے لئے محفوظ ہے اور ان کی سیرت اور ان کا اسوۂ حسنہ نہایت سند کے ساتھ تمام تر جزئیات سمیت تاریخ و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

حضرت محمد ﷺ کا تیسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ خاتم النبیین تھے اور ان پر دین کی تکمیل ہو گئی۔

''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔'' (الاحزاب:۴۰)

رسول اللہ ﷺ نے بھی مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہے۔ مثلاً ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا ''بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مر جاتا تو دوسرا نبی اس کا

جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے۔" (صحیح بخاری، کتاب المناقب)

ایک اور موقع پر وضاحت فرمائی "میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی۔ مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر حیرت کرتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔"

اسی طرح ایک دفعہ فرمایا "رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے نہ نبی۔" (ترمذی۔ مسند احمد)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت قبول کی ان سب کے خلاف خلیفہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

دراصل دنیا میں انبیاء کی آمد کے تین ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔[10]

ایک یہ کہ کسی قوم کی ہدایت کے لئے پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو اور لکل قوم ھاد کی بناء پر اس کے لئے ایک یا ایک سے زائد انبیاء کی ضرورت ہو۔

دوسرے یہ کہ پہلے کوئی نبی آیا تھا مگر اس کی رسالت کے آثار محو ہو گئے اس کی تعلیم اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں تحریف ہوگئی، اس کی سیرت کے نشانات اس طرح مٹ گئے کہ لوگوں کے لئے اس کی پیروی کرنا اور اس کے اسوہ حسنہ کی تقلید کرنا ممکن نہ رہا۔

تیسرے یہ کہ پہلے نبی یا انبیاء کی تعلیم اور ہدایت مکمل نہ ہو اور اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہو۔

- ان تین اسباب کے سوا انبیاء کی بعثت کا کوئی چوتھا سبب نہ ہے اور نہ عقلاً ہوسکتا ہے۔[11] رسالت محمد ﷺ کے ساتھ ساتھ یہ تینوں ضروریات پوری ہو چکی ہیں یعنی آپ کی دعوت تمام نوع انسانی کے لئے ہے لہٰذا اب جدا جدا قوموں کے لئے نبی آنے کی ضرورت نہیں۔ نیز آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کے جملہ آثار رسالت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں لہٰذا کسی نئی

کتاب یا نئی ہدایت کے آنے کی ضرورت نہیں۔ اور تیسری بات یہ کہ آپ کی تعلیم اور ہدایت مکمل اور جامع ہے لہٰذا اس پر کسی اضافہ کرنے والے کی بھی ضرورت نہیں۔

لہٰذا قرآن مجید وضاحت کے ساتھ کہتا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ:۳)

اس طرح رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔[۱۲] اس سے مراد یہ ہے کہ پچھلے انبیاء نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ اب منسوخ ہو گیا ہے۔ ان کی نبوت و صداقت پر اجمالی اعتقاد رکھنا ضروری ہے کیونکہ وہ سب ہی اسلام کے داعی تھے لیکن عملاً اتباع اور اطاعت کا تعلق اب ان سے منقطع ہو کر صرف محمد ﷺ کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے اس لئے کہ اوّل تو اصولاً کامل کے بعد ناقص کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوسرے انبیاء سابقین کی تعلیم اور سیرت کے آثار تحریف ونسیان کی نذر ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کا صحیح اتباع اب ممکن نہیں رہا۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جہاں کہیں رسول کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے وہاں الرسول یا النبی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے خاص محمد ﷺ کی ذات مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوموں کو بھی محمد ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انبیائے سابقین میں سے کسی کی ماننے والے ہیں۔

> ''اہل کتاب میں سے ایماندار وہ ہیں جو اس ان پڑھ رسول نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے۔'' (الاعراف:۱۵۷)

المختصر تکمیل دین، نسخ ادیان سابقہ، اور ختم النبوت کے یہ تینوں عقائد دراصل رسالت محمدیؐ کے لازمی اجزاء اور اسلام کے ایمانیات میں داخل ہیں۔ اسلام کی دعوت عام اس بنیاد پر قائم ہے کہ نوع انسانی کے لئے دعوت محمدیؐ کی صورت میں ایک ایسا مکمل مذہب پیش کر دیا ہے جس میں پچھلی تمام دعوتوں کی کمی پوری کر دی گئی ہے اور آئندہ کے لئے کوئی ایسی کمی نہیں چھوڑی

گئی جس کو پورا کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

ایمان بالکتب:

عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ کتب الٰہی پر ایمان لانا ہے کیونکہ رسول کو رسول برحق ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کی تصدیق کی جائے۔ اسلام کی اصطلاح میں ''کتاب'' سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی راہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے رسول پر نازل کی جائے۔ گویا کتاب وہ کلام الٰہی ہے جنہیں لوگوں تک پہنچانے، اس کی تشریح و توضیح کرنے اور اس پر عمل کر کے دکھانے کے لئے نبی مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسرے کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان بالکتب کو بالعموم عقیدہ رسالت کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ معلم کے بغیر صرف کتاب انسانی سیرتوں کو اس درجہ تبدیل نہیں کر سکتی چنانچہ پوری تاریخ انسانی میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ تنہا کسی کتاب نے انسانی معلم کی ہدایت اور تعلیم و تشریح کے بغیر کسی قوم کی ذہنیت اور زندگی میں انقلاب بپا کیا ہو۔ لہٰذا بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کتاب اور رسول کا تعلق ناقابل انقطاع ہے اور انسان کو ہدایت کے لئے دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اللہ ان تمام کتابوں اور صحیفوں کو ماننے کا حکم دیتا ہے جو اس کی طرف سے اس کے پیغمبروں پر نازل کی گئیں۔

والذین یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک (البقرہ:۴)

[اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تیری طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں۔]

بعض کتابوں کا قرآن میں تصریح کے ساتھ ذکر آیا ہے مثلاً توراۃ جس کو ایک جگہ

''صحف موسیٰ'' بھی کہا گیا ہے۔ حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت عیسیٰؑ کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقع پر ''صحف ابراہیم'' [۱۴] کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ چنانچہ جن کتابوں کا ذکر تصریح کے ساتھ قرآن میں آیا ہے ان پر صراحتاً اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ عیسائی انجیل کے علاوہ توراۃ کی محض اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں۔ پارسی اوستا اور برہمن ویدوں سے باہر خدا کے فیضان کا تصور نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ اس سے پیشتر نازل ہونے والی تمام کتابوں اور صحائف پر ایمان لائے۔ البتہ جس طرح تمام انبیاء میں محمد ﷺ کو چند امتیازی خصائص حاصل تھے اسی طرح قرآن مجید کو بھی دیگر آسمانی کتب کے مقابلے میں چند امتیازی خصائص حاصل ہیں۔

۱۔ قرآن کا پہلی امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ اپنے لائے ہوئے پیغام کی تکمیل کا اعلان کرتا ہے جبکہ گذشتہ انبیاء نے ایک اور نبی کی بشارت اپنے پیروکاروں کو دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی امت کو اس بات کی اطلاع دی کہ ان کے بعد ایک اور صاحب شریعت نبی آئے گا۔

''میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی بپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔''

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی فارقلیط کی بشارت دی جو ان کے کام کی تکمیل کرے گا۔

''لیکن وہ فارقلیط پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو تم سے کہیں ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔'' [۱۵]

جب کہ قرآن نے اپنے بعد کسی شریعت یا محمدؐ کے بعد کسی نبی کے آنے کی اطلاع نہیں دی بلکہ یوں کہا گیا ہے کہ ''آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کیا۔'' (المائدہ: ۳)

اسی بناء پر قرآن نے ہر جگہ وما انزل من قبلک کی تاکید کی لیکن وما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں دیا اور یوں گویا قرآن خود ختم النبوت کی دلیل بن گیا۔

۲۔ قرآن کا دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ تمام حقائق و معارف اور خیرات و صالحات کی جامع ہے۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ جس کا قرآنی حل تلاش نہ کیا جاسکتا ہو۔ جب کہ دوسری کتابیں اور صحیفے اس قدر جامع ہیں نہ مکمل۔

۳۔ قرآن کا تیسرا وصف جو کسی دوسری الہامی کتاب کو نصیب نہیں، یہ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے اٹھائی ہے لہٰذا یہ محفوظ کتاب رہتی دنیا تک لوگوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ قرآن سے قبل ہر کتاب لفظی تحریفات اور تصرفات کا شکار رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ باقی نہیں اور جن کی کتابیں اور صحیفے باقی بھی ہیں ان میں لفظاً اور معناً اس قدر تحریفات ہوچکی ہیں کہ اس بات کا کھوج لگانا کہ ان میں حق کہاں اور کس قدر ہے؟ امر محال ہے۔ جب کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو کہ ایک زندہ زبان ہے اور آج بھی انہی الفاظ میں موجود ہے۔ چودہ سو سالوں میں اس میں ایک زبر زیر کا بھی فرق نہیں آیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا ضامن خود خدا ہے۔

انَّ عَلَيْنا جَمْعَهٗ و قرانهٗ (القیمہ: ۱۷)

[بے شک اس (قرآن) کو یاد کرا دینا اور پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔]

قرآن کی ان اضافی خصوصیات کی وجہ سے اسلام کو اپنے پیروکاروں سے صرف یہی مطالبہ نہیں ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے بلکہ چونکہ اس کی تعلیمات مکمل، جامع اور محفوظ ہیں اس بناء پر اسلام کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن پاک کا اتباع کیا جائے۔ ''پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی مدد و حمایت کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اترا ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الاعراف: ۱۵۷)

جس طرح سے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے مگر اتباع کی حد تک محمد ﷺ کو متبوع بنایا گیا ہے، اسی طرح تمام کتب و صحائف آسمانی پر ایمان لانا ضروری ہے مگر اتباع صرف قرآن کا کیا جائے گا کیونکہ اس سے قبل کی کتابیں نہ تو اتنی جامع اور کامل تھیں اور نہ ہی محفوظ ہیں کہ ان پر عمل کیا جاسکے۔

تاسیس تہذیب میں کتاب و رسالت کا حصہ:

رسالت کا عقیدہ درحقیقت اسلامی تہذیب کی روح حیات اور بنائے اصلی ہے جیسا کہ ہم ابتدائی ابواب میں بحث کر کے متعین کر چکے ہیں کہ ہر تہذیب ایک نظام فکر اور اس کے تحت نظام عمل کے اشتراک سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اسلامی عقائد میں سے اگر توحید کا عقیدہ فکر مہیا کرتا ہے تو نظام عمل عقیدہ رسالت سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلامی تہذیب کا نظام عمل قرآن اور سنت نبوی اور انہی دونوں کی اتباع میں پنہاں ہے۔ قرآن اپنی مکمل شکل میں اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی اپنی تمام تر جزئیات سمیت موجود ہے عمل کی تمام راہیں واضح اور متعین ہیں۔ اگر قرآن ایک طرف یہ کہتا ہے کہ اقیمو الصلوٰۃ تو رسول صلوا کما رائتمونی اصلی کہہ کر اس کی عملاً تشریح کرتا ہے اور یوں فکر و عمل کا نہایت مربوط اور عادلانہ نظام ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ نہ فکر میں کسی قسم کا ابہام اور شک و شبہ ہے اور نہ ہی عمل میں کوئی جھول یا بدصورتی ہے۔ یوں عقیدہ توحید فکر اسلامی کی آبیاری کرتا ہے اور عقیدہ رسالت (بالخصوص عقیدہ رسالت محمدی اور ختم النبوت) ان فکری بنیادوں پر عملاً اسلامی تہذیب کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔

المختصر محمد ﷺ کو بحیثیت رسول خدا ہونے کے واحد مقتدا اور قرآن کو بحیثیت کتاب الٰہی ہونے کے واحد کتاب آئین تسلیم کرنا اور اسی سرچشمے کو جملہ عقائد اور قوانین کا ماخذ قرار دینا اسلام کو ایک مستقل تہذیب اور مسلمانوں کو ہر قسم کے نسلی، لسانی، لونی و جغرافیائی اختلافات کے باوجود ایک قوم بناتا ہے خواہ ان کے درمیان فروعی امور میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

❧ ♦ ☙

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۸۰۔

۲۔ الکلام و علم الکلام، جلد ۲، ص ۸۷ (بحوالہ امام غزالی، معارج القدس)۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۱، ص ۲۲۶۔

۵۔ الکلام و علم الکلام، جلد ۲، ص ۸۰ (بحوالہ امام غزالی، منقذ من الضلال)

۶۔ طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ تاہم دوسری روایت میں اس سے کم تعداد مروی ہے۔

۷۔ سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۵۸۴۔

۸۔ لانفرق بین احد من رسلہ (البقرہ: ۲۸۵)

۹۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۹۸۔

۱۰۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۲۰۳-۲۰۴۔

۱۱۔ ایک چوتھا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے دوسرا نبی مبعوث کرنے کی ضرورت ہو جیسے حضرت موسیٰ کی مدد کے لئے ان کے بھائی ہارون کو مبعوث کیا گیا لیکن یہاں یہ صورت زیر بحث نہیں ہے کیونکہ مددگار نبی کی نبوت اس نبوت کا ضمیمہ ہوتی ہے جس کی معیت میں اسے وزیر کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۲۰۹۔

۱۳۔ الاعلیٰ: ۱۹۔

۱۴۔ سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۶۲۴ (بحوالہ توراۃ، باب استثناء، ۱۸-۱۹)

۱۵۔ ایضاً (بحوالہ یوحنا، ۱۴-۲۶)

تیرھواں باب:

آخرت

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی ''آخرۃ'' پر ایمان ہے۔''آخرۃ'' کے لغوی معنی ۱؎ دوسرا، دیگر یا پچھلے کے ہیں۔اسلام کی اصطلاح میں آخرۃ سے مراد موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا یا زندگی ہے۔اسی لئے اس کو''حیات آخرت''اور دار آخرت'' بھی کہا گیا ہے۔آخرت پر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی بنیاد آخرت کے تصور پر قائم ہے۔اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے تائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔اسی لئے یہ تصور یا خیال ہر مذہب وقوم میں کسی نہ کسی طور سے موجود رہا ہے اور یہی وہ قومی تصور ہے جسے دنیا کے تمام معلمین اخلاق نے افراد و اقوام کی سیرت و کردار کو متاثر کرنے کی خاطر استعمال کیا خواہ زرتشت ہوں یا بدھ، حضرت عیسیٰ ہوں یا حضرت موسیٰ۔

قرآن اس دوسری زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا دور موت سے لے کر قیامت تک کا ہے جسے''برزخ'' کا نام دیا گیا ہے۔اور دوسرا دور قیامت سے لے کر ابد تک جس میں پھر موت وفنا نہیں،اسے''بعث'' یا حشر و نشر کا نام دیا گیا ہے،اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکھٹے کیے جانے، اور کھڑے ہونے کے ہیں۔لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت

کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لئے اس دوسری زندگی کا نام قرآن میں الدار الآخرہ اور عقبی الدار وغیرہ ہے۔ جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔[2]

زندگی اور آخرت کے بارے میں ایک تو مادہ پرستوں کا نظریہ ہے ان کے خیال میں جو کچھ بھی ہے اسی زندگی میں ہے اور موت کے معنی کامل فنا کے ہیں اس کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔ رہی یہ دنیا تو یہ کارخانہ حیات یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں۔

"اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف پہلی مرتبہ (ایک بار) مرنا ہے اور پھر ہمیں اٹھنا نہیں ہے۔" (الدخان: ۳۴-۳۵)

"اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف اسی دنیا کی ہے یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔" (الجاثیہ: ۲۴)

مادہ پرست آخرت کا انکار اس بناء پر نہیں کرتے کہ ان کو کسی ذریعہ علم سے بہ تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے بلکہ انہوں نے اس ضمن میں اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی وزن نہیں ہے کہ چونکہ موت کے بعد کی کیفیت ان کے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آئی لہٰذا وہ سرے سے موت اور اس کے بعد کے معاملات کا ہی انکار کر دیں۔

اسی طرح مادہ پرست اس دنیا کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بناء پر لگاتے ہیں کہ انہوں نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ انتہائی ناقابل فہم استدلال ہے کیونکہ اس طرح تو کوئی بھی شخص ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمارت ہمیشہ یونہی قائم رہے گی کیونکہ نہ تو اس نے اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں ایسی بوسیدگی ہی نظر آتی ہے جو آئندہ اس کے گرنے کی پیشگوئی کرتی ہو۔[3]

انسانی اخلاق پر انکار آخرت کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ناموافق

حالات میں اس عقیدے سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوسکتی ہے کیونکہ جب وہ اپنے اچھے اعمال کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہیں دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائے گی اور جب وہ مفسدوں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھولتے دیکھے گا تو یا تو خود بھی بالآخر انہی کا ساتھ دے گا اور اگر وہ خود کو ان کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں پائے گا تو مستقل مایوسی، بددلی اور غم کا شکار ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے وہاں خودکشی کا رجحان زیادہ ہے جب کہ مسلمانوں میں خودکشی کی شرح سب سے کم ہے اور قرون اولیٰ میں تو اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

دوسری طرف اگر مادہ پرست انسان کے حالات موافق ہوں گے تو اس اعتقاد کے اثر سے وہ ایک نفس پرست حیوان بن جائے۔گا وہ خیال کرے گا کہ جو دن بھی عیش ولطف میں بسر ہو جائیں وہی غنیمت ہیں ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

چنانچہ اپنے فائدے اور نفسانی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، عزت، شہرت یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہوسکیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جرائم کو جرائم اور گناہوں کو گناہ سمجھے گا جس کا نتیجہ کسی دنیاوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوں گی اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو، وہ اس کے نزدیک عین ثواب ہوں گی۔

اب ایسے افراد کے اجتماع سے بننے والا معاشرہ کیسا ہوگا؟ اس کا تصور بآسانی کیا جاسکتا ہے۔اس سوسائٹی کا پورا نظام اخلاق خودغرض اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔

آخرت کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ تناسخ (*Transmigration*) کا ہے۔

یہ نظریہ سب سے پہلے قدیم مصریوں ؎۴ نے پیش کیا اس کے بعد اس نظریہ کو مختلف اقوام تبدیلیوں کے ساتھ اپناتی گئیں۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے معنی فنائے محض کے نہیں بلکہ تبدیل جسم کے ہیں۔ ایک انسان کی روح اس کے جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے اعمال کی مطابقت سے دوسرا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کے اعمال اس دنیا میں برے رہے ہیں اور ان کے اثرات سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہوگئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کی حیوانی یا نباتاتی طبقات میں چلی جائے گی۔ انسانی روح کو بار بار قالب بدل کر دنیا میں آنا پڑے گا اور اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ یہاں تک کہ اس کے اعمال اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے۔ اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج یوک اور چندر یوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم وعمل کی کسی کمی کی وجہ سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر نئے نئے جنموں میں سزا بھگتنے کا عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ آواگون کا یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا الا یہ کہ ہمالیہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے اور موکش یا مکتی حاصل کر لی جائے۔ ؎۵

اسی طرح دنیا کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر ایک وقت کے بعد دوسرے پرلے (قیامت) سے گذرے گی۔ دوسرے پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا اور یہ چکر تا ابد قائم رہے گا۔

اس میں شک نہیں کہ کم از کم دو اعتبار سے یہ تناسخ کا نظریہ منکرین آخرت کے عقیدے سے بہتر ہے۔ اولاً یہ کہ انسان میں بقائے دوام کی ایک فطری خواہش موجود ہے وہ تناسخ میں ایک حد تک تسکین پا سکتی ہے۔ ثانیاً اس عقیدہ میں جزا و سزا اور اعمال کے اچھے یا برے انجام کا تخیل بہرحال موجود ہے جس کی بناء پر یہ ایک ضابطہ اخلاق کے لئے پشت پناہ بن سکتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عقیدہ عقل و علم کے خلاف اور تہذیب و تمدن

کی ترقی میں زبردست طور پر مانع ہے۔

۔ عقیدہ تناسخ کی بنیاد ایسے نظریات پر ہے جو صریحاً عقل وعلم کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نباتات وحیوان ہو اور نباتات وحیوان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے وہ انسان ہو۔

۲۔ اگر تناسخ کا چکر ازلی وابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں، ازلی اور ابدی ہوں۔ یہ زمین وآسمان، نظام شمسی اور وہ تمام قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں یہ سب بھی ازلی وابدی ہوں لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہیں کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ ے

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات اور حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ جو نفس انسان کے سب میں عقل وفکر کی قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں پہنچ کر لایعقل ہو گیا اور نباتاتی قالب میں پہنچ کر اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک وبد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالارادہ کیے جائیں۔ اس لحاظ سے انسانی اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا وسزا مترتب ہو سکتی ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے اور نہ ان پر جزا وسزا مترتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے۔ ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالارادہ فعل کرنے کی قوت موجود ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے۔ ظاہر ہے کہ برے کاموں کا پھل برا ہی ہونا چاہئے اور جب دوسرے جنم میں وہ برا پھل ہم کو ملا تو یہ کیونکہ ممکن ہے کہ اس برے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لامحالہ اس سے برے ہی اعمال صادر ہوں گے اور پھر ان کا پھل تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے

چکر میں نچلے سے نچلے طبقوں کی طرف ہی گرتی چلی جائے گی۔اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان سے حیوان تو بن سکتا ہے مگر حیوان سے انسان بننا غیر ممکن ہے۔اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت انسان ہیں وہ کس حسن عمل کے نتیجے میں انسان ہوئے اور کہاں سے آئے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کی بناء پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کرسکتی۔یہی وجہ ہے کہ انسان عقل وعلم میں جتنی ترقی کرتا گیا تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا۔یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔تناسخ کا عقیدہ ہمتوں کو پست کرنے والا اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔اس سے ''اہنسا'' کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہوجاتی ہے اور اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہوجاتی ہیں اور یا تو وہ قوم محکوم ومغلوب ہوکر صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے اور یا دوسری طاقتور قوموں میں ضم ہوجاتی ہے۔

عقیدہ تناسخ کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ تہذیب وتمدن کا دشمن ہے اور انسان کو رہبانیت، ترک دنیا اور ترک اعمال کی طرف لے جاتا ہے۔

ان اعتقادات کے مقابل اسلام جو تصور آخرت دیتا ہے اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ اس کائنات کا بنانے والا ایک حکیم ہے جس کا کوئی فعل عبث نہیں اس نے یہ کائنات اور اس کی جملہ اشیاء بشمول انسان خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے پیدا کیے ہیں۔ہر انسان اور ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہوجانے کے بعد اس میں فساد رونما ہوجاتا ہے۔اسی طرح اس کائنات کی بھی ایک عمر ہے۔

ماخلقنا السّموٰتَ و الارضَ وما بینھما الّا بالحقّ و اجلٍ مُسمًّی

(الاحقاف:۳)

[ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو چیزیں ہیں ان سب کو مقتضائے حکمت کے مطابق اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔]

اس معینہ مدت کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔جب یہ مدت پوری ہوجائے گی تو سارا

کارخانہ حیات درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کو "قیامت" کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو متعدد ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ہولناک دن ہوگا جب کوئی کسی کا مددگار نہیں ہوگا۔

اذا السماء انفطرت و اذا الکواکب انتثرت و اذا لبحار فجرت و اذا القبور بعثرت (الانفطار:۱-۴)

[جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہو جائیں گے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی۔]

اذا زلزلت الارض زلزالها و اخرجت الارض اثقالها وقال الانسان مالها یومئذٍ تحدث اخبارها (زلزال:۱-۴)

[جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہو گیا؟ اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔]

۱۔ اس نظام کے درہم برہم ہونے پر اک نیا نظام بپا ہوگا۔ تمام انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات بت پرست عربوں کے لئے نہایت ناقابل فہم تھی اور وہ حیرت واستعجاب سے پوچھتے تھے "کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اٹھیں گے؟ یہ واپسی تو بعید از عقل و قیاس ہے۔" (ق:۳)

قرآن مجید اس کا جواب نہایت مدلل طریقے سے دیتا ہے۔

"ان سے کہو کہ پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت ہی بعید از عقل ہو، پھر وہ پوچھیں گے کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا۔" (بنی اسرائیل:۵۰-۵۱)

یا جیسے سورۃ یٰسین میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی؟ کہہ دے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار زندگی بخشی تھی۔"

(یٰسین: ۷۸-۷۹)

قرآن کا طرز استدلال یہ ہے کہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی وہ آسان کام کو انجام دینے سے کیونکر عاجز ہو سکتی ہے؟

۳۔ دوبارہ زندگی نصیب ہونے کے بعد تمام انسانوں کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔ خدا کی عدالت بپا ہوگی۔ اس دن انسان کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پچھلی زندگی میں انجام دیئے تھے۔ ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے اور ان کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہو پاتے اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ رہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔

ولکل درجت مما عملوا (الانعام: ۱۳۲)

[آج تم کو ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے تھے۔]

گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں ''عقاب'' اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ''ثواب'' رکھا گیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں گویا عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں اس لئے یہ لفظ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ ۸ گویا جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردّعمل کا نام ہے لہٰذا روز جزا ہمارے تمام اعضاء سرزد ہونے والے تمام اعمال و افعال کی گواہی دیں گے پھر انہی شہادتوں کی روشنی میں ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یوم تشھد علیھم السنتھم و ایدیھم و ارجلھم بما کانوا یعملون

(النور: ۲۴)

[وہ دن جب کہ ان پر خود ان کی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انہوں نے کیے تھے۔]

۴۔ ہر نیکوکار کو اس کے اعمال صالحہ کے عوض جنت عطا کی جائے گی اور ہر مفسد و کافر و بدکار کو اس کے اعمال کے عوض دوزخ نصیب ہوگی۔

وازلفت الجنة للمتقین و برّزت الجحیم للغاوین. (الشعراء: ۹۰-۹۱)

[جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے کردی جائے گی۔]

جنت اس مقام کا نام ہے جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا۔ جہاں ہر طرح کا سکھ ہوگا، ہزار ہا نعمتیں، جن میں سے بعض تو انسان کے وہم و گمان سے ماوراء ہیں، اس کو میسر ہوں گی حتیٰ کہ جنتیوں کو دیدار خداوندی نصیب ہوگا۔

دراصل جنت انسان کی وراثت ہے۔ ۹ اور جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو ابدی سعادتیں اور غیر متناہی ترقیاں عطا کی جائیں۔ مگر اس سعادت و ترقی کا انحصار نیک اعمال کے حصول اور اعمال بد سے پرہیز پر رکھی گئی ہے چنانچہ انسان کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تا کہ اپنی موعودہ سعادت و ترقی کو حاصل کر سکے اور اسی کا نام جنت ہے۔

اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں زیادہ ہیں تو اس کی کچھ سزا تو اسے اسی دنیا میں ناکامیوں کی صورت میں مل جاتی ہے۔ کچھ سزائیں اور عذاب وہ قبر میں یعنی عالم برزخ میں برداشت کرتا ہے۔ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے۔ اور جن کے گناہوں کی ناپاکیاں اس کے باوجود موجود رہیں گی وہ دوزخ کے سپرد کیے جائیں گے۔ جو نہایت برا ٹھکانہ ہے۔ ۱۰ جہاں جسمانی اور روحانی شدید عذابوں سے دو چار ہونا پڑے گا۔ اور جب تک خدا چاہے گا انہیں اسی

بدترین ٹھکانہ میں رہنا ہوگا اس کے بعد انہیں نجات عطا کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے عذاب سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے دردناک عذاب کا شکار ہوں۔ اس کی نمایاں ترین صفت اس کا غفور الرحیم ہونا ہے لیکن یہ خود انسان ہے جو اپنے آپ کو اپنے اعمال بد کی وجہ سے رحمت الٰہی سے دور کر لیتا ہے۔

فَمَا کان اللہُ لیظلمھم ولکنّ کانوا انفسھم یَظْلِمون (توبہ: ۷۰)

[اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔]

اس لئے بہشت جو کہ اللہ کی رحمت ہے اور دوزخ جو کہ اللہ کا عذاب الٰہی ہے، انسان کے اپنے ہی اعمال کا لازمی نتیجہ ہے۔

المختصر یہ آخرت اور دوسری زندگی کا وہ خاکہ ہے جو محمدؐ اور انبیاء علیہم السلام کا مذہب بیان کرتا ہے۔ اور یقیناً یہ بعید از عقل نہیں، عقل سلیم اور علم حقیقی ہم کو اخروی زندگی کے اس تصور پر ایمان لانے سے روکتے نہیں بلکہ آمادہ کرتے ہیں۔

عقیدہ آخرت کے فوائد واثرات:

اخروی زندگی کا اسلامی نظریہ محض ایک مابعد الطبعی نظریہ، یا کوئی فلسفیانہ فکر یا کوئی علمی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اس کے ماننے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات سے متعلق انسان کا نقطہ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ انسان خود کو جوابدہ اور ذمہ دار محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تمام تر معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دیتا ہے کہ وہ اپنی ہر ہر حرکت اور ہر ہر فعل کے لئے خدا کے آگے جوابدہ ہے اور انہی اعمال پر اس کی دوسری زندگی کی سعادت وراحت کا دارومدار ہے۔ بخلاف اس کے اس اعتقاد پر ایمان نہ رکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ انسان اپنے آپ کو مطلق العنان، غیر ذمہ دار اور مجموعی طور پر اپنی زندگی کو بے نتیجہ خیال کرنے والا ہوگا۔ وہ یہ سمجھ کر زندگی گذارے گا کہ وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے نہ ہی اس کا

کوئی حساب لینے والا ہے۔ لہٰذا حق سے تجاوز کرنا اور گناہوں میں مبتلا ہو جانا، انکارِ آخرت کا لازمی نتیجہ ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنما خلقنکم عبثاً وَّ اَنّکم الینا لا تُرجَعون (المومنون: ۱۱۵)

[کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہ لائے جاؤ گے؟]

تصورِ آخرت سے جو دوسرا زبردست اثر انسان پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ ایسا انسان دنیوی معاملات کے صرف ظاہری پہلو ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر دور رس و دور بین ہوتی ہے۔ جب کہ وہ انسان جو یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا انتہائی سطحی نگاہ کا حامل ہو جاتا ہے اور اعمال کے ظاہری نتائج سے دھوکا کھا جاتا ہے اور اسی کو اپنے حق میں بہتر جان کر پسند کرتا ہے۔

کلا بل یحبون العاجلة و تذرون الأخرة (القیامہ: ۲۰-۲۱)

[ہرگز نہیں، تم تو فوری حاصل ہونے والے نتائج کو پسند کرتے ہو اور آخرت کے نتائج کو چھوڑ دیتے ہو۔]

اس ظاہر بینی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نگاہوں میں اشیاء کی اخلاقی قدروں کا معیار بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔ ایک مومن دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والا ہوتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا پورا پورا علم ہے کہ وہ تکلیف جو اس نے کسی نیکی کے کام کی وجہ سے اٹھائی وہ تکلیف تو بہر حال ختم ہو جائے گی البتہ اس نیکی کا اجر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ لذت جو اس نے کسی گناہ کے کام سے حاصل کی وہ لذت تو بالآخر ختم ہو جائے گی البتہ اس کا عذاب اس وقت تک بھگتنا پڑے گا جب تک کہ خدا چاہے۔ لہٰذا وہ یہ گھاٹے کا سودا کسی قیمت پر نہیں کرے گا اور اس عارضی دنیا میں اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھے گا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی جان سے گذر جانا وہ اس جنت کے عوض قبول کر لے گا جس کا اس کے رب نے اس سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ غزوہ احد[12] کا ایک واقعہ ہے کہ میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابیؓ نے آگے بڑھ کر پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو

کہاں ہوں گا؟ فرمایا جنت میں۔ وہ کھجور کھا رہے تھے، ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی۔

اعتقاد یوم آخر کا تیسرا زبردست فائدہ یہ ہے کہ اسلام اس عقیدہ کو اپنے اخلاقی نظام کی قوت نافذہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام یہ جتا دیتا ہے کہ ہر شخص کی برائی یا بھلائی کا تمام تر ریکارڈ روز جزا اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس دن اس کے اعضاء اور اعمال اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس دن نہ کسی کی اولاد و مال کام آئیں گے نہ کسی کی سفارش و رشوت قبول کی جائے گی بلکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیا جائے گا۔ یہ خیال قوت نافذہ کا کام کرتا ہے۔ یہ وہ پولیس اور عدالت ہے جس کا خوف انسان کے دل میں بٹھا دیا گیا ہے۔ یہ دنیا کی پولیس یا عدالت نہیں جس کی نگاہ یا گرفت سے انسان بچ سکتا ہے بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے اور یہ ایسی عدالت ہے جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

واتقو الله واعلموا انکم ملقوہ (البقرہ:۲۲۳)

[اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے۔]

اس طرح اسلام نے یوم آخر کے عقیدے کو اپنے ضابطہ اخلاق اور نظام شرعی کے لئے زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے والے اور شر و فساد سے بچنے کے لئے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنے بقا و استحکام کے لئے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھہرایا ہے۔

تشکیل تہذیب میں عقیدہ آخرت کا حصہ:

کائنات اور اس کائنات میں انسان جو زندگی گذارتا ہے نیز اس کائنات اور انسان کی تخلیق جس مقصد کے لئے کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی غیر مشروط و خالص اطاعت کی جائے۔ اس ضمن میں انسان کی صحیح راہنمائی کرنے کے لئے اللہ نے اپنی پہچان کرانے اور صحیح معرفت حاصل کرنے کے لئے انسان کو رسولوں کے ذریعہ توحید کا علم دیا جو انسان کو تمام تر فکری اساسیں مہیا کرتا ہے۔ پھر خدا کی منشاو مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اسوہ عقیدۃ رسالت سے حاصل ہوتا ہے جو انسان کو تمام تر عملی بنیادیں فراہم کرتا ہے اور یوں ایک تہذیب جنم لیتی ہے جسے ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ لیکن اس تہذیب کو نافذ کیسے کیا جائے؟ اس کی تنفیذ میں تصور توحید سے کسی حد تک اور تصور آخرت سے بڑی حد تک کام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ تصور انسان میں ایک زبردست محتسب کو جنم دیتا ہے جسے ہم اس کا ضمیر بھی کہہ سکتے ہیں جو اسے ان جگہوں پر بھی برائی کرنے سے روکتا ہے جہاں دنیاوی پولیس یا عدالت کی پہنچ نہیں ہوتی۔ بعض بظاہر معمولی اخلاقی معاملات میں بھی وہ ڈرتا رہتا ہے مثلاً ایک روزہ دار چاہے تو دنیا والوں سے چھپ کر کھا پی سکتا ہے لیکن وہ تنہائی میں بھی ایسا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا سے اور آخرت میں اس کی پکڑ سے ڈرتا ہے اور آخرت میں حاصل ہونے والی سعادت اسے دنیاوی تکلیف برداشت کرنے کا اہل بنادیتی ہے۔ اس طرح اسلامی تہذیب بجا طور پر اس بات کی دعویدار ہے کہ اس کا اپنا نظام فکر و عمل اور اپنی قوت نافذہ ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

1. المنجد، ص ۵۰۔
2. سیرۃ النبی، جلد ۵، ص ۶۳۵۔
3. اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۲۴۲۔
4. امیر علی، ص ۱۸۹۔
5. سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۷۱۵۔
6. اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۲۴۸-۲۴۹۔
7. سائنسدانوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ کائناتی نظام آہستہ آہستہ فنا اور انتشار کی طرف بڑھ رہا ہے گویا سائنس بھی کم از کم اس کے ابدی ہونے کی قائل ہے۔
8. سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۷۲۵۔
9. مومنین اپنے نیک اعمال اور تقویٰ کی وجہ سے جنت کے وارث بنائے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون سورۃ المومنون، سورۃ الزخرف، سورۃ الشعراء، سورۃ مریم اور سورۃ الاعراف وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے۔
10. سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۷۶۲ (بحوالہ ابن القیم، شفاء العلیل، مصر)۔
11. اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)
12. سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۸۵۹۔

چودھواں باب:

تہذیب اسلامی کی عملی صورتیں

(عبادات)

عبادت کا مادہ ''ع ب د'' ہے اور اس کے لغوی معنی ''غایت تذلل'' کے ہیں یعنی انتہائی عاجزی و درماندگی کا اظہار۔ عبادت کے عام معنی پرستش کے ہیں جو کسی کی بھی ہوسکتی ہے تاہم اصطلاح شریعت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی و اطاعت، اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکامات کو بجالانا عبادت ہے۔ عبادت اللہ تعالیٰ کا اس کے بے پایاں انعام کی وجہ سے بندے پر حق[1] ہے۔ خداوند تعالیٰ منعم ہے اور منعم کا شکریہ واجب ہوا کرتا ہے۔ عبادات انہی نعمتوں کے شکریہ کا نام ہے نیز یہ امر فطری طور سے بندے (مخلوق) کے وجدان میں موجود[2] ہے۔

عبادات کے سلسلہ میں مادہ پرست اذہان بہت کچھ شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ کو بندے کی اس عبادت و دعا کی کیا ضرورت ہے؟ یہ درست ہے کہ اللہ کی ذات ہماری عبادتوں سے بے نیاز ہے البتہ مخلوق خدا خود عبادت کی ضرورت مند ہے کیونکہ انسان فطرتاً اور خلقتاً کمزور اور ناقص پیدا کیا گیا ہے اسے زندگی میں ہزارہا موقعوں پر بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بے بسی کے ان لمحات میں وہ اپنی ہستی اور اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے رب کو پکارتا ہے اور اس سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ انبیاء تک نے نازک لمحات میں خدا سے دعا مانگی ہے۔[3] اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبادت انسان کی ضرورت ہے جو

اسے یک گونہ تسلی اور اطمینان قلب عطا کرتی ہے۔ جو لوگ عبادت کے قائل نہیں وہ نازک لمحات میں مایوس ہو کر بے آبرو اور بے توازن ہو جاتے ہیں۔

عبادت انسان کی صرف فطرت اور ضرورت ہی نہیں بلکہ تکمیل شخصیت اور توسیع صلاحیت کا باعث بھی ہے۔ عبادات کے ذریعہ ہی انسان معرفت کے درجہ کو پہنچ سکتا ہے۔[۹]

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدائے واحد کی عبادت کے طریقے بتائے اس وقت دنیا کی تقریباً تمام ہی اقوام اپنے اپنے خداؤں کی عبادت اپنے اپنے طریقوں سے کر رہی تھیں۔ اور اس ضمن میں شدید افراط و تفریط کا شکار تھیں۔ ایک طرف عیسائی تھے جو راہبانیت کی دشوار ترین اور جسم کش راہ اختیار کر کے جو کہ ان کے یہاں عبادت کا صحیح طریقہ تھا، عملی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ تو دوسری طرف یہود تھے جو اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کی وجہ سے سخت بدنام تھے۔ ان میں روحانیت نام کو نہ تھی ان کی عبادت محض یہ تھی کہ سبت کے دن عبادت کر کے اور دنیاوی کوئی کام نہ کر کے خدا کو خوش کریں۔ ایک طرف آتش پرست تھے جو آتش کدوں میں آگ کے آگے سربسجود تھے تو دوسری طرف بت پرست تھے جو سینکڑوں بتوں کی پوجا و پرستش میں مصروف تھے جو کہ ان کے حاجت روا تھے۔ غرض کہ دنیا کے تمام معلوم خطوں میں عبادت اور پرستش تو ہو رہی تھی لیکن وہ یہ حقیقی عبادت نہ تھی جس کا مطالبہ اپنا حق سمجھتے ہوئے خدا بندے سے کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلام اپنے ماننے والوں کو عبادت کا ایک سیدھا سادھا اور قابل قبول تصور دیتا ہے۔ وہ چند عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو ایک طرف تو فرض قرار دیتا ہے، لیکن ان فرائض کی ادائیگی کے بعد انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیتا بلکہ دوسری طرف انسان کو ان فرائض کی کسوٹی سے گزار کر اس کی پوری زندگی کو عبادت بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس مسلمان کا سونا جاگنا، کھانا پینا اور دیگر تمام دنیاوی معاملات عین عبادت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، یوں اسلام انسان سے ترک دنیا کا مطالبہ کیے بغیر اس کی پوری زندگی کو عبادت بنا دیتا ہے۔

صحابہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرد، ترک لذائذ اور ریاضت شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان

کو اس سے باز رکھا۔ قدامہ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں'' یہ سن کر دونوں اصحاب اپنے اپنے ارادوں سے باز رہے۔[5]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو کہ نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو انہیں بلا کر فرمایا ''اے عبداللہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ مہینے میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے۔''[6]

اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے تقشّف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی آپ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں۔ آپؐ نے ان کو بلا کر پوچھا ''کیوں عثمان تم میرے طریقے سے ہٹ گئے ہو؟'' عرض کی ''خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طالب ہوں۔'' فرمایا ''میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔''[7]

گویا کہ صرف نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا ہی عبادت نہیں ہے بلکہ دوسروں کے حقوق ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ یہ معتدل راستہ بتا کر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو عبادت کے معاملہ میں افراط و تفریط کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔

عبادت کی غرض و غایت حصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصل غرض ہے۔ نماز، روزہ اور دیگر تمام عبادتیں سب

اسی غرض کے حصول کی خاطر ہیں ۔اس بناء پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال واعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو سب عبادت ہیں ۔[8]

اس اعتبار سے ہم عبادت کو صرف دعا، نماز اور قربانی کے دائرے میں محدود نہیں کر سکتے بلکہ ہر وہ کام جو خدا کی رضا کے لئے اور حصول تقویٰ کی غرض سے کیا جائے، عبادت ہے چنانچہ بہت سے بظاہر خالص دنیاوی امور بھی عبادت بن جاتے ہیں مثلاً ''تمہارا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرادینا بھی صدقہ ہے۔'' یا ''راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔''

سنن ابی داؤد میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک دن آپؐ نے صحابہ سے فرمایا ''کیا میں تم کو نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمایئے۔آپؐ نے فرمایا ''وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔''

یہاں تک کہ اگر کسی شخص میں نیکی کے کام کی استطاعت نہ ہو تو اسے چاہئے کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرے۔ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو ہر شخص اپنے حق میں کر سکتا ہے۔[9]

اس طرح معمولی سے معمولی اور بظاہر دنیاوی امور کو بھی عبادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ ان امور سے مقصد خدا کی رضا حاصل کرنا ہو۔ جب کہ دوسری طرف بڑے سے بڑا کام اور عظیم سے عظیم نیکی بھی کوئی وزن نہیں رکھتی اگر اس میں تقویٰ کی جگہ ریا کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ چنانچہ وہ شخص جو لاکھوں روپے امدادی وخیراتی کاموں میں خرچ کرتا ہے تاکہ اس کی شہرت ہو تو یہ عبادت نہیں ریا کاری ہے لیکن محض خدا کی رضا کے لئے حصول تقویٰ کے لئے یا امید اجر و ثواب سے کسی ضرورت مند کو چند کوڑیاں بھی دی جائیں تو یہ عظیم نیکی شمار ہوتی ہے۔

ایک دن غریب ونادار صحابہ نے دربار رسالت میں شکایت کی ''یارسول اللہ دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے ۔ ہماری طرح وہ بھی نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں اس کے علاوہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی جس کو صدقہ کر سکو تمہارا سبحان اللہ اور الحمدللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقے سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا

ہے۔لوگوں نے کہا ''یارسول اللہ ﷺ وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے۔'' فرمایا ''اگر وہ ناجائز طریقے سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقے سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہیں ملے گا؟'' [10]

رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عبادت کے مفہوم کو زبردست وسعت دے کر پوری انسانی زندگی پر محیط کر دیا ہے اور خدا کے اس ارشاد سے کہ **وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون** (الذاریات:۵۶) [میں نے انسانوں اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔] مراد یہی عبادت ہے جس کو وسیع تر مفہوم میں لیا جاتا ہے۔رہ گئے وہ شرعی فرائض یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ تو یہ وہ عبادات ہیں جو انسان کو ذہنی طور پر آمادہ اور تیار کرتی ہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی عبادت میں ڈھال لے۔ اسی وجہ سے ان کو ارکان اسلام کہا گیا ہے۔جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔

❖

حواشی وحوالہ جات:

۱ حجۃ اللہ بالغہ، جلد ۱، ص ۱۷۹-۱۸۰۔ ۲ ایضاً۔

۳ دعا کو بہترین عبادت کہا گیا ہے۔ترمذی میں دعا کو عبادت کا مغز (الدعا مخ العبادۃ) کہا گیا ہے۔ نیز یہ کہ دعا سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی چیز زیادہ معزز نہیں۔

۴ محمد غزالی، کیمیائے سعادت، مترجم محمد سعید احمد نقشبندی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۳۔

۵ صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد ۲۔ ۶ ایضاً، جلد ۲، ص ۲۰۷۔

۷ ندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی، جلد پنجم، ص ۲۳، اسلام آباد (بحوالہ ابوداؤد)۔

۸ ایضاً، ص ۳۱۔ ۹ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد ۳، ص ۳۶۷۔

۱۰ سیرۃ النبی، جلد ۵، ص ۳۵ (بحوالہ امام بخاری، ادب المفرد)

❖

پندرھواں باب:

نماز

نماز کے لئے قرآن مجید میں ''صلوٰۃ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ نماز فارسی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں ''صلوٰۃ'' کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ''صلوٰۃ'' کا مادہ ''ص ل وٗ'' اور بعض کے نزدیک ''ص ل ی'' ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں دعا و تسبیح، استغفار، رحمت، ثنا، ترحم وغیرہ۔ لفظ صلوٰۃ جب اللہ تعالیٰ سے منسوب ہو تو اس کے معنی رحمت ہیں اور جب مخلوق یعنی ملائکہ اور جن وانس سے منسوب ہو تو اس کے معنی قیام اور رکوع و سجود کے ہیں اور جب پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں سے نسبت ہو تو اس کے معنی تسبیح کے ہوں گے۔ [1]

اسلامی اصطلاح میں صلوٰۃ اس مخصوص عبادت کا نام ہے جو ارکان اسلام میں سے ہے، اس کے حقیقی معنی تعظیم کے ہیں اور یہ مخصوص عبادت اللہ کی تعظیم کے لئے فرض کی گئی ہے۔

نماز کی حقیقت:

توحید کے بارے میں اللہ کی ذات وصفات اور کمالات واحسانات کا جو علم انبیاء علیم السلام کے توسط سے بندوں کو حاصل ہوتا ہے اس کو مان لینے اور اس پر ایمان لانے کا پہلا فطری اور قدرتی تقاضا یہ ہے کہ انسان اس اللہ کے حضور میں اپنی فدویت و بندگی اور محبت وشیفتگی کا اظہار کر کے اس کا قرب اور اس کے بے پایاں احسانات کا شکریہ ادا کر کے اس کی رحمت و رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ نماز کا اصل موضوع اور اس کی اصل غرض وغایت یہی ہے اور اس

میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ نماز ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو۔[۲]

قرآن مجید میں یہ لفظ تقریباً سو[۳] مرتبہ آیا ہے اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نماز اپنی عظمت شان اور مقتضائے عقل و فطرت ہونے کے لحاظ سے تمام عبادات میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور خدا شناس اور خدا پرست انسانوں میں سب سے زیادہ معروف مشہور اور تزکیہ نفس و تربیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ اسی لئے شریعت نے اس کی فضیلت، اس کے اوقات کی تعیین و تجدید اور اس کے شرائط و ارکان اور آداب و نوافل اور اس کی رخصتوں کے بیان کا جو اہتمام کیا ہے وہ کسی دوسری عبادت کے لئے نہیں کیا۔ اپنی خصوصیات و امتیازات کی وجہ سے نماز کو دین کا عظیم ترین شعار اور امتیازی نشان قرار دیا گیا ہے۔[۴]

شاہ ولی اللہ نماز کو بندے کا ایک تعظیمی فعل قرار دیتے ہیں یعنی انسان اپنی خاکساری و عاجزی اور پروردگار کی برتری و عزت کا خیال کر کے اس کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ چونکہ تمام لوگوں اور بہائم میں گردن اکڑانا اور سر بلند کرنا غرور تکبر کی علامت ہے اور سرنگوں ہونا نیازمندی و فروتنی کی علامت ہے اس اعتبار سے نماز تمام عبادات میں سب سے نمایاں ہے جس میں بندہ اپنے جسم کے سب سے بزرگ حصے (یعنی سر) کو زمین پر رگڑتا ہے۔[۵] یہ اپنے رب کی انتہائی تعظیم اور بندہ کا اپنی انتہائی درماندگی کا اظہار ہے اور یہ ادا خدا کو نہایت محبوب ہے۔

نماز کی فضیلت و اہمیت:

توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو رسول اللہ ﷺ کو ملا وہ نماز سے متعلق تھا۔ یہ وہ فرض عبادت ہے جو آغاز اسلام سے عائد کی گئی اور شب معراج میں اس کی باقاعدہ فرضیت کا حکم ملا۔[۶] جبکہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو منصب نبوت پر سرفراز فرمانے کے بعد ہی انہیں نماز کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ قرآن مجید میں اکثر موقعوں پر ''اقامت الصلوٰۃ''[۷] کی تاکید آئی ہے اور اسے اہل ایمان کی لازمی صفت بتایا گیا ہے۔ قرآن ان مسلمانوں کے لئے حقیقی کامیابی کی

بشارت دیتا ہے جنہوں نے پاکیزگی کے اصول اپنائے اور نماز پڑھی۔

قد افلح من تزکیٰ و ذکر اسم ربه فصلیٰ (الاعلیٰ:۱۴-۱۵)

[کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی۔]

نیز "جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم رکھی ہے۔ یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔" (الاعراف:۱۷۰)

حضرت نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا "کون سا عمل بہترین اور افضل ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا "نماز وقت مقررہ پر۔"

نماز کی فضیلت وعظمت وجلالت قدر کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا "بتاؤ اگر کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس نہر میں نہاتا ہو تو۔ پھر بھی اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہ جائے گا؟" صحابہ نے جواب دیا کہ اس کے بدن پر کچھ میل باقی نہ رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی کیفیت نماز کی ہے جس طرح نہانے سے بدن کی کثافت دور ہو جاتی ہے اسی طرح نماز پڑھنے سے روح کی کثافت وگندی دور ہو جاتی ہے۔"[8]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بارے میں گفتگو فرماتے ہوئے اشارہ کیا کہ جو بندہ نماز اہتمام سے ادا کرے گا تو قیام میں اس کے واسطے نور ہوگی، دلیل ہوگی اور نجات کا ذریعہ بنے گی اور جس نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کیا وہ نہ اس کے واسطے نور بنے گی نہ برہان اور نہ ذریعہ نجات اور وہ بد بخت قیامت میں قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔"[9]

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ ایک دن سردی کے ایام میں باہر تشریف لے گئے۔ درختوں کے پتے (خزاں کے سبب) جھڑ رہے تھے آپ نے ایک درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا تو ایک دم اس کے پتے جھڑنے لگے۔ پھر حضور نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا "اے

ابوذر" میں نے عرض کیا "حاضر ہوں یا رسول اللہ ﷺ۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا "جب مومن بندہ خالص اللہ کے لئے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ان پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں۔" (مسند احمد)

نماز اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان، جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کی اہمیت پر خاص طور سے زور دیتے ہوئے اسے دین کا ستون قرار دیا۔ جس طرح ستون کے گرنے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح ترک نماز سے دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کفر اور ایمان کے مابین نماز ہی کو فرق قرار دیتے تھے۔[10]

بین العبدو بین الکفر ترک الصلوٰۃ (صحیح مسلم)

[یعنی بندہ اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے۔]

قرآن نماز ادا کرنے میں سستی کاہلی کو نفاق کی علامت قرار دیتا ہے، سورۃ التوبہ میں فاسقین کے بارے میں کہا ہے

"یہ لوگ نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں۔" (التوبہ:۵۴)

یا جیسے سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے۔

"جب یہ (منافق) نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔" (النساء:۱۴۲)

نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اقامت الصلوٰۃ اسلامی حکومت کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں سے ایک ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔" (الحج:۴۱)

اولی الامر کی اطاعت اسی وقت تک مسلمانوں پر فرض ہے جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ اور ترک صلوٰۃ وہ سبب ہے کہ ان کے خلاف جدو جہد درست ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں

کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر، تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں! جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔'' (صحیح مسلم)

یعنی ترک نماز علامت ہوگی جس سے صریح طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعت خدا اور رسول اللہ ﷺ سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جد و جہد کرنا درست ہوگا۔ اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ''تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لئے مبغوض ہوں اور تم ان کے لئے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔'' صحابہ کرام نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟'' فرمایا ''نہیں جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔'' (صحیح مسلم)

گویا کہ حکام اور اولی الامر کی اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ نماز کا نظام قائم رکھیں۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسی حکومت اور حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہو جائے گا۔

نماز کے فوائد و اثرات:

رسول اللہ ﷺ نے اخلاق و تمدن اور معاشرت کی جتنی اصلاحات کیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں تھا، چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی عبادت ہے مگر اس کے اثرات و برکات، فیوض و فوائد کا سلسلہ لا متناہی

ہے۔ اسلام نے نماز کے ذریعہ انسان سازی کا کام لیا ہے وہ اس طرح کہ تنہا یہ ہی عبادت انسان کے جسم اور اس کے نفس کی تعمیر کے لئے کافی ہے۔

تعمیر جسم:

اولاً......نماز سے مسلمانوں میں ستر پوشی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے تصور حیا کی نگہداشت کے لئے ستر پوشی ایک ضروری چیز ہے۔ عرب کے بدو اس بات سے اس طرح ناواقف تھے جس طرح آج کے مغربی ممالک کے بیشتر باشندے۔ قرآن کہتا ہے۔

خذوا زینتکم عند کل مسجد (الاعراف:۳۱)

[ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔]

اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ مرتبہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا۔ اس چیز نے انسان کو ظاہری وقار اور حیا عطا کی۔

ثانیاً......نماز انسان میں طہارت و پاکیزگی کی عادت پیدا کرتی ہے۔ نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کا جسم، اس کا لباس اور اس کی جائے نماز نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو۔ نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ہے۔ اس وضو کے ذریعہ انسان اپنے جسم کے اعضاء کو دھو کر صاف کرتا ہے، ناک، کان میں پانی ڈال کر اس کی گندگی کو دور کرتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کی اتنی تاکید فرمائی کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا ''اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو (مسواک کو) ضروری قرار دیتا۔'' اسی طرح ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے قبل غسل کو واجب کیا گیا ہے۔[۱۱] الغرض طہارت کے وہ آداب نماز کے حوالے سے اسلام نے اپنے پیروکاروں کو چودہ سو سال قبل سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں۔

جسم و لباس کی پاکیزگی و طہارت سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سے

انسان کو روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے جسم کو ظاہری کثافتوں سے پاک کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کے نتیجے میں وہ اپنی روح کو بھی گناہوں کی کثافتوں سے صاف رکھنے کی فکر کرے گا......۔ دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ یہ پاکیزگی وصفائی صحت کی برقراری کے لئے ضروری ہے۔ طب اور حفظان صحت کے اصولوں میں سے ایک زریں ترین اصول جسم ولباس کی طہارت و پاکیزگی ہے۔

تعمیر سیرت:

جسمانی طہارت و نظافت کے ساتھ ساتھ نماز سے مطلوبہ سیرت سازی کا کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ پہلے لکھا گیا نماز دراصل اللہ کی بے پایاں نعمتوں کا اعتراف اور اس کا اظہار تشکر ہے جو ایک مسلمان بندہ اپنے دل وزبان سے ادا کرتا ہے۔ تاکہ نفس وروح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و بزرگی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے اگر نماز کو اس طرح ادا کیا جائے جیسا کہ اس کی ادائیگی کا حق ہے تو یہ انسانوں کو برائیوں سے روکنے والی اور انہیں انسانیت کی معراج تک لے جانے والی عبادت ہے۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر نمازی کی حقیقت دریافت کی۔ آپؐ نے اس کی تشریح فرمائی۔ سائل نے پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ احسان کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔'' [۱۲]

اس احسان کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر زبردست نفسیاتی اثرات مرتب کرتی ہے اور اس کے اخلاق وکردار کی موثر تعمیر کرتی ہے۔

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء و المنکر (العنکبوت: ۴۵)

[یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔]

تقریباً تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق رہا ہے۔ اسلام یہ مقصد بہت حد تک

نماز سے حاصل کرتا ہے کیونکہ تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایسی عبادت ہے جو نفس کو زیادہ سے زیادہ بیدار رکھ سکتی ہے۔ وہ انسان کو اس کے مقصد حیات کی بار بار یاد دہانی کراتی ہے اور دن میں پانچ بار ایک مسلمان کو خدا کے حضور لے جاتی ہے۔ دن میں کم از کم پانچ بار انسان کو اس کی حقیقت یاد دلاتی ہے، اسے خدا کی بے پایاں نعمتوں کا احساس کراتی ہے۔ اس میں عاجزی و فروتنی پیدا کرتی ہے۔ نماز کی اسی خصوصیت کی بناء پر قرآن اسے ''ذکر'' سے تعبیر کرتا ہے، جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔

نماز انسان میں فرض شناسی کی اعلیٰ قدر پیدا کرتی ہے۔ نماز کا وقت ایک مسلمان پر مختلف حالتوں میں آتا ہے۔ فجر کی نماز کے وقت شدید سردیوں میں لحاف یا کمبل سے نکلنا۔ ظہر کے وقت کاروباری مصروفیتوں کو درمیان میں چھوڑنا۔ عصر و مغرب کے وقت اپنی دلچسپ تفریحات کے درمیان وقت نکالنا اور عشاء کے وقت اپنے آرام کو موخر کرنا دراصل ایک طرف مسلمانوں کی فرض شناسی کی دلیل ہے تو دوسری طرف ان میں زبردست ضبط نفس کی خصوصیت کو اجاگر کرتی ہے۔ جبکہ نماز چھوڑ کر آدمی خواہشات نفس کا پیرو بن کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

> ''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر لی۔ لہٰذا عنقریب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔'' (مریم:۵۹)

نماز مسلمانوں کے لئے مصائب میں سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ''ہاں خدا کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں۔'' (رعد: ۲۸) مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت میں نماز انتہائی تسکین قلب کا باعث بنتی ہے اور قرآن مسلمانوں میں نماز کے ذریعہ یہ صفت پیدا کرتا ہے کہ وہ مصائب میں نماز سے استقلال حاصل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اشاعت اسلام کے سلسلہ میں جس قدر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ان سب کا ''علاج'' قرآن، نماز اور بندگی رب پر استقامت سے قائم رہنے ہی کو قرار دیتا ہے۔

نماز کے یہ وہ فوائد تھے جو انفرادی طور سے انسانوں پر مرتب ہوتے ہیں ''نظام صلوٰۃ''

کے دوررس اجتماعی فوائد بھی ہیں۔ جس سے اسلامی معاشرہ برکات و فیوض سے مالا مال ہوسکتا ہے۔

اولاً...... مسلمان مردوں کے لئے پانچ وقت نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رو سے ہر شخص نماز پڑھ کر اپنے فرض سے سبکدوش تو ہوسکتا ہے مگر وہ گناہ گار ہوگا اگر قصداً بلا عذر مسجد میں حاضر ہوکر جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے مسجد میں مسلمانوں کا پانچ وقت اجتماع مسلمانوں کے نظام اجتماعی کی بنیاد ہے۔ اذان کی آواز سنتے ہی تمام کام چھوڑ کر مسجد کی طرف دوڑ جانا اجتماعی طور پر مسلمانوں کو اطاعت و فرمانبرداری کی تربیت دیتا ہے۔

ثانیاً...... پھر مسجد میں جمع ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اہل محلّہ کو ایک دوسرے سے ملنے اور ایک دوسرے کی خبر گیری کا موقع مل جاتا ہے۔ آپس میں بے گانگی ختم ہوتی ہے، میل و محبت بڑھتا ہے۔ ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ یہ ملاقات مسلمانوں میں کمال درجہ کی محبت اور انسیت پیدا کر کے انہیں جتھ بندیوں، فرقہ آرائیوں سے روکنے کا سبب بنتی ہے۔

”خدا سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو۔ اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہوگئے۔“ (الروم:۳۱)

ثالثاً...... اسی طرح نماز با جماعت مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غم خواری کا بھی ذریعہ بنتی ہے جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور امراء اپنی آنکھوں سے غرباء کی کسمپرسی دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

عہد رسالت میں اصحاب صفہ کا گروہ جو کہ مسجد نبوی میں رہتا تھا سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد نبوی میں لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا۔ اکثر صحابہ اور خود رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوکر ان لوگوں کو اپنے ساتھ لاتے اور گھروں میں کھانا کھلاتے۔ مساجد اب بھی خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں۔

رابعاً...... مسجد میں صف بندی ایک طرف مسلمانوں میں مساوات اور ایک طرح کی

معاشرتی جمہوریت (Social Democracy) قائم کرتی ہے۔تو دوسری طرف بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتی ہے۔ مسجد میں ہر انسان مساوی الحیثیت ہوتا ہے۔خواہ وہ گورنر ہو یا جاروب کش۔ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ ہوسکتا ہے جاروب کش اگلی صف میں کھڑا ہو۔ یوں دن میں پانچ بار معاشرہ کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے اور بڑوں کے دماغوں سے کبریائی کا زعم نکالا جاتا ہے اور کمزوروں اور غریبوں کے ذہنوں سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مسجد میں یہ صف بندی طبقاتی امتیازات کو مٹاتی اور مساوات کو جنم دیتی ہے۔

خامساً ...... نماز میں پڑھی جانے والی دعائیں بھی اجتماعی نوعیت کی ہیں۔ نماز کی دعاؤں میں کہیں صیغہ واحد استعمال نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ جمع کا صیغہ استعمال کر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ اسے صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے فکرمند ہو کر مانگنا چاہئے۔ یہ چیز دماغوں سے انفرادیت کی خو نکال کر اجتماعی ذہنیت پیدا کرتی ہے اور معاشرے کے تمام افراد میں ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو فروغ دیتی ہے۔

سادساً ...... نماز باجماعت امام کے بغیر نہیں ہوسکتی اگر دو افراد بھی فرض نماز ایک ساتھ پڑھیں تو ان کے لئے بھی لازم ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی۔ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ نماز پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی۔ جماعت میں امام اور مقتدیوں کے تعلق میں ایک ایک بات انتہائی معنی خیز ہے اس سے دراصل ہر مسلمان کو قیادت (Leadership) اور اتباع قیادت (Followership) کی مکمل تربیت دی جاتی ہے۔ نماز باجماعت کے ذریعہ ایک طرف مسلمانوں کو اطاعت امیر کی تربیت دی جاتی ہے تو دوسری طرف انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ کیسے شخص کو امیر یا امام بنانا چاہئے۔ کس حد تک اس کی اطاعت کرنی چاہئے؟ اگر وہ غلطی کرے تو کس حد تک اس کی پیروی کرنی چاہئے؟ کہاں پہنچ کر ٹوکنا ضروری ہو جاتا ہے اور کس موقع پر اطاعت امام سے انحراف کیا جاسکتا ہے؟ پھر یہ معاملہ صرف مسجد تک ہی نہیں ہے۔ مسجد کو مملکت اور امام کو سربراہ مملکت پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

امام کے انتخاب کے سلسلہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے شخص کو امام مقرر کریں جو پرہیزگار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو، سن رسیدہ ہو اور ایسے شخص کو امام نہیں بنانا چاہئے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ تاہم ان صفات میں ''علم'' کو تقدم حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔'' [۱۴]

امام کی اطاعت کا سختی سے حکم دیا گیا ہے اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت ممنوع ہے۔ معمولی غلطی کی صورت میں امام کو ٹوکا جا سکتا ہے اور صریح غلطی، صریح معصیت یا کفر و شرک کی صورت میں اسے درجہ امامت سے ہٹایا جا سکتا ہے بعینہٖ یہی صورتحال بڑے پیمانے پر قوم اور اس کے سربراہ کے تعلق کا بھی ہے۔ جب تک سربراہ مملکت اسلامی قوانین و نظریات کے تحت کام کرے گا اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ فروعی معاملات میں غلطیوں کی صورت میں بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کی اطاعت پر قائم رہیں۔ البتہ اس کی غلطیوں کی نشاندہی ضرور کریں۔ مگر جب امیر اسلامی حدود کو پامال کرے تو پھر مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔

الغرض مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم ہے۔ نماز باجماعت مسلمانوں کو نظم و ضبط، اطاعت و فرمان برداری، مساوات و اخوت اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے۔ نماز کے انہی انفرادی و اجتماعی فوائد کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ نماز مسلمانوں کا قومی شعار اور اسلام کا رکن اعظم ہے۔ جس کے سہارے اسلام کی عمارت قائم ہے۔

❖

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ، جلد ۵، ص ۱۷۹، دانشگاہ پنجاب، لاہور (بحوالہ لسان العرب)۔

۲۔ حوالہ کے لئے دیکھئے سورۃ مریم: ۳۱، ۵۵۔ سورۃ ابراہیم: ۳۷۔ سورۃ ہود: ۸۷۔ سورۃ الانبیاء: ۷۳۔ سورۃ طہ: ۱۴۔ سورۃ یونس: ۸۷۔ سورۃ آل عمران: ۴، ۵۔ سورۃ الحج: ۴۔ سورۃ البقرۃ: ۴۳، ۸۳، کے علاوہ سورۃ لقمان اور سورۃ المائدہ۔

۳۔ محمد فواد عبدالباقی، **المعجم المفهرس**، ۴۱۳-۴۱۴۔

۴۔ شاہ ولی اللہ، **حجة الله البالغه**۔

۵۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۱۹۳۔

۶۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سورۃ بنی اسرائیل، خصوصاً آیت ۷۸۔

۷۔ ''اقامت صلوٰۃ'' کے ایک معنی تو وہ ہیں جو سیّد سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد پنجم میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اقامت صلوٰۃ کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب وارکان وسنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال اور باطنی خضوع وخشوع ضروری ہے۔ جبکہ دوسری طرف مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ''اقامت صلوٰۃ'' سے مراد نماز باجماعت کو قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ ایک جامع اصطلاح ہے اس کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر باقاعدہ نماز کا نظام قائم کیا جائے۔ اگر کسی بستی میں ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو لیکن جماعت کے ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کا انتظام نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں نماز قائم کی جارہی ہے۔ (دیکھئے **تفهیم القرآن**، جلد اوّل، ص ۵۰-۵۱)

۸۔ امام بخاری، **صحیح بخاری**، جلد اوّل، ص ۲۶۳۔

۹۔ نعمانی، مولانا محمد منظور، **معارف الحدیث**، جلد سوئم، ص ۱۱۲ پر یہ حدیث **مسند احمد**، **دارمی** اور **شعب الایمان** بیہقی کے حوالے سے درج ہے۔

۱۰۔ قرآن مجید میں سورۃ روم کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے **و اقیموا الصلوٰۃ ولا تکونو**

من المشرکین. یعنی [نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔] گویا قرآن و سنت کے حوالے سے ترک نماز شرک اور کفر ہے۔ اس ضمن میں ائمہ کے دو مکاتب فکر ہیں۔ امام احمد بن حنبل کا خیال ہے کہ نماز چھوڑ دینے سے آدمی قطعاً کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نہ تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ جبکہ دوسرے اکثر ائمہ کی رائے یہ ہے کہ ترک نماز اگرچہ ایک کافرانہ عمل ہے جس کے عوض وہ دنیا اور آخرت میں سخت ترین سزاؤں کا مستحق ہے لیکن اس پر مرتد کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ ان حضرات کے نزدیک ترک نماز کو شرک یا کفر کہنے کا مطلب کافرانہ عمل ہے اور گناہ کی انتہائی شدت ظاہر کرنے کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس طرح کسی مضر غذا یا دوا کے لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ بالکل زہر ہے۔

۱۱۔ صحیح بخاری، جلد اول، ص ۳۷۰-۳۷۱، کتاب الجمعہ۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵، کتاب الایمان۔

۱۳۔ الحجر: ۹۸-۹۹۔

۱۴۔ ندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی، جلد پنجم، ص ۱۳۹۔

سولہواں باب:

زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام کے اراکین خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے۔اس کا مادہ ''زک و'' ہے۔ اس کے لغوی معنی بڑھنے، پھلنے پھولنے اور نمو نے پانے کے ہیں۔زکوٰۃ کے دوسرے لغوی معنی طہارت و برکات کے بھی ہیں۔شریعت میں اس سے مراد شرائط مخصوصہ کے ساتھ مال کے اس حصے کو جو حق الٰہی کے طور پر (لازماً) نکال کر مستحقین کو دیا جاتا ہے، زکوٰۃ کہتے ہیں۔اور زکوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس سے مال میں نمو اور برکت کی امید ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کو ٹیکس نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے عبادت ہے۔ایک ایسی افضل عبادت جس کا درجہ ایک اعتبار سے نماز کے برابر ہی ہے۔قرآن پاک میں زکوٰۃ کے بارے میں بتیس (۳۲) آیات میں تاکید آئی ہے جن میں سے چھبیس (۲۶) مقامات [۱] پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔جس کی وجہ سے علماء اسے نماز کی ہم پلہ عبادت قرار دیتے ہیں۔اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ احکام دین کی اصولی تقسیم دو ہی طرح سے کی جاسکتی ہے۔ایک وہ احکام جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور دوسرے وہ احکام جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔نماز حقوق اللہ اور زکوٰۃ حقوق العباد کے تقاضوں کو پورا کرنے والی عبادات ہیں اس اعتبار سے دونوں ہم پلہ ہیں۔

زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ بھی تمام الہامی شریعتوں کا خاص رکن رہی ہے جیسا کہ قرآن مجید کا دعویٰ [۲] ہے۔ یہ اور

بات ہے کہ مختلف شریعتوں کے لئے اس کے تفصیلی احکامات میں فرق رہا ہے۔

نماز اور دیگر فرائض کی طرح زکوٰۃ کے احکامات بھی تدریجی طور پر نافذ کئے گئے۔ مکی زندگی میں پہلے صدقات (انفاق فی سبیل اللہ) کی طرف رغبت دلائی گئی تاہم فرضیت کا حکم نہیں تھا، پھر مدینہ منورہ میں آ کر جب مسلمانوں کے معاشی مسائل کسی حد تک حل ہوئے تو ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ یعنی یہ سال میں ایک دن عید کی نماز سے قبل ہر مسلمان سیر، سوا سیر غلہ راہ خدا میں خیرات کرے تا کہ غریب کے لئے بھی عید کی خوشیوں کا سامان ہو سکے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔

"وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ اے پیغمبر کہہ دو! جو کچھ تمہاری ضرورت سے بچ رہے۔" (البقرۃ:۲۱۹)

یہ سب زکوٰۃ کی فرضیت کی راہ میں اسلام کی تدریجی مراحل تھے۔ اس طرح سے اسلام اپنے ماننے والوں کے دلوں سے مال کی محبت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد سن ۸ھ میں (فتح مکہ کے بعد) "زکوٰۃ" مسلمانوں پر فرض قرار دی گئی۔ اس کے اگلے سال ۹ھ میں زکوٰۃ کے بیشتر احکام وقوانین مرتب ہوئے۔ اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں عمال کا تقرر ہوا۔

زکوٰۃ نقدی، سونے چاندی، پیداوار اور جانوروں پر سال میں ایک بار وصول کی جاتی ہے۔ وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں، حسب ذیل ہے۔

نام	اس سے کم تعداد پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں (ایک وسق وہ بوجھ ہے جو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو)
اونٹ	پانچ عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
گائے، بیل، بھینس	تیس عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
بھیڑ بکری	چالیس عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں

سونا	بیس مثقال (موجودہ حساب سے سات تولہ سونا اور ۵۲ تولہ چاندی)
چاندی	۵۲ تولہ سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس خاکہ میں بیان کیے گئے اعداد و شمار سے زیادہ کی دولت کو اسلام سرمایہ سمجھتا ہے اور ایک سال اس حالت پر گذر جانے کی صورت میں اس سرمایہ کے مالک سے اس کی دولت کا مخصوص حصہ زکوٰۃ کے نام سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کراتا ہے جو اسی معاشرے کے ضرورت مند افراد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت میں زکوٰۃ انفرادی طور پر صرف نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کا بیت المال میں داخل کرانا ضروری ہے۔ دراصل زکوٰۃ مسلمانوں کے اجتماعی نظام کا ایک خاص اور اہم مالی جزو ہے اسی لئے اس کے وصول کرنے اور خرچ کرنے کا حقیقی اور اصولی طریقہ حکومت کے نظم و انتظام کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اعمال کے ذریعہ سے زکوٰۃ وصول کرے، بیت المال میں داخل کرے اور صحیح مصارف میں خرچ کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فرمان ہے کہ ''زکوٰۃ امراء کو دو۔'' ایک شخص نے کہا کہ ''امراء و خلفاء تو اس کو صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتے۔'' آپ نے جواب دیا ''اس کے بعد بھی انہی کو ادا کرو۔'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا ''جب تک خلفاء نماز ادا کرتے رہیں تم انہی کو زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔'' [۴] ابو صالح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ یہ حاکم جو بدعنوانیاں کر رہے ہیں آپ کے پیش نظر ہیں، کیا اس حالت میں بھی ہم انہی کو زکوٰۃ ادا کریں؟ سب نے متفقہ آواز سے کہا کہ ضرور ان ہی کو ادا کرو [۵] (اس لئے کہ اجتماعی زندگی کے لئے یہی ضروری ہے)۔

قرآن مجید میں سورۃ التوبہ میں زکوٰۃ کے مصارف واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

''یہ صدقات تو دراصل فقیروں، مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو

نیز وہ گردنوں کو چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔'' (التوبہ: ٦٠)

اس کی تفصیل یہ ہے:

١۔ فقراء کے زمرہ میں ہر وہ شخص آجاتا ہے جو اپنی معیشت کے لئے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لئے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں۔

٢۔ مسکنت کے لفظ ٦ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہوم شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے ''مسکین وہ ہے وہ اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔'' ٧ گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

٣۔ چونکہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے لہٰذا وہ لوگ جو زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے، انہیں تقسیم کرنے اور ان کا حساب کتاب رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے مقرر کیے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقراء مساکین کے زمرے میں نہ آتے ہوں، ان کی تنخواہیں اس مد سے دی جاسکتی ہیں۔ ٨

٤۔ تالیف قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوش و عداوت کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہو، جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انہیں توڑا جائے تو مسلمانوں کے لئے مددگار بن سکتے ہوں۔ یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے، اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطایات دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار یا کم

از کم بے ضرر دشمن بنالیا جائے۔[9]

اس امر میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی یہ مد باقی ہے یا ساقط ہوگئی۔ اس ضمن میں حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا خیال یہ ہے کہ اسلام کے طاقت والے زمانے سے یعنی حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانے سے یہ مد ساقط ہوگئی۔ کیونکہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ گذر گیا۔ جب کہ بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک مولفۃ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔ یہی دوسری رائے زیادہ حقیقت پسندانہ اور قابل قبول ہے۔

۵۔ غلاموں کو ان کے طوق غلامی سے نجات دلانے کے لئے زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے باالفاظ دیگر ''مکاتبت'' کی رقم مہیا کرنے میں غلام کی مدد زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے۔

۶۔ زکوٰۃ کی رقم ایسے قرض داروں پر بھی خرچ کی جاسکتی ہے جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکادیں تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال بچتا ہو البتہ جو شخص بداعمالیوں، فضول خرچیوں اور عیاشیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضدار بنالے اس کی زکوٰۃ کی مد سے اس وقت تک مدد نہیں کی جانی چاہئے جب تک کہ وہ تائب نہ ہوجائے۔

۷۔ ''فی سبیل اللہ'' ایک وسیع اصطلاح ہے۔ محدود معنوں میں اس سے مراد قتال اور وسیع معنوں میں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ دراصل قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس ضمن کی تمام کوششوں پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلہ میں ہو خواہ قتال کے آخری مرحلے میں۔

۸۔ وہ مسافر جنہیں دوران سفر مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مالی اعانت زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے خواہ وہ مسافر اپنے گھر میں غنی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر حالت سفر میں وہ مدد کا محتاج ہوجائے تو اسلامی حکومت کو اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے مسافرت میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔

زکوٰۃ کا ہمہ گیر نظام نافذ کرنے سے دراصل اسلام کچھ مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ مقاصد شاہ ولی اللہ[1] کے نزدیک دو ہیں۔

۱۔ تزکیہ نفس (انفرادی تہذیب نفس)

۲۔ مدنی واجتماعی حاجات کا انسداد (اجتماعی اقتصادی فلاح وبہبود)

جہاں تک انفرادی تہذیب نفس کا تعلق ہے تو زکوٰۃ کے معنی بھی یہی ہیں جیسا کہ ابتداء میں بتایا گیا کہ زکوٰۃ کے لفظی معنی ''پاکی'' اور صفائی'' کے ہیں جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ زکوٰۃ نکالنے سے باقی مال پاک وصاف ہوجاتا ہے۔ اور ایک دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ انسانی نفس کو پاکی نصیب ہوتی ہے اور اس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ دل کی یہی پاکی، روح کی یہی صفائی، نفس کی یہی طہارت مذہبوں کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔

انسانوں کی بہت سی روحانی اور نفسانی بیماریوں کی وجہ حب مال ہے۔ مال کی محبت، بخل، خودغرضی، عداوتوں، نفرتوں اور بداخلاقیوں کو جنم دیتی ہے۔ اکثر لڑائی جھگڑے بخل اور حرص پر ہی مبنی ہوتے ہیں ان بداخلاقیوں کے انسداد کا بہترین علاج ''انفاق'' و''سخاوت'' میں ہے جس سے بخل کا خاتمہ ہوتا ہے۔ خودغرضی کی جگہ الفت ومحبت جنم لیتی ہے اور انسان حسن معاملات کی طرف مائل ہوتا ہے اور اسی کا نام تہذیب نفس ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

وسیجنبھا الا تقی الذی یوتی مالہ یتزکی (اللیل: ۱۷-۱۸)

[اس شخص کو جہنم سے دور رکھا جائے گا خدا سے ڈرنے والا ہو اور جو اپنے تزکیہ کی خاطر دولت دوسروں کو دیتا ہو۔]

گویا صدقہ اور زکوٰۃ کی اصل غایت دل کی پاکیزگی اور نفس کا تزکیہ ہے لیکن یہ بنیادی مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک زکوٰۃ نکالتے ہوئے ان بنیادی باتوں کا بھی خیال نہ رکھا جائے جو مختلف مقامات پر قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور جن کا ضروری خلاصہ[11] یہ ہے۔

۱۔ سب سے اہم اور بنیادی تو یہ ہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت صرف رضائے الٰہی کی طلب ہی اس کا محرک ہو۔

ما تنفقون الا ابتغاء وجه الله (البقرہ:۲۷۲)

[تم اپنی دولت صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہو۔]

۲۔ دوسری بات یہ کہ جو زکوٰۃ دی جائے وہ خود پاک کمائی سے ہو اور اس میں حرام کا شائبہ تک نہ ہو۔

یا ایھا الذین امنو انفقوا من طیبت ما کسبتم (البقرہ:۲۶۷)

[اے ایمان والو! اپنی پاک کمائی میں سے خرچ کرو۔]

اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا ''لوگو! اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک مال ہی کا صدقہ قبول فرماتا ہے۔'' (مسلم، کتاب الزکوٰۃ)

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ میں جو چیز دی جائے وہ عمدہ قسم کی ہو۔ ردی اور خراب چیزوں کو اس مقصد کے لئے نہ نکالا جائے۔

و لا تیمموا الخبیث منه تنفقون (البقرہ:۲۶۷)

[اور خراب مال کو نہ ڈھونڈو اسی میں سے خرچ کرنے کے لئے۔]

۴۔ چوتھی بات یہ کہ زکوٰۃ لینے والے پر کوئی احسان نہ رکھا جائے۔ نہ اس کی دل آزاری کی جائے اور نہ اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جائے۔

یا ایھا الذین امنو لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی کالذی ینفق ماله رئا الناس (البقرہ:۲۶۴)

[اے ایمان والو! اپنے صدقے احسان جتلا کر اور دل آزاریاں کر کے ضائع نہ کر دیا کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے۔]

مسلم کی حدیث ہے کہ قیامت کے دن تین آدمی جہنم میں سب سے پہلے جائیں گے۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جس نے دنیا میں اس لئے خیرات کی ہوگی کہ لوگ اسے بڑا داتا اور غریب نواز کہیں۔

یہ ہیں وہ خاص خاص ہدایتیں جن پر عمل کرنے کے بعد ہی زکوٰۃ دل کی پاکیزگی اور

تزکیے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ان ہدایات کو دیکھ کر ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت نفس کے شدید احتساب کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو نفس کی بے شمار آفتوں سے گھری ہوئی ہے۔ مال کی محبت انسان کو خدا اور آخرت سے بے گانہ بنا کر رکھ دیتی ہے جیسا کہ رسول اللہ کے فرمان سے ظاہر ہے ''دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔'' (مشکوٰۃ) دنیا کی محبت کئی شکلوں میں آسکتی ہے لیکن اس کی سب سے معروف اور خطرناک شکل دولت کی محبت ہے رسول اللہ ﷺ کا ایک اور فرمان ہے ''میری امت کا سب سے بڑا فتنہ مال ہے۔'' (ترمذی)

دوسری طرف زکوٰۃ مدنی و اجتماعی حاجات کے انسداد کا بہترین علاج ہے۔ زکوٰۃ کا یہ ایک خالص اجتماعی و معاشی پہلو ہے کہ معاشرے کے نادار افراد کی ضروریات پوری کی جاتی رہیں تاکہ کم از کم ان کی انتہائی اہم اور بنیادی ضرردیات پوری ہوتی رہیں اور وہ امراء کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت وخواری سے بچ سکیں اور حکومت برے حالات میں ان کی پوری کفالت کر سکے۔ اسلامی حکومت اپنی یہ ذمہ داری بہ طریق احسن اسی وقت پوری کر سکتی ہے جب منجملہ دیگر ذرائع آمدنی کے حکومت کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ اہل ثروت سے زکوٰۃ کی شکل میں وصول ہو۔

معاشرے کے متمول افراد پر زکوٰۃ فرض ہی اس لئے کی گئی ہے کہ یہ معاشرے کے نادار اور ضرورت مندوں کا اصل ''حق'' ہے۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل و المحروم (المعارج:۲۴-۲۵)

[جن کے مالوں میں سائلوں اور تہی دستوں کا مقررہ حق ہوتا ہے۔]

اور انہیں ان کا یہ حق دلانے کے لئے اسلامی حکومت قتال بھی کر سکتی ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا۔ ایسا اس لئے ضروری ہے کیونکہ زکوٰۃ دراصل معاشی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جس کے ذریعہ ملک وملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے۔ انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک بنایا جاتا ہے۔ اور مذموم سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ سورۃ التوبہ میں ارشاد ربانی ہے۔

''اے ایمان والو! اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مال

کو ناحق کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوسونے چاندی کو خزانہ بناتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو خوش خبری سنا دو دردناک عذاب کی۔'' (التوبہ:۳۴)

ایسے سرمایہ دار جو دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں قرآن میں کئی جگہ دردناک عذاب کی بشارت دی گئی ہے۔قرآن چاہتا ہے کہ دولت سمٹنے کے بجائے گردش میں رہے جو کہ صحت مند معاشی نظام کے لئے اشد ضروری ہے اور زکوٰۃ سے اس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے جواب میں اپنے نامۂ مبارک میں لکھا تھا۔

''تو خذ اغنیاء هم فترد وا الی فقرائهم''

[زکوٰۃ ان کے مالداروں سے وصول کرو اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کردو۔]

اس طرح زکوٰۃ کے ذریعہ اسلام سرمایہ داری کو ختم اور سرمایہ کاری ک فروغ دینا چاہتا ہے۔آج جو ممالک معاشی پسماندگی کا شکار ہیں اس کی اصل وجہ دولت کی غلط تقسیم، سرمایہ داری اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ہے۔زکوٰۃ کے ذریعہ دولت خود بخود سرمایہ کاری کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ جو معاشی ترقی کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔

اسلام زکوٰۃ کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی انفرادی عبادت ہے جس کے ہمہ جہت اجتماعی فوائد واثرات ہیں۔اس عبادت کو بجانہ لانے والا خود کو قطعی طور پر مسلمان نہیں کہہ سکتا بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف قتال کے سلسلہ میں صحابہ کا اجماع موجود ہے۔اسلام نے اس عبادت کو اتنی اہمیت دی ہی اس لئے ہے کیونکہ یہ بندوں کا حق ہے جو ہر قیمت پر انہیں ملنا چاہئے۔

قرآن مجید نے جب مسلمانوں کو کفار مکہ سے جنگ کرنے کا آخری [۱۲] حکم دیا تو فرمایا کہ اب تمہاری تلواریں اس وقت تک نیام میں نہ جائیں جب تک کہ دشمنان حق کا قصہ پاک نہ ہو جائے یا پھر یہ کہ وہ اس دین کو قبول نہ کرلیں جسے انہیں سمجھانے میں بیس بائیس سال

کی مدت صرف ہو چکی ہے اور اب حجت پوری ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بتانے کے لئے کہ ان کا اسلام لے آنا کم معتبر مانا جائے گا اور اس بناء پر ان کے خلاف جنگی کارروائیاں کب ختم کردی جائیں گی۔ اس نے فرمایا:

فان تابوا و اقاموا الصلوٰۃ و اتوالزکوٰۃ فخلو اسبیلھم (التوبہ: ۵)

[سو اگر یہ لوگ توبہ کرلیں، نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو اب وہ تمہارے دینی بھائی ہوں گے۔]

گویا کسی کا مسلم قرار پانا کلمہ شہادت کے بعد بھی دو باتوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ وہ نماز قائم کرے دوسرے یہ کہ زکوٰۃ ادا کرے یہ ایمان کی ایسی ضروری اور لازمی شرط ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں (اہل عرب) سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ اللہ ہی کے معبود ہونے اور محمد کے رسول خدا ہونے کی گواہی دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ جب وہ ایسا کرلیں گے تو اسی وقت مجھ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ پاسکیں گے۔ اور اس کے بعد ان کا حساب لینا اللہ کا کام ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

کتاب و سنت کے یہ دونوں بیانات دین اسلام میں زکوٰۃ کا ٹھیک ٹھیک مقام متعین کردینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ان کی روشنی میں صاف نظر آجاتا ہے کہ زکوٰۃ کے بغیر دین کی عمارت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی اسی وجہ سے اسے اسلام کا ایک ستون قرار دیا گیا ہے۔

❖

حواشی و حوالہ جات:

۱ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اپنی کتاب معارف الحدیث، جلد ۴، ص ۱۹ پر لکھتے ہیں کہ ''قرآن

مجید میں ستر سے زائد مقامات پر اقامت صلوٰۃ اور اداء زکوٰۃ کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ان دونوں کا مقام اور درجہ قریب قریب ایک ہی ہے۔''

اس بیان میں تعداد کی بات درست نہیں۔ جیسا کہ لکھا گیا قرآن مجید میں بتیس آیات میں زکوٰۃ کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں سے چھبیس آیات میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے **معجم المفهرس**، ص ۳۳۱، ۳۳۲)

اسی طرح سیّد سلیمان ندوی نے **سیرۃ النبی**، جلد ۵، ص ۲۰۶ میں ۲۰ مقامات کا تذکرہ کیا ہے جب نماز زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ وہ بھی درست نہیں۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سورۃ البقرہ: ۴۳، سورۃ المائدہ: ۱۲، سورۃ مریم: ۳۱، ۵۵۔

۳۔ ندوی، سیّد سلیمان، **سیرۃ النبی**، جلد ۵، ص ۱۵۷۔

۴۔ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، **اسلام کا اقتصادی نظام**، ص ۳۰۹، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۴ء (بحوالہ ابو داؤد)۔ ۵۔ ایضاً۔

۶۔ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، **تفهیم القرآن**، جلد ۲، ص ۲۰۵، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۷۔ مودودی صاحب نے اس حدیث کا مآخذ بیان نہیں کیا ہے البتہ **سیرۃ النبی**، جلد ۵، ص ۱۷۴ پر سیّد سلیمان ندوی نے **صحیح مسلم**، کتاب الزکوٰۃ کے حوالے سے اس سے ملتی جلتی ایک حدیث نقل کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''مسکین وہ نہیں جس کو ایک دو لقمے در بدر پھرایا کرتے ہیں۔'' صحابہ نے دریافت کیا ''پھر کون مسکین ہے؟'' ارشاد ہوا ''وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔''

۸۔ تاہم خود رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کی تقسیم کا کام بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لئے بھی یہی قاعدہ مقرر کر دیا کہ وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں۔

۹۔ **تفهیم القرآن**، جلد ۲، ص ۲۰۶۔ ۱۰۔ شاہ ولی اللہ، **حجة الله البالغة**، جلد ۲، ص ۹۳۔

۱۱۔ اصلاحی، صدر الدین، **اسلام ایک نظر میں**، ص ۱۰۴، اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۸۔

سترھواں باب:

روزہ

عربی زبان میں ''صوم'' کے لغوی معنی کسی چیز سے رک جانے یا اسے چھوڑ دینے کے ہیں۔ اس کی مترادف لفظ اردو میں ''روزہ'' مستعمل ہے۔ اصطلاح شریعت میں ''صوم'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو احکام شریعت کا مکلّف ہو طلوع فجر سے غروب آفتاب تک روزے کی نیت کرے۔ اللہ کی خوشنودی کے لئے ارادتاً کھانے پینے اور صنفی تعلقات کے علاوہ ہر قسم کی لغویات اور غیر اخلاقی حرکات سے مجتنب رہے۔

روزہ ایک اہم اسلامی عبادت ہے جو صرف امت محمدیہ پر ہی فرض نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کی امتوں پر بھی روزہ فرض رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں کہا گیا۔

یا ایُّھا الذین اٰمنوا کُتِبَ علیکم الصِّیام کما کُتِبَ علی الذین مِن قبلکم لعلکم تتقون (البقرہ:۱۸۳)

[اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے، تا کہ تمہارے اندر تقویٰ اور پرہیز گاری پیدا ہو۔]

دیگر اقوام کی مذہبی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مذاہب میں بھی روزہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ہندومت میں برہمنوں کو ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ تاریخوں کو اکاوشی کا روزہ (برت) رکھنا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں روزے کی سب سے زیادہ سخت

شرائط جین مت میں ہیں۔ ان کے یہاں چالیس چالیس دن کا ایک روزہ ہوتا ہے۔[1] گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتے کا روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے یہاں بھی روزہ مذہبی دستور تھا۔ پارسیوں میں گو عام پیروؤں کے لئے روزہ فرض نہیں تھا لیکن ان کے مذہبی پیشواؤں کے لئے پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔ یہودیت اور عیسائیت ہر دو مذاہب میں روزوں کی تاکید تھی اور ان کے صحیفوں میں روزوں کے احکام بتصریح مذکور ہیں۔ اہل عرب بھی جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ، یعنی دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ لہٰذا روزہ امت محمدیہ کے لئے کوئی نئی اور اجنبی عبادت نہیں تھی بلکہ ہر مذہب نے بلند تر اخلاقی مقاصد حاصل کرنے کے لئے اور نفوس کو مطیع بنانے کے لئے یہ مشقیں اپنے پیروکاروں سے کرائی ہیں۔

اسلام میں روزے ماہ شعبان ۲ھ میں مدینہ منورہ میں فرض ہوئے اور اس کے لئے رمضان کا مہینہ مختص کیا گیا۔[2] اس وقت تک اسلام کو اپنا پیغام پھیلاتے ہوئے کامل پندرہ سال ہو چکے تھے اس تاخیر کی وجہ علامہ ابن قیم کے نزدیک یہ ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا بہت دشوار کام تھا اس لئے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔[3]

اسلام کے دیگر احکامات کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابتداء میں مسلمانوں کو ہر مہینے صرف تین روزے رکھنے کی ہدایت[4] فرمائی تھی مگر روزے فرض نہیں تھے، پھر ۲ھ میں جب روزے پورے ماہ رمضان کے فرض ہوئے تو اس میں رعائت کا یہ پہلو رکھا گیا کہ جو لوگ روزہ برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے مسکین کو کھانا کھلائیں۔ بعد میں یہ عام رعائت منسوخ کر دی گئی اور تمام مردوں اور عورتوں کو روزوں کا پابند کیا گیا ماسوائے مریض، مسافر، حاملہ یا دودھ پلانے والی عورتیں اور ایسے کمزور بوڑھے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو۔ تاہم ان کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہوں۔

روزے کی حقیقت:

قرآن مجید میں سورۃ بقرہ میں روزوں سے متعلق تفصیلی احکام آئے ہیں جن سے ایک طرف تو روزے کا قانون اخذ کیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف اس کے اہم مقاصد سامنے آتے ہیں۔

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب، طلوع سحر کی ابتدائی علامات ظاہر ہوتے ہی مکلّف پر یکا یک کھانا پینا اور جنسی تعلقات قائم کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ یہ حرمت غروب آفتاب تک قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد جو اعمال لمحہ بھر پہلے تک حرام تھے وہ حلال ہو جاتے ہیں تا آنکہ دوسرے روزے کی مقررہ ساعت آ جاتی ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے انتیس یا تیس تاریخ تک اس عمل کی مسلسل تکرار ہوتی ہے۔

قانونی اعتبار سے اگرچہ روزے میں انسانوں پر صرف دو فطری خواہشات (غذا اور صنفی خواہش) پر پابندی لگائی جاتی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان پر بندگی کا احساس اس شدت سے طاری رہے کہ وہ تمام لغویات اور غیر اخلاقی اعمال سے پرہیز کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' **(صحیح بخاری، کتاب الصوم)** ایک اور حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا بدلہ ہے مگر روزہ خاص میرے لئے ہے لہٰذا میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ اور روزہ ڈھال ہے، جب تم میں سے کوئی روزہ سے ہو تو شور نہ مچائے اور فحش باتیں نہ کرے۔ اگر کوئی اس سے جھگڑا کرے یا گالی گلوچ کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں۔'' **(صحیح بخاری، کتاب الصوم)**

بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو۔'' صحابہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ اس میں سوراخ کس چیز سے ہوتا ہے؟'' فرمایا ''جھوٹ اور غیبت سے۔'' چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ کرنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔[۵]

روزے کی درستگی کے لئے ضروری ہے کہ روزہ ایمان واحتساب کے مکمل جذبے کے ساتھ رکھا جائے ورنہ سوائے فاقہ کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بالفاظ دیگر صرف جسم کا روزہ ہوگا روح کا نہیں۔ امام غزالیؒ روزے کے تین درجے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ ایک عوام کا روزہ ہے وہ یہ کہ پیٹ اور شرمگاہ کو ان کی خواہش ادا کرنے سے روکا جائے یہ روزے کا ادنیٰ درجہ ہے۔

۲۔ دوسرے درجہ میں خواص کا روزہ ہے وہ یہ کہ پیٹ اور شرمگاہ کے ساتھ ساتھ تمام اعضائے جسمانی کو مثلاً آنکھ، کان، زبان، ہاتھ پاؤں وغیرہ کو بھی گناہ سے روکا جائے۔

۳۔ اخص الخواص کا روزہ یہ ہے کہ اول الذکر دونوں مطالبات کے ساتھ ساتھ دل کو بری خواہشات اور دنیاوی فکروں سے دور رکھا جائے۔ اور سوائے خدا تعالیٰ کے دیگر چیزوں کے بارے میں فکر کرنے سے اس کو مطلقاً روک دیا جائے۔ اس قسم کا روزہ خالصتاً دنیاوی چیزوں کے بارے میں فکر کرنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض علماء کے نزدیک دن میں افطاری کی فکر کرنے سے بھی یہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ رزق کے بارے میں جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس شخص کو اس کا یقین نہیں۔ روزے کا یہ تیسرا اور اعلیٰ درجہ انبیاء اور صدیقین کا ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵ سے روزے کے تین مقاصد سامنے آتے ہیں۔

پہلا مقصد یہ کہ بندوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ (**لعلکم تتقون**) دوسرا یہ کہ بندوں میں خدا کی کبریائی اور تعظیم کا جذبہ پیدا ہو۔ (**ولتکبروا اللہ علی ماھدٰکم**) تیسرا یہ کہ بندے خدا کے شکر گزار بنیں۔ (**ولعلکم تشکرون**)

جہاں تک حصول تقویٰ کا تعلق ہے یہ روزے کا سب سے اعلیٰ و اہم ترین مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو روحانیت اور حیوانیت یا بالفاظ دیگر ملکوتی اور بہیمی صفات کا جامع بنایا ہے، اس کی طبیعت اور جبلت میں وہ سارے مادی اور سفلی تقاضے بھی ہیں جو دوسرے جانداروں میں پائے جاتے ہیں، یعنی بھوک پیاس، نیند، صنفی تقاضے وغیرہ اور اس کے ساتھ

ساتھ اس کی فطرت میں روحانیت اور ملکوتیت کا وہ نورانی جوہر بھی ہے جو اسے ملاء اعلیٰ کی مخلوقات یعنی فرشتوں سے مماثل کرتا ہے۔ انسان کی سعادت کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کا یہ روحانی اور ملکوتی عنصر (عقل) بہیمی و حیوانی عنصر (طبیعت) پر غالب اور حاوی ہے۔ روزہ سے یہ مقصد بہ درجہ احسن حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی بہیمیت کو دبانے پر قادر ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کہتے ہیں "روزہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے۔ اس سے ملکی قوت بڑھتی ہے اور بہیمی طاقت کمزور ہوتی ہے۔ روح کا چہرہ روشن کرنے کے لئے کوئی قلعی اس سے زیادہ نہیں ہے اور طبیعت کو مغلوب کرنے کی کوئی دوا اس سے زیادہ مفید نہیں۔" [ے]

گویا روزہ کا سب سے اعلیٰ مقصد تقویٰ ہے اور حصول تقویٰ کی واحد سبیل "ضبط نفس" ہے۔ نفسانی خواہشات یوں تو ہزاروں ہیں لیکن ان میں سے دو قوی تر ہیں ایک کھانے پینے کی خواہش اور دوسرے صنفی ملاپ کی خواہش۔ ان دونوں پرزور خواہشات میں اتنی طاقت ہے کہ وہ انسان کو باسانی زیر کر لیتی ہیں۔ نیز یہ صرف انسانی یا نفسانی خواہشات ہی نہیں بلکہ عین فطری ضروریات بھی ہیں۔ انہی پر اس کی بقائے ذات بھی موقوف ہے اور بقائے جنس بھی۔ روزہ انہیں طاقتور خواہشات کو ایک قابل لحاظ وقت تک دبائے رکھنے کی مشق بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد روزہ داروں سے بجا طور پر یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی دوسری خواہشوں کو (جو ان خواہشات سے یقیناً کمزور و کمتر ہوں گی) زیادہ آسانی اور کامیابی سے دبا لے یا قابو پالے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ روزہ کا مقصد "ضبط نفس" ضرور ہے "نفس کشی" نہیں جیسا کہ بیشتر مذاہب کے پیروکار سمجھتے ہیں ان کے خیال میں وہ جتنا زیادہ اپنے جسم کو تکلیفیں دیتے ہیں خدا ان سے اتنا ہی راضی ہوتا ہے۔ یہ خیال رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا ہے جب کہ اسلام اپنے پیروکاروں سے نفس کشی کا تقاضا نہیں کرتا وہ یہ تعلیم بھی نہیں دیتا کہ بندے اپنے نفوس کو اذیتیں دے دے کر بے دم بنادیں اور اس کے جبلی مطالبات اور تقاضوں کو ختم کر کے رکھ دیں۔

ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے

رسول اللہ ﷺ نے معاملہ دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ شخص روزے سے ہے۔ فرمایا "یہ نیکی نہیں ہے کہ سفر میں روزہ رکھا جائے۔" (صحیح بخاری، کتاب الصوم) جنگ کے موقع پر تو آپ ﷺ حکماً روزے سے روک دیا کرتے تھے تاکہ دشمنوں سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے، پہلی مرتبہ جنگ بدر میں اور آخری مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر اور دونوں ہی مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیئے۔ امتیوں کو غیر معمولی مشقت سے بچانے کے لئے ہی رسول اللہ ﷺ نے "صوم وصال" ۸ سے منع فرمایا اور وہ اصحاب جو بہت زیادہ عبادات پر اصرار کیا کرتے تھے انہیں زیادہ سے زیادہ "صیام داؤدؑ" ۹ کی اجازت دی اس سے زیادہ کی یہ کہہ کر مخالفت کر دی کہ "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے گویا روزہ ہی نہیں رکھا۔"

مدینے سے باہر کے رہنے والے ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملاقات کی اور واپس چلے گئے۔ سال بھر بعد پھر دوبارا آئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں پہچانا نہیں۔ صحابی نے انہیں یاد کراتے ہوئے کہا "میں وہی تو ہوں جو گذشتہ سال حاضر خدمت ہوا تھا۔" رسول اللہ ﷺ نے کہا "تم تو بہت اچھی شکل وصورت کے تھے کس چیز نے تمہاری ہیئت بدل کر رکھ دی ہے؟" انہوں نے کہا "یہاں سے واپس جانے کے بعد آج تک میں نے رات کے سوا کبھی کھانا نہیں کھایا" (یعنی مسلسل روزے رکھتا رہا)۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا "تم نے خود کو کیوں عذاب دیا؟" (ابو داؤد، جلد اوّل، کتاب الصیام)

گویا روزہ کا مقصد ضبط نفس ضرور ہے نفس کشی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرہ میں جہاں روزے کی فرضیت کا حکم ہے وہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرہ: ۱۸۵)

[اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے سختی نہیں چاہتا۔]

روزے کے ذریعہ اسلام جو دوسرا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت و کبریائی کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کیا جائے۔ یہاں تک کہ انسان

اپنے جائز مطالبات میں بھی آزادی وخودمختاری سے دست بردار ہو جائے۔ خدا کا وجود محض ایک مابعد الطبیعی عقیدہ نہ رہے بلکہ عملی زندگی میں محسوس و کارفرما ہو جائے۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کے مقابلے میں خود کو خودمختار محسوس کرے۔ اس کے برعکس اسلام یہ ہے کہ انسان ہر آن خود کو بندہ و محکوم سمجھے۔ روزہ انسانوں میں یہی احساس بندگی شدید کرتا ہے، اور احساس بندگی جس قدر شدید ہوگا اطاعت امر بھی اتنی ہی شدت سے ہوگی اور یہی وہ دوسرا اہم مقصد ہے جو روزہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

روزہ کے ذریعہ اسلام جو تیسرا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں میں شکر گذاری کے جذبات پیدا ہوں اور وہ حقیقی معنوں میں خدا کے شکر گذار بندے بنیں۔ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے ان گنت احسانات اور بے حد وحساب نعمتیں ہیں ان میں سب سے عظیم الشان نعمت ''قرآن حکیم'' ہے۔ جس کے ذریعہ انسان نے ہدایت کا راستہ پایا اور جس کی وجہ سے وہ حیوانوں کے درجہ سے بلند ہوکر فرشتوں سے بھی اعلیٰ مخلوق قرار پایا اور اس کے ذریعہ سے انسان نے جہالت و نادانی کی طرف سے حکمت و معرفت کی جانب اپنا سفر شروع کیا۔ ان احسانات پر اللہ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے اور ادائیگی شکر کا احسن طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لئے وقف کر دیا جائے جس کے لئے وہ نعمت عطا کی گئی ہے۔ قرآن کی نعمت ہم کو اس لئے عطا کی گئی ہے کہ ہم اللہ کی رضا و خوشنودی کا راستہ جان کر خود بھی اس ہدایت پر چلیں اور دنیا کو بھی اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ روزہ ہے لہٰذا روزہ صرف عبادت ہی نہیں بلکہ یہ وہ زبردست اخلاقی تربیت ہے جس کا ایک پہلو نعمت قرآن کی صحیح اور موزوں شکر گذاری ہے اور اسی لئے رمضان کی راتوں میں (تراویح میں) اسے کثرت سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

فضیلت اور اہمیت:

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کے آخری دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! ایک عظمت و برکت والا مہینہ تم پر سایہ فگن ہونے والا ہے۔ اس مہینے میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ اللہ نے اس ماہ کے روزے فرض کیے ہیں اور اسی مہینے میں قیام اللیل نفل ہے...... یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے، یہ ہمدردی و غمگساری کا مہینہ ہے اس مہینے میں مومن کا رزق زیادہ ہوجاتا ہے۔ جس نے روزہ دار کا روزہ افطار کرایا اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جہنم سے نجات مل جاتی ہے۔ اس مہینے کا پہلا عشرہ رحمت کا ہے، دوسرا عشرہ مغفرت کا اور تیسرا دوزخ کی آگ سے نجات کا۔ جس نے اپنے خادم اور نوکر سے اس ماہ میں کم کام لیا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا اور اسے دوزخ کی آگ سے بچالے گا۔" (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الصوم)

مندرجہ بالا حدیث کے علاوہ چند اور احادیث بیان کی جاتی ہیں جن سے روزہ کی فضیلت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔ وہ کھانا پینا اور اپنی مرغوب چیزوں کو روزوں میں میری خاطر (اللہ کی خاطر) چھوڑ دیتا ہے اور میں اس کا بدلہ دیتا ہوں اور نیکی دس گنا ملتی ہے۔" (صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد اوّل ص ۶۷۶)

نبی ﷺ نے فرمایا "جنت میں ایک دروازہ ہے جس کو "ریان" کہا جاتا ہے، قیامت کے دن اس دروازے سے روزہ دار ہی داخل ہوسکیں گے کوئی دوسرا داخل نہ ہو سکے گا۔ اس دن پکارا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ روزہ دار لوگ کھڑے ہوں گے اس دروازے سے ان کے سوا کوئی داخل نہ ہوسکے گا، جب وہ داخل ہوجائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور اس میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔" (صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد اوّل، ۶۷۶)

المختصر یہ کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں [۱۰] اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، شیاطین زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ [۱۱] رمضان کا مہینہ ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، شب قدر کی برکات بھی اسی ماہ میں

حاصل ہوسکتی ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ ضبط نفس، اور تعمیر سیرت کا مہینہ ہے جس میں بے اندازہ انفرادی و اجتماعی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ انفرادی فوائد تو یہ ہیں کہ مسلمانوں میں تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ صبر و شکر کے جذبات عروج پر ہوتے ہیں، وہ خدا کے لئے اپنے جائز اور فطری مطالبات سے بھی دست بردار ہونے کی مشق کرتے ہیں جس کے عوض اپنے آپ کو خدا کا مقرب بناتے ہیں۔

اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو رمضان خیر و فلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے اس موسم میں اجتماعی طور پر برائیاں دبتی ہیں اور نیکیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ معاشرہ میں امداد باہمی کی روح جاری ہوجاتی ہے۔ روزے سے معاشرے کے دیگر افراد کی معاشی کفالت ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ روزے کے ساتھ ساتھ جو فدیئے اور کفارے کے احکام دیئے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب مواقع پر روزے کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ پھر روزہ داروں کو روزہ افطار کرانے کا بڑا اجر بتایا گیا ہے...... روزے میں ایک خاص وقت تک بھوکا پیاسا رہنے سے امراء میں بھی غریبوں کی بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے رمضان کو ''شہر الصبر'' اور ''شہر المواساۃ'' کہا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کا حال اس ماہ میں یہ ہوتا تھا کہ:

''نہ کسی قیدی کو قید میں باقی رکھتے اور نہ کسی سائل کو محروم واپس کرتے۔''

(مشکوٰۃ، کتاب الصوم)

اور بقول حضرت ابن عباس ''اگرچہ آپ ﷺ سب سے بڑے فیاض انسان تھے مگر رمضان کے مہینے میں آپؐ کی فیاضی غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی تھی۔'' (صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب الصوم)

جس طرح حد سے زیادہ فاقہ کشی انسانی جسم کو نحیف و نزار کردیتی ہے اسی طرح ضرورت سے زیادہ کھانا انسانی جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں میں مبتلا کردیتا ہے۔ طبی تجربات اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے

ضروری ہے۔ بعض اطبا یہ ہدایت دیتے ہیں کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے۔ اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے اگر افطار و سحور میں بے اعتدالی سے نہ کھایا جائے تو روزہ کئی بیماریوں کو دور کرسکتا ہے اس طرح روزہ ایک طرح کا لازمی سالانہ جسمانی علاج بھی ہے۔[۱۲] پھر یہی نہیں بلکہ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے۔ جب انسانی معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تجرہ معدی کی مصیبت سے پاک ہو چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس پر گواہ صادق ہے۔

پھر یہی نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو انسان اپنے دن کا بڑا حصہ کھانا پکانے کھلانے اور اس کا اہتمام کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا کم کردے تو اس کی دولت اور وقت کا بڑا حصہ بچ سکتا ہے۔ جسے وہ عبادت خداوندی اور خلق خدا کی خدمت و اعانت میں صرف کرکے اجر عظیم کا مستحق بن سکتا ہے۔

الغرض نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ بھی ایک ایسی عبادت ہے جو بہت سے انفرادی و اجتماعی فوائد و ثمرات کی حامل ہے اور اس عبادت کو کما حقہ، بجالانے والے خوش نصیبوں سے خدا کا وعدہ ہے "صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔" (الزمر: ۱۰) ظاہر ہے کہ مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے۔ اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

❀♦❀

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ ندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی، جلد ۵، ص ۲۱۲۔

۲۔ البقرہ: ۱۸۵۔

۳۔ ابن قیم، زاد المعاد۔

۴۔ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۱۴۱۔

۵۔ ندوی، ص ۲۳۹ (بحوالہ فتح الباری)

۶۔ امام محمد غزالی، کیمیائے سعادت، ص ۱۸۴۔ نیز احیاء العلوم، جلد اوّل، ص ۳۶۵، مترجم محمد احسن صدیقی، اشاعت، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

۷۔ حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل، ص ۱۹۸۔

۸۔ حوالے کے لئے دیکھئے صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب الصوم، ص ۶۹۸۔

۹۔ ''صوم داؤد'' سے مراد یہ ہے کہ حضرت داؤد کے طریقے پر روزہ رکھا جائے۔ وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہیں۔ اور دشمن سے لڑائی میں پیٹھ نہیں دکھاتے تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب الصوم) گویا جسمانی کمزوری روزہ کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔

۱۰۔ صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب الصوم، ص ۶۷۷۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ندوی، ص ۲۳۶۔

اٹھارھواں باب:

حج

حَج یا حِج کے لفظی معنی ہیں قصد کرنا، کسی جگہ ارادتاً جانا۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں مقررہ دنوں میں مکہ مکرمہ جا کر بیت اللہ، عرفات، مزدلفہ اور منیٰ وغیرہ کا قصد کرنے اور طواف اور دیگر مناسک ادا کرنے اور مقررہ آداب و اعمال بجالانے کا نام حج بیت اللہ ہے۔

حج اسلامی عبادات کا چوتھا رکن ہے۔ عبادت کا یہ طریقہ غالباً خدا پرستی کا سب سے پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ دنیا کی قدیم ترین معلوم قوموں (بابل، کلدان و یونان وغیرہ) میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی میں دو خاص باعظمت [1] مکان بنائے جاتے تھے ایک بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی پناہ میں ہوتی تھی اور اسی دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اسی معبد میں جمع ہوتی تھیں۔

مسلمانوں کے لئے اس نوعیت کا پہلا گھر مکہ مکرمہ میں ''خانہ کعبہ'' ہے۔ اس کی اولین تعمیر کے سلسلہ میں مختلف روایات مذکور ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا۔[2] اس وقت حضرت آدمؑ کو پیدا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کعبہ کی اولین تعمیر تھی۔ اس سلسلہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا[3] اور جب تعمیر مکمل ہوگئی تو ان کو اس کے طواف کا حکم دیا گیا۔ پھر مرور زمانہ کے بعد

حضرت نوحؑ نے کعبہ کا حج کیا۔مشہور محدث عبدالرزاق اپنی کتاب المصنف میں لکھتے ہیں کہ آدمؑ نے کعبہ کی تعمیر میں پانچ پہاڑوں یعنی لبنان، طورزیتا، طور سینا، کوہ جودی اور حرا کے پتھر۴؎ استعمال کیے تھے۔اور حجر اسود کو نسب کیا جو ان کے ساتھ ہی اتارا گیا تھا۔حضرت آدمؑ کی تعمیر کے بعد ان کے بیٹے شیث نے بھی کعبہ کی تعمیر ثانی میں حصہ لیا تھا۔اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کا ذکر تو خود قرآن مجید میں موجود ہے۔۵؎

مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر بیت اللہ کی دیواریں اٹھائیں اور دعا کی ''اے میرے پروردگار! اس شہر کو پرامن بنا اور اس شہر کے جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں پھلوں سے رزق عطا کر۔'' (البقرہ:۱۲۶)

نیز یہ التجا کی ''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے پاس ایسی وادی میں آباد کیا ہے جہاں کوئی زرعی پیداوار نہیں ہوتی۔ یہاں انہیں بسانے کا مقصد اقامت الصلوٰۃ ہے۔لہٰذا تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں کھانے کو پھل عطا کرتا کہ وہ تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔'' (ابراہیم:۳۷)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی ان دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کیا اور ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کو طواف کرنے، اعتکاف کرنے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک وصاف۶؎ رکھیں اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو حج کرنے کی دعوت دیں۔۷؎

حج کی حقیقت:

شاہ ولی اللہ حج کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر قوم و ملت کے پاس ایک معبد یا قربان گاہ ہوتی ہے جہاں کی وہ زیارت کرتے ہیں، جمع ہوتے ہیں اور آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔اس سے وہ اپنے مقرب لوگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔اسی طرح مسلمان بیت اللہ کا قصد کرتے ہیں اور یہ مقام سب سے زیادہ حج کے قابل ہے۔اس میں حضرت ابراہیم کے دین خالص کی کرامات اور دیگر برملا نشانیاں موجود ہیں لہٰذا صالح مسلمانوں کی ایک انتہائی کثیر جماعت

ہر سال، خاص دنوں میں، خاص لباس میں اور ایک خاص کیفیت میں یہاں جمع ہوتی ہے۔ اپنے گناہوں پر زاری کرتی اور مغفرت کی طالب ہوتی ہے جس سے رحمت خداوندی کو جوش آتا ہے اور بے پایاں رحمت و مغفرت کا نزول ہوتا ہے۔۸ یہ امت مسلمہ کے جمع ہونے، ان کی شوکت کے ظاہر ہونے اور دین کی عزت و عظمت کا دن ہے۔۹ اس دن امت مسلمہ حضرت ابراہیم سے موافقت کا اظہار کرتی ہے اور خدا تعالیٰ کے بے پایاں انعامات و احسانات کو یاد کرتی ہے۔

دراصل حج کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ حج کا ایک پہلو خدا کے سامنے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا اعتراف ہے اور اس کا دوسرا پہلو توبہ اور انابت ہے۔ اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لبیک اللّٰھم لبیک (میں حاضر ہوں خداوند میں حاضر ہوں) کا ورد اس کی زبان سے جاری ہو جاتا ہے۔ طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات، مزدلفہ و منیٰ میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ و استغفار کا ہوتا ہے۔ بندوں کی یہی دونوں ادائیں خدا کو سب سے بڑھ کر محبوب ہیں لہٰذا وہ فرشتوں کے سامنے اپنے ان بندوں پر فخر کرتا ہے۔

حج ایک ایسی عبادت ہے جس سے منافقین کی بھی قلعی کھل جاتی ہے۔ اس کی ادائیگی میں زر کثیر کے ساتھ ساتھ دشوار و طویل سفر درپیش ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر نفس کا آمادہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ ایسا وہی کر سکتے ہیں جو ایمان کی عاشقانہ تڑپ رکھتے ہیں۔

حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو

۱۔ عاقل ہو، مجنون مکلف نہیں۔

۲۔ بالغ ہو، بچوں کے لئے ضروری نہیں۔

۳۔ اس کے پاس اتنا مال ہو جو نہ صرف اس کے مصارف حج کے لئے کافی ہو بلکہ ان تمام افراد کے لئے بھی ہو جن کے معاش کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہے۔

۴۔ تندرست اور صحت مند ہو، اس کے بدن میں اتنی طاقت ہو کہ سفر حج کر سکے اور احکام بجا لا سکے۔

۵۔ اس کے لئے راستہ پرامن ہو۔

۶۔ ذریعہ سفر میسر ہو۔

۷۔ کوئی عملی روک ٹوک اور بندش موجود نہ ہو۔

اگر کوئی مسلمان یہ تمام شرائط پوری کرتا ہو تو پھر اسے حج موخر نہیں کرنا چاہئے۔ چونکہ حج کے لئے کافی روپیہ، مشقت اور وقت درکار ہے اور اگر تمام احکام ملحوظ رکھ کر صحیح طور پر حج ادا کیا جائے تو ساری عمر کے لئے کافی تربیت ہو جاتی ہے۔ اس لئے شریعت نے عمر بھر میں ایک ہی دفعہ حج فرض قرار دیا ہے۔

شریعت محمدیؐ میں حج کی فرضیت کا حکم ۹ھ میں آیا۔[۱۱] فتح مکہ کے بعد دور اسلامی کا پہلا[۱۲] حج ۸ھ میں قدیم طریقے پر ہوا۔ پھر ۹ھ میں دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقے پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریقے پر۔ اس دوسرے حج کے امیر حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ھ میں خالص اسلامی طریقے پر ہوا اور یہی وہ مشہور حج ہے جسے ''حجۃ الوداع'' کہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ پہلے دو سال حج کے لئے تشریف نہ لے گئے۔ تیسرے سال جب شرک کا بالکل استیصال ہو گیا تب آپ نے حج ادا فرمایا۔

دراصل حج کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو سکھایا اور جس پر ان کی اولاد قائم رہی رفتہ رفتہ اس میں نئی نئی بدعتیں شامل ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت جو حج ہوتا تھا وہ سنت ابراہیمی کے قطعی خلاف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حج عربوں کا ایک عام شعار تھا اور اس کے اصول و ارکان بھی پہلے سے موجود تھے لیکن ان میں بہت سے مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے۔ مثلاً

۱۔ اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا حالانکہ ہر عبادت کی اصل غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ چنانچہ جب تمام مناسک حج سے اہل عرب فارغ ہو لیتے تو منیٰ میں قیام کرتے اور اس موقع پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباء واجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا۔

۲۔ قریش قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا

سے تقرب حاصل ہو جائے۔

۳۔ خصوصاً اہل یمن کا دستور تھا کہ سفر حج میں زادراہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں جس کے نتیجے میں مکہ تک پہنچتے پہنچتے بھیک مانگنے کی نوبت آجاتی تھی۔[۱۳]

۴۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں جو امتیازات قائم کر لیے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے۔[۱۴] ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے عاریتاً کپڑے تقسیم کیے جاتے تھے لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے انہیں برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔

۵۔ قریش نے اپنے لئے یہ خود ساختہ امتیاز قائم کر لیا تھا کہ حدودِ حرم سے باہر نکل کر عرفات میں قیام نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن قریش اسے اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہر کر واپس پلٹ آتے تھے اور تمام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔

۶۔ عہد جاہلیت میں حج نے ایک بڑے میلے کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور اس میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو عموماً میلوں میں ہوتا یعنی شور و غل، دنگا فساد، کھیل تماشے، عورتوں سے چھیڑ خانی اور فسق و فجور وغیرہ۔

۷۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ جب سواریاں حج سے واپس آجائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں تب عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مناسک حج کی ادائیگی کے بعد واپسی کے سلسلہ میں بھی ان کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک کا کہنا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق میں واپس آتے ہیں وہ گنہگار ہیں جب کہ دوسرے گروہ کا کہنا یہ تھا کہ جو لوگ دیر میں واپس آتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔

۸۔ پھر ان میں ایک اور عجیب بدعت یہ آگئی تھی کہ خصوصاً اہل یثرب جب حج کر کے واپس

آتے تو دروازے کی راہ سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اوراسی کو کارثواب سمجھتے تھے۔

قرآن نے ان تمام باتوں کی اصلاح کی۔سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے

''تم میں سے جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے وہ حسب مقدور قربانی دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر، اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر بار مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کر لے اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفر حج کے لئے زادراہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادراہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوش مندو میری نافرمانی سے پرہیز کرو اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو۔ یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن

اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں۔" (البقرہ:۱۹۶-۲۰۳)

تمام اصلاحات کے بعد حج کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

.... حج کے معین ایام چھ ہیں یعنی اسلامی قمری تقویم کے مطابق آٹھ سے تیرہ ذی الحجہ تک۔

.... رسول اللہ ﷺ نے میقات کی شکل میں بیت اللہ کے حدود مقرر کیے جو شخص حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جانا چاہے وہ ان مقامات سے بغیر احرام باندھ نہ گذرے۔ یہ مواقیت تعداد میں پانچ ہیں۔

۱۔ یلملم: یہ تہامہ کے علاقے کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ یہ پاکستان، ہندوستان، یمن وغیرہ کی طرف سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔

۲۔ جحفہ: یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک بستی تھی جو اب موجود نہیں۔ اس وقت اس کے قریب ایک اور آباد بستی ہے جسے رابغ کہتے ہیں یہ جگہ مکہ سے شمال کی جانب تقریباً ایک سو چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور مصر، شام، طرابلس اور یورپ وغیرہ سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔

۳۔ ذات عرق: یہ اہل عراق کا میقات ہے۔

۴۔ قرن المنازل: یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو عرفات کی طرف واقع ہے۔ یہ نجد والوں کا میقات ہے۔

۵۔ ذوالحلیفہ: اس جگہ کو آج کل بئر علی یا ابیار علی کہتے ہیں۔ یہ مدینے سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ مدینہ والوں کا میقات ہے۔ مکے سے بعید ترین میقات یہی ہے۔

.... میقات سے آگے گذرنے کے لئے احرام ضروری ہے۔ یہ بن سلے سفید رنگ کے معمولی دو کپڑے دراصل عہد ابراہیم کے لباس کی تمثیل ہیں۔ احرام باندھتے ہی بہت سی حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں اسی لئے اس کو "احرام" کہتے ہیں اور یہیں سے اصل عبادت شروع ہو جاتی ہے۔

............ایام حج چھ ہیں ''۸ تا ۱۳ ذی الحجہ'' ذوالحجہ کی ساتویں تاریخ کو ''یوم الزینۃ'' کہتے ہیں کیونکہ اس دن حاجی غسل کر کے، صاف کپڑے پہن کے اور خوشبو وغیرہ لگا کے اگلے دن کے حج کی تیاری کرتا ہے۔

ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو ''یوم الترویۃ'' کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اس دن تقریباً بے آب و گیاہ میدان میں ایک ہفتے کے سفر پر روانہ ہوتے تھے اس لئے اس دن اونٹوں کو جو عرب کی خاص سواری ہے پانی وغیرہ پلا کر سیر کرلیا جاتا تھا۔ اس دن حاجی منیٰ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ جو مکہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ پانچ نمازیں یعنی ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر منیٰ ہی میں ادا کرتے ہیں۔

ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو ''یوم الحج'' کہتے ہیں۔ اسی کا نام ''یوم العرفہ'' بھی ہے۔ یہی حج کا اصل دن ہے۔ یہ پورا دن عرفات میں گذارا جاتا ہے جو کہ منیٰ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جہاں نہ کوئی درخت ہے نہ سایہ۔ اس جگہ مسجد نمرہ میں یا جبل رحمت پر خطبہ ہوتا ہے اس کے بعد ظہر و عصر کی دونوں نمازیں قصر کر کے سورج ڈھلتے ہی پڑھ لی جاتی ہیں اس کے بعد شام تک کے چار پانچ گھنٹے حج کا لب لباب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

الحج الوقوف بعرفة. [حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے۔]

یہ وقت حتیٰ الوسع کھڑے ہو کر دعا، استغفار، تسبیح، تہلیل، تکبیر، تحمید اور ہر طرح کے ذکر الٰہی و تلاوت قرآن میں گذارا جاتا ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد یہاں سے مزدلفہ روانہ ہو جاتے ہیں جہاں رات بسر کرتے ہیں۔

ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو ''یوم النحر'' کہتے ہیں۔ وہی دن جس میں حج کی یادگار کے طور پر دنیا کے سب مسلمان عید الاضحیٰ مناتے ہیں۔ حاجی اس دن منیٰ میں قربانی کرتے ہیں جو اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ اس سے قبل ''رمی جمار'' کرتے ہیں۔ رمی جمار اس واقعہ کی یادگار ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو پیش آیا تھا جب وحی الٰہی کے مطابق آپ حضرت اسمٰعیلؑ

کی قربانی کے لئے چلے تو شیطان نے آپ کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی۔ آپ نے اسے جمرہ اولیٰ کے پاس کنکریاں ماری تھیں۔ اس کے بعد شیطان حضرت حاجرہؓ کو ورغلانے گیا تو حضرت حاجرہؓ نے اسے جمرہ ثانیہ یا جمرۃ وسطیٰ کے پاس کنکریاں ماریں۔ پھر وہ حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس گیا اور انہیں باپ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی اس وقت حضرت اسمٰعیلؑ نے اسے جمرہ ثالثہ یا جمرہ عقبیٰ کے پاس کنکریاں ماری تھیں۔

قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کا طواف کرتے اور صفا و مروہ کی سعی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی حضرت حاجرہؓ کی یادگار میں ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ، اپنی بیوی حاجرہ اور بیٹے اسمٰعیلؑ کو چھوڑ کر واپس چلے گئے اور جب ان کا ذخیرہ پانی ختم ہو گیا تو وہ پانی کی تلاش میں صفا کی پہاڑی پر چڑھیں، جب وہاں سے پانی نظر نہ آیا تو مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں، درمیان میں جہاں نشیب تھا اور بچہ ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتا تھا وہاں سے وہ بھاگ کر مسافت طے کرتی تھیں اس طرح انہوں نے اضطراب و بے تابی کی حالت میں صفا و مروہ کے درمیان سات چکر لگائے تھے۔

فضیلت و اہمیت:

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا و من کفر فان اللہ غنی عن العلمین (آل عمران: ۹۷)

[لوگوں پر یہ اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچ سکتا ہو وہ اس کا حج کرے۔ اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سارے اہل جہان سے بے نیاز ہے۔]

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا

عمل افضل ہے؟'' آپ نے فرمایا ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔'' پوچھا گیا ''اس کے بعد کون سا؟'' آپ نے فرمایا ''اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔'' پوچھا گیا ''پھر کون سا؟'' آپؐ نے فرمایا ''حج مقبول۔'' ۱۵؎ اور خواتین کو جہاد سے مستثنیٰ کرتے ہوئے حج کو اس کا نعم البدل قرار دیا گیا ہے۔ ایک موقع پر حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہم (خواتین) جہاد کو سب سے بہتر عمل سمجھتے ہیں تو کیا ہم بھی جہاد نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ''تمہارے لئے سب سے افضل جہاد حج مقبول ہے۔'' (صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب المناسک) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''جسے کسی بیماری نے یا کسی واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمران نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو چاہئے وہ یہودی مرے یا نصرانی۔'' ۱۶؎

حضرت عمرؓ کو کہتے سنا گیا کہ ''اس شخص کو یہودی یا نصرانی مرنا چاہئے (یہ الفاظ آپؓ نے تین بار دہرائے) جو سفر کی استطاعت اور راستے کا امن پانے کے باوجود بغیر حج کیے مر گیا ہو۔'' ۱۷؎

اس کے برعکس اس شخص کے بارے میں، جس نے اس فریضہ کو صحیح طریقہ سے ادا کر لیا، وہ کچھ فرمایا گیا ہے جس سے زیادہ کی تمنا بھی نہیں کی جا سکتی یعنی ''حج مقبول کا بدلہ تو جنت ہی ہے۔'' ۱۸؎ نیز ایک اور حدیث میں بیان ہوتا ہے۔ ''جس نے اس گھر کا حج کیا اور اس دوران اس نے نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی نہ کسی معصیت کا ارتکاب کیا، وہ جب حج کر کے لوٹتا ہے تو ایسا ہوتا ہے گویا آج ہی پیدا ہوا ہے۔'' ۱۹؎

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن سے زیادہ اپنے بندوں کے لئے جہنم سے آزادی و رہائی کا فیصلہ کرتا ہو۔ اس دن اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمت و رافت کے ساتھ اپنے بندوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور ان پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں سے کہتا ہے۔ دیکھتے ہو میرے یہ بندے کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟'' ۲۰؎

طلحہ بن عبید اللہ بن کریز (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بدر کے دن کے سوا شیطان کسی دن بھی اتنا ذلیل و خوار، غضب ناک و روسیاہ اور دھتکارا و پھٹکارا ہوا

نہیں دیکھا گیا جتنا کہ عرفہ کے دن کیونکہ وہ اس دن اللہ کی رحمت کو موسلا دھار برستے ہوئے اور بڑے بڑے گناہوں کی معافی کا فیصلہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔'' ۲۱

دیگر عبادات کی طرح حج بھی فوائد و مصالح سے خالی نہیں۔ حج رضائے الٰہی اور روحانی ترقی کے علاوہ سیاسی، اقتصادی اور تمدنی فوائد کا جامع ہے۔

(۱)۔ حج تمام امت مسلمہ کو ایک مرکزیت عطا کرتا ہے۔ صدیوں سے ان گنت انسان اس مرکز پر جمع ہوتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ مختلف خطوں کے مختلف نسلوں کے مختلف تہذیب و تمدن سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع پر وطنیت، قومیت اور دوسرے امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیمؑ) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہوجاتے ہیں۔ مرکزیت اور وحدت کا یہ عظیم الشان نظارہ اسلام ہر سال پیش کرتا ہے۔ مسلمان ممالک کو کسی ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجالس کے علیحدہ انعقاد کی ضرورت نہیں۔ وہ حج سے بھی یہ مقصد حاصل کرسکتے ہیں۔ بلکہ ابتدائی خلافتوں کے زمانے میں یعنی عہد خلافت راشدہ اور عہد بنو امیہ میں تو خصوصاً حج کا موسم ان کے سیاسی و تنظیمی معاملات کے لئے بڑا اہم کردار ادا کرتا تھا۔ اس زمانے میں امور خلافت کے بیشتر اہم معاملات طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف صوبوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ سے ملاقات کرکے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے تھے۔ اسی موقع پر مختلف علاقوں کی رعایا، خلیفہ سے بالمشافہ انصاف پاتی تھی۔

المختصر حج مرکز اسلام کی تقویت کا ذریعہ ہے یہ صرف ایک عالمگیر اسلامی کانفرنس کے مواقع ہی مہیا نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک بین الاقوامی ایوان تجارت کا کام بھی دیتا ہے۔ یہی حال دینی، معاشی، معاشرتی اور قومی ضروریات و فوائد کا ہے۔ سورۃ الحج: ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔

لیشھدوا منافع لھم. [تاکہ اپنے فائدوں کے لئے آموجود ہوں۔]

اب تو ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے ایک ملک کے حالات کو دوسرے ملک تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا لیکن جب تہذیب کی یہ ترقی نہیں ہوئی تھی تو اشاعت علم کا ایک بڑا ذریعہ حج فراہم کرتا تھا۔ جب مختلف دبستان فکر اور مکاتیب کے اساتذہ و طالبان علم حج کے موسم

میں ایک دوسرے سے ملتے تھے اور علوم وفنون اور افکار ونظریات کا گراں بہا تبادلہ عمل میں آتا تھا علم جغرافیہ کی ترقی میں بھی حج کا بڑا ہاتھ ہے۔ یاقوت حموی[۲۲] نے اپنے جغرافیہ معجم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافیائی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی حج کو قرار دیا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا حج ایک بین الاقوامی ایوان تجارت کا کام بھی دیتا ہے۔ تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیاوی امور معلوم ہوتے ہیں لیکن سورۃ المائدہ[۲۳] میں اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے کیونکہ حجاز کی خوشحالی و ترقی اسی میں پوشیدہ ہے اور خدا اس مرکز عظیم کو ویران و اجاڑ کرنا نہیں چاہتا۔

(۲)۔ حج اسلامی وحدت کا ذریعہ ہے۔ یہ وحدت و اخوت مقامی پیمانے پر نماز کے ذریعہ اور عالمی سطح پر حج کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ حج کے مقررہ ایام میں پوری دنیا سے لاکھوں افراد مختلف راستوں سے اور مختلف ذرائع سے مکہ میں جمع ہوتے ہیں۔ ان کی شکلیں، رنگ، زبانیں اور لباس سب مختلف ہوتے ہیں لیکن میقات پر پہنچ کر سب ایک ہی طرز کا سادہ لباس (احرام) پہن لیتے ہیں۔ سب ایک مرکز (خانہ کعبہ) کے گرد گھومتے ہیں سب کی زبانوں پر ایک ہی زبان کا ایک ہی نعرہ (تلبیہ) ہوتا ہے۔ اخوت و وحدت کا اس سے شاندار نظارہ کوئی مذہب پیش نہیں کرسکا ہے شاہ و گدا اور امیر و غریب کی تخصیص کے بغیر سب ایک ساتھ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ منیٰ میں سب اکھٹے قیام کرتے ہیں۔ عرفات میں اکھٹے وقوف ہوتا ہے۔ مزدلفہ میں رات کو چھاؤنی ڈالی جاتی ہے پھر سب ایک ساتھ منیٰ کی طرف پلٹتے ہیں ان تمام اعمال میں زبردست اجتماعیت اور وحدت و یک رنگی ہوتی ہے۔ جو ذہنوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمام عصبیتوں کی نفی کرنے والی اس عبادت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ ذہنوں کو فرقہ پرستی، مقامیت، گروہ بندیوں اور تفرقے سے پاک کرکے ان میں ایک روحانی آفاقیت کو جنم دیتی ہے۔

(۳)۔ حج قیام امن کا بے مثال ذریعہ بھی ہے۔ ضروری ہے کہ سال کے چار مہینے جو حج اور عمرے کے لئے مقرر کیے گئے ہیں۔ دنیا میں عموماً اور بیت اللہ کی طرف آنے والے راستوں میں خصوصاً امن رہے۔ اس طرح یہ دنیا میں قیام امن کی سب سے بڑی اور مستقل تحریک ہے۔

اشہر حرام چار ہیں۔ تین ماہ مسلسل آتے ہیں۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک علیحدہ یعنی رجب۔ اسلام کم از کم ان چار مہینوں میں قیام امن کو یقینی بنانا چاہتا ہے۔ اسی حج کی وجہ سے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا گیا ہے جو رہتی دنیا تک امن کا شہر ہے[۲۴] جس میں انسان تو کیا حیوانات اور نباتات تک کی زندگیاں محفوظ ہیں۔

(۴)۔ حج مسلمانوں میں حقیقی روحانیت پیدا کرتا ہے۔ حج کے مناسک، احکام اور ہدایت طبیعتوں میں حوصلہ، صبر، تواضع، تعاون، شفقت اور سادگی پیدا کرنے کے لئے ایک روحانی و جسمانی تربیت اور اصلاحی مشق ہے۔

حج کی تیاریوں کا آغاز عموماً ماہ رمضان سے شروع ہو جاتا ہے پھر حج کے بعد واپسی میں بھی خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے اس طرح رمضان سے لے کر تقریباً ربیع الآخر تک حج کے لئے آنے جانے والوں کی گہما گہمی رہتی ہے اور اس طرح چھ سات ماہ تک عالم اسلام میں عملاً ایک طرح کی دینی حرکت جاری رہتی ہے۔ حجاج کرام براہ راست روحانی کیفیات سے سرشار ہوتے ہیں وہ قرآن کی سرزمین کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے ہیں، ان مقامات پر توبہ استغفار کے ساتھ ساتھ دعائیں کرتے ہیں، جہاں حضرت آدم[۲۵] وحوا نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد پناہ ڈھونڈی، جہاں حضرت محمد ﷺ نے اپنی بچپن، جوانی گذاری، اسلام کے ابتدائی سالوں کے مصائب جھیلے۔ ان مقامات کی زیارت کا زبردست نفسیاتی اثر دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ یہاں سے ایک نئی زندگی لے کر پلٹتے ہیں۔ اور اپنے ان تجربات و کیفیات میں حجاج کرام ان لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو اس فریضہ کی ادائیگی سے ہنوز نہیں گذرے لہٰذا حاجیوں کو رخصت کرنے اور ان کا استقبال کرنے اور ان سے حج کے حالات سننے کی وجہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی سوئی ہوئی روحیں بھی بیدار ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم [۲۶] ہے کہ ''حجاج کی مشایعت اور استقبال کیا جائے۔'' تو اس میں بھی یہی حکمت ہے۔ اس طرح حج کی وجہ سے تمام روئے زمین

پر مسلمانوں کی بیداری کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ اسرار حج پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ بھی تطہیر نفس کا ایک ذریعہ ہے کہ آدمی کسی ایسے مقام کی زیارت کے لئے جائے اور کچھ دنوں کے لئے وہاں قیام کرے جسے صالحین قابل تعظیم و تکریم سمجھتے ہوں وہاں اکثر قیام رکھتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو اعمالِ خیر وہ بجا لاتے ہیں ان کا رنگ اس پر بھی چڑھنے لگتا ہے اور ان کے انوار اس پر بھی نورا فگن ہوتے ہیں۔'' ۲۷

الغرض حج اسلامی عبادات کا اہم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی شوکت اور عالمی حیثیت کا سب سے اہم مظہر ہے۔

❖

حواشی و حوالہ جات:

۱ سیرۃ النبی، جلد ۵، ص ۲۴۳۔

۲ اردو دائرہ معارف الاسلامیہ، جلد ۱۷، ص ۳۲۴، مادہ کعبہ (بحوالہ اخبار مکہ از الارزقی اس بیان کے اثبات میں وہ زین العابدین اور ابن عباس سے منقول روایات بیان کرتے ہیں) النووی نے بھی اپنی کتاب تہذیب الاسماء و اللغات میں فرشتوں کی تعمیر کعبہ کو اولین تعمیر قرار دیا ہے۔

۳ ایضاً۔

۴ ایضاً، ص ۳۳۳ (بحوالہ تاریخ مکہ از الارزقی)

۵ سورۃ آل عمران: ۹۶-۹۷، ترجمہ [بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک

پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔]

٦ البقرہ: ١٢٥۔ ٧ الحج: ٢٧۔

٨ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل، ص ٢٠٠۔

٩ ایضاً، جلد دوم، ص ١٣٧، ١٤١۔

١٠ دائرہ معارف الاسلامیہ، جلد ٧، ص ٩٠٩ (مادہ حج)۔

١١ نعمانی، مولانا محمد منظور، معارف الحدیث، جلد ٤، ص ١٨٨ (بقول راحج)۔

١٢ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ٢، ص ١٧٤۔

١٣ صحیح بخاری، جلد اوّل، ص ٥٦٦۔

١٤ سیرۃ النبی، جلد ٥، ص ٢٦٤ (بحوالہ طبقات ابن سعد)۔

١٥ صحیح بخاری، جلد اوّل، ص ٥٦٦۔ حج مقبول یا حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو سراپا نیکی ہو۔

١٦ اصلاحی، صدرالدین، اسلام ایک نظر میں، ص ١٥٠ (بحوالہ سنن کبریٰ، جلد ٤، باب امکان الحج)۔ ١٧ ایضاً۔

١٨ صحیح مسلم، کتاب الحج نیز صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب المناسک۔

١٩ صحیح بخاری، ص ٥٢٦۔

٢٠ معارف الحدیث، جلد ٤، ص ٢٥٥ (بحوالہ صحیح مسلم)۔

٢١ ایضاً (بحوالہ موطاء امام مالک) ٢٢ سیرۃ النبی، جلد ٥، ص ٢٨٦۔

٢٣ المائدہ: ٢ ترجمہ [اور ان لوگوں کو نہ ستاؤ جو اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جارہے ہوں۔]

٢٤ القصص: ٥٧۔ ٢٥ سیرۃ النبی، جلد ٥، ص ٢٩٥۔

٢٦ دائرہ معارف الاسلامیہ، جلد ٧، ص ٩٢٣ (مادہ حج)۔

٢٧ حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل، ص ٢٠١۔

نظام ہائے حیات

اسلام کا اصل موضوع انسان ہے اور اس کی تعلیمات کا نقطۂ آغاز نفسِ انسانی کی تہذیب و اصلاح ہے۔ وہ انسان کو اس کائنات میں اس کے بالکل صحیح مقام سے روشناس کرانا چاہتا ہے اور عقائد و ایمانیات کے ذریعے کائنات اور اس کی حقیقتوں، زندگی اور اس کے مقاصد سے انسان کا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور ان کی عملی تربیت کے لئے عبادات کے ذریعے اپنا مطلوبہ انسان تیار کرتا ہے۔ یہ افراد ایک اسلامی معاشرے کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ یہ کوئی فلاطونی بیانیہ نہیں ہے بلکہ اس کے نظائر ہمیں قرنِ اولیٰ میں نظر آتے ہیں اور آج بھی ''روحِ بلالیؓ'' پیدا ہونے کی شرط پر نظر آسکتے ہیں۔

اس اسلامی معاشرے کے خدو خال کیا ہونے چاہئیں؟ اس بارے میں بھی قرآن بھرپور رہنمائی کرتا ہے اور کچھ ایسے اصول دیتا ہے جن پر عصری تقاضوں کے مطابق نظامِ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ ابواب میں نظامِ فکر کے حوالے سے جو عقائد و ایمانیات سامنے آئے ہیں وہ دراصل زندگی کے لئے اعتقادی تصورات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اعتقادی تصورات جو انسان اور کائنات کے حوالے سے اٹھنے والے ہر سوال کا شافی جواب مہیا کرتے ہیں اور ہر شعبہ ہائے حیات کے لئے باقاعدہ ایک مکمل نظام بھی وضع کرتے ہیں جو اپنی فکر، اصول، طریقہ کار اور مقاصد اور اثرات کے اعتبار سے دیگر مذاہب یا مفکرین کے پیش کردہ نظام ہائے حیات سے مختلف ہیں اور انسانیت کے طویل تجربے نے انہیں نتائج کے اعتبار سے انسانیت کے لئے زیادہ بہتر اور موثر پایا ہے۔

ان میں سے پانچ نظام اہم ہیں جو اپنی وسعت کے اعتبار سے پوری حیات انسانی کا احاطہ کر سکتے ہیں۔

١۔ اخلاقی نظام

٢۔ معاشرتی نظام

٣۔ سیاسی نظام

٤۔ معاشی یا اقتصادی نظام

٥۔ عدالتی نظام

آئندہ صفحات میں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

انیسواں باب:

اسلام کا اخلاقی نظام

علم الاخلاق کی ممکنہ حد تک آسان اور جامع تعریف یہ ہوسکتی ہے:

''جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے وہ علم الاخلاق کہلاتا ہے۔''

علم الاخلاق کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے خیر وشر اور نیکی و بدی کو واضح کر کے بیان کردے۔اس کے آگے انسان کی اپنی مرضی اور قوتِ ارادی ہے کہ وہ علم اخلاق کے اوامر (احکام) کو کس حد تک بجالاتا ہے اور نواہی (ممنوعات) سے کس حد تک پرہیز کرتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ علم الاخلاق میں یہ استطاعت وقدرت نہیں کہ وہ تمام انسانوں کو صالح اور نیکوکار بنادے، اس کی مثال ایک طبیب کی سی ہے۔طبیب کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ مریض کو اس کے مرض کی تشخیص کرنے کے بعد اسے بعض چیزوں سے پرہیز بتائے اور بعض دوائیں دے کر اسے استعمال کرنے کی تاکید کرے۔اس کے بعد یہ مریض پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک پرہیز کرتا ہے اور کہاں تک طبیب کی بنائی ہوئی ہدایت کے مطابق پابندی سے دوائیں استعمال کرتا ہے۔اگر مریض طبیب کی بتائی گئی ہدایات پرعمل نہیں کرے گا تو اس کا مرض بڑھتا جائے گا اور طبیب اسے اس مرض کی تکالیف سے بچانے میں بے بس ہوگا۔

انسانی اعمال کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ ارادی اعمال، یعنی وہ اعمال جو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انجام دیئے جائیں۔ جو

عامل کے اختیار اور ارادے سے صادر ہوں اور عمل کے وقت عامل خوب جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

۲۔ غیر ارادی اعمال، یعنی وہ اعمال جن کے انجام دینے میں انسانی ارادے کا دخل نہ ہو۔ مثلاً سانس لینا، پلک جھپکنا، دل کا دھڑکنا وغیرہ۔

علم الاخلاق کا موضوع انسان کے ارادی اعمال ہیں۔ ارادی اعمال میں انسان کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اس کو مکلّف اور جوابدہ بناتا ہے۔

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی حس فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ مختلف انسانوں میں اس حس کی شدت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن مجموعی طور پر انسانی معاشروں نے بعض اوصاف پر نیکی، حسن اور خوبی کا اور بعض پر بدی، بدصورتی اور برائی کا ہمیشہ حکم لگایا ہے مثلاً سچائی، عدل و انصاف، دیانت، امانت، پاسِ عہد، ہمدردی، رحم، سخاوت، صبر و تحمل، استقامت، استقلال، بہادری، شجاعت، فرض شناسی، ذمہ داری وغیرہ کو ہر معاشرے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، اور ان اوصاف کی قدر کی گئی ہے۔ دوسری طرف جھوٹ، ظلم، بدعہدی، خیانت، خودغرضی، سنگدلی، بخل، بزدلی، کم ظرفی، کج خلقی اور غیر ذمہ داری وغیرہ کو ہمیشہ ہی ناپسند کیا گیا ہے۔ ان اوصاف نے کبھی بھی اخلاقی محاسن کی فہرست میں جگہ نہیں پائی گویا انسانی اخلاقیات عالمگیر سچائیاں ہیں جن کو تمام انسان جانتے چلے آئے ہیں، وہ ایسی جانی پہچانی (معروف) چیزیں ہیں جن کا شعور انسان کو ودیعت کر دیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

فالهمها فجورها و تقوها (الشمس:۸)

[پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔]

گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدائشی طور پر بُرے اور بھلے کی تمیز عطا کر دی ہے، یہی بات سورۃ البلد میں فرمائی گئی ہے:

و هدينه النجدين (البلد:۱۰)

[اور ہم نے اس کو خیر وشر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیئے۔]

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

انا ھدینہ السبیل اما شاکراً وّ اما کفوراً (الدھر:۳)

[ہم نے اس کو راستہ دکھایا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر بن کر۔]

اس بات کو سورۃ قیامہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس لوّامہ (جسے ضمیر کہا جا سکتا ہے) موجود ہے جو برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے۔ [1] اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ [2]

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نیکی کے لئے ''معروف'' اور بدی کے لئے ''منکر'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی نیکی اور خیر وہ چیزیں ہیں جنہیں سب بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ کہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔

تاہم نیک و بد اور خیر و شر کا یہ علم جو انسان کو ودیعت کیا گیا ہے، حیوانات کی حد تک کافی لیکن انسانوں کی حد تک ناکافی ہے۔ کیونکہ انسان کے ساتھ بہت سی ذہنی اور خارجی قوتیں ایسی بھی لگی ہوئی ہیں جو اس کو بُرے اعمال کی طرف کھینچتی بھی ہیں اور اس کی مناسب تاویل بھی مہیا کرتی ہیں جس کی وجہ سے حق و باطل دھندلا جاتے ہیں مثلاً ایک شخص ظالم بادشاہ کے آگے حق بات کہنے کو بہادری جبکہ دوسرا شخص حماقت سمجھ سکتا ہے۔ یہی معاملہ دیگر انسانی صفات کے ساتھ بھی ہے، سخاوت کب اسراف بن جاتی ہے، شجاعت کب حماقت ٹھہرتی ہے اور محبت کب مصیبت بن جاتی ہے، یہ وہ ابہام ہے جو الہام و وجدان کے ذریعہ دور نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کمی کو خارجی طور پر انبیاء کو مبعوث کر کے پورا کیا۔ وہ انسانی معاشرے جو خدائی نظام (نبوت وغیرہ) کے قائل نہیں ہیں وہ اس کمی کو اپنے دانشوروں، مقنّنین یا مصلحین سے پورا کرتے ہیں۔

ایک مکمل اخلاقی نظام کے لئے ضروری ہے کہ وہ فلسفہ اخلاق کے حوالے سے پیش کردہ کم از کم چار بنیادی سوالات کے جواب فراہم کرے۔

پہلا سوال: انسان اور کائنات کے بارے میں اس کے تصورات کیا ہیں؟

دوسرا سوال: فطرت (الہام یا وجدان) کے علاوہ خیر و شر کی شناخت کا اس کے پاس کیا ذریعہ یا ماٰخذ ہے؟

تیسرا سوال: انسانوں کو خیر کی طرف مائل کرانے اور شر سے اجتناب کرنے کے لئے کیا محرکات ہیں؟

چوتھا سوال: اخلاقی قوانین کے نفاذ کے لئے اس کے پاس کیا قوت یا صلاحیت (قوت نافذہ) ہے؟

اب یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام ان بنیادی سوالات کے کیا جوابات فراہم کرتا ہے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، قرآن، خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں بڑے واضح تصورات اپنے پیروکاروں کو دیتا ہے۔ جہاں تک خدا کے تصور کا تعلق ہے، وہ ''الوہیت'' کا ایسا مکمل اور جامع تصور پیش کرتا ہے جو دنیا کے کسی دوسرے مذہب یا نظریہ میں نہیں ہے۔

لا الہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ''الوہیت'' کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے۔[۳] چنانچہ الوہیت کے بارے میں تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل کرتے ہوئے قرآن بتاتا ہے کہ الہٰ صرف وہی ہوسکتا ہے جو یکتا، بے نیاز، صمد اور قیوم ہو، کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات کا خالق ہو جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے، جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو جس کا علم سب پر محیط اور رحمت سب پر وسیع اور طاقت سب پر غالب ہو۔ جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ نہ ہو، جو زندگی بخشنے اور وسائل مہیا کرنے والا ہو، جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو، اسی کو جزا و سزا کا اختیار ہو۔ قرآن ''الوہیت'' کی جو صفات بتاتا ہے وہ نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے الہٰ ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے متصف ہوں۔ نہ الوہیت کی یہ صفات وقتی اور زمانی ہیں کہ ایک ''الہٰ'' کبھی تو ان سے متصف ہو اور کبھی نہ ہو۔ نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک الہٰ میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔[۴]

انسان کے بارے میں قرآن یہ واضح تصور دیتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے۔ یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے وہ سب خدا کی مِلک ہیں حتیٰ کہ انسان کا اپنا جسم تک اس کی نہیں بلکہ خدا کی مِلک ہے۔ خدا نے انسان کو اس کائنات کی تمام چیزوں پر تصرف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے اور اسی ماموریت میں اس کا امتحان ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ جس کا آخری اور مکمل نتیجہ آخرت میں سامنے آئے گا اور ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا ملے گی۔

خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں ان واضح تصورات کے بعد فلسفۂ اخلاق کے وہ دیگر سوالات بھی حل ہوتے ہیں جنہیں مختلف ادوار میں مختلف فلسفیوں نے چھیڑا۔ مثلاً فلسفۂ اخلاق کا ایک اہم سوال یہ رہا ہے کہ وہ اصل اور انتہائی بھلائی کیا ہے جس تک پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہئے۔ اس سوال کا جواب کسی کے نزدیک خوشی کا حصول، کسی کے نزدیک کمال کا حصول اور کسی کے نزدیک محض فرض برائے فرض ہے۔ یعنی انسان نیکی کیوں کرے؟ اس کا جواب بعض کے نزدیک یہ ہے کہ اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ مکمل جواب نہیں کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی خوشی؟ آیا وہ جو جسمانی اور نفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے یا وہ جو ذہنی ترقی کے مدارج طے کرنے سے حاصل ہوتی ہے، نیز کس کی خوشی؟ آیا ہر شخص کی ذاتی خوشی، یا اس جماعت کی خوشی جس سے وہ انسان وابستہ ہے، یا تمام انسانوں کی خوشی یا فی الجملہ دوسروں کی خوشی؟

اسی طرح کمال کو مقصود قرار دینے والوں کے لئے بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً کمال کا تصور اور اس کا معیار کیا ہے اور کمال کس کا مقصود ہے۔ فرد کا، جماعت کا یا انسانیت کا؟ اسی طرح جو لوگ فرض برائے فرض کے قائل ہیں اور ایک غیر مشروط واجب اطاعت قانونِ فرض (Catagorical Imperatie) کی بے چوں و چرا اطاعت ہی کو سب سے بڑی بھلائی قرار دیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون فی الواقع کیا ہے؟ کس نے اس کو بنایا؟ اور کس کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے۔[5]

اس کے مقابلہ میں قرآن، خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں جو تصور دیتا ہے اس کی بنیاد پر بلند ترین بھلائی جو کسی انسان کا مقصود ہونا چاہئے وہ اطاعت کے ذریعہ خدا کی رضا کا حصول اور آخرت کی کامیابی ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام اخلاق میں کسی طرز عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ عمل، مقصود کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہے۔

اس طرح یہ بات بھی یہیں سے متعین ہوجاتی ہے، جو دوسرے سوال کا جواب بھی ہے، کہ انسان کے لئے خیر و شر اور نیک و بد کی شناخت کا ذریعہ (فطرت کے علاوہ) ''وحی الٰہی'' ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ذرائع مثلاً انسانیت کا تجربہ، علم، عقل وغیرہ اصل ماخذ (وحی) کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل مآخذ نہیں ہیں۔ یہ فلسفہ اخلاق کا دوسرا بڑا سوال ہے کہ (وجدان کے علاوہ) ہمارے پاس خیر و شر کو جاننے کا ذریعہ یعنی مآخذ کیا ہونا چاہئے؟ اسلام ہمیں ایک متعین ماخذ دیتا ہے (یعنی قرآن اور سنت) جس سے ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں جو خانگی زندگی کے معمولی معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک میں راہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق (wider application) پایا جاتا ہے جو کسی مرحلہ پر کسی دوسرے ذریعہ علم کی ضرورت نہیں ہونے دیتا۔[۶]

دیگر نظام ہائے حیات میں اسی سوال کے دوسرے جوابات دیئے گئے ہیں۔ مثلاً بعض کے نزدیک خیر و شر کو جاننے کا ذریعہ ''انسانیت کا تجربہ'' ہے۔ کسی کے نزدیک قوانین حیات کا علم ہے اور کسی کے نزدیک انسانی عقل۔ دنیا کے مختلف اخلاقی نظام انہی ذرائع پر انحصار کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی اخلاقی نظام میں انسانیت کے تجربے کو اہمیت دی جاتی ہے کہیں قوانین حیات کے علم کو اور کہیں فقط علم کو اور کہیں فقط عقل کو لیکن یہ سب ذرائع ناقص ہیں۔

انسانیت کے تجربے سے صحیح علم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے متعلق مکمل اور مفصل معلومات یکجا ہوں اور کوئی کامل متوازن ذہن کا حامل ان سے نتائج اخذ کرے۔ جبکہ عملی زندگی میں یہ دونوں مثالی چیزیں نہیں۔ اوّل تو انسانیت کا تجربہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ

جاری ہے پھر اب تک کا جو تجربہ ہے اس کے بھی مختلف اجزاء مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور وہ مختلف طور پر اپنی ذہانت اور ذہنیت کے مطابق ان سے نتائج نکال رہے ہیں۔ لہٰذا یہ ذریعہ یا مآخذ مستقل اور مکمل نہیں ہے۔

یہی معاملہ علم اور عقل کا ہے نہ کوئی دانشور اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسے قوانین حیات اور حالات کا مکمل علم حاصل ہے اور نہ ہی کوئی عاقل، اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عقل کل ہے۔ علم اور عقل دونوں ناکافی ذرائع ہیں۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے تو اسلام کا یہ تصور کائنات وانسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لئے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ اللہ کو مانے اور اس کی بندگی اور رضا کو اپنا مقصد زندگی بنائے، اس بات کے لئے کافی محرک ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے جو شخص احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لئے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے، خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے۔ اس کے برعکس جو اس دنیا میں خدا کی نافرمانیاں کرے گا اور اطاعت کی جگہ سرکشی کا رویہ اختیار کرے گا اسے آخرت میں شدید سزا بھگتنی پڑے گی خواہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے، یہ امید اور خوف ایسی زبردست قوت محرکہ ہے جو انسانوں کو ایسے موقعوں پر بھی نیکی پر آمادہ کر سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں بظاہر سخت نقصان دہ نظر آ رہا ہو۔ اسی طرح یہ قوت محرکہ انسانوں کو ان مواقع پر بھی بدی کے ارتکاب سے روک سکتی ہے جہاں بدی نہایت ہی پُر لطف اور نفع بخش ہو۔

فلسفۂ اخلاق کا چوتھا بنیادی سوال یہ ہے کہ قانونِ اخلاق کے پیچھے وہ کونسی قوت ہے جس کے زور سے یہ قانون نافذ ہو؟ اس کے جواب میں مسرت اور کمال کو اصل بھلائی جاننے والے کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنے اندر ایسی داخلی قوت رکھتی ہیں کہ انسان ان کی پیروی کرتا ہے نیز رنج اور پستی کی طرف لے جانے والی برائیوں میں اجتناب کی ایسی داخلی قوت ہوتی ہے کہ انسان خود ہی ان سے رک جاتا ہے۔ اس نظریہ کے حامل لوگوں

کے نزدیک قانون اخلاق پر عمل درآمد کرانے کے لئے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دوسرا گروہ جو قانون فرض کا ماننے والا ہے کہتا ہے کہ قانون فرض چونکہ ارادی طور پر انسان نے اپنے اوپر عائد کیا ہے لہٰذا اس کی پیروی کرانے کے لئے کسی خارجی دباؤ کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں نظریات نے انفرادی خودسری اور بے راہ روی یہاں تک بڑھادی کہ ایک صالح اور انسانیت نواز معاشرہ کا قیام مزید دشوار ہوگیا۔

اسی ضمن میں تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانون اخلاق کے لئے اصل قوت نافذہ سمجھتا ہے اور چوتھا گروہ معاشرے کے دباؤ کو۔ ان دونوں خارجی قوتوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے لیکن دونوں ہی مکمل نہیں بلکہ ناقص ہیں۔ کسی شخص کی برائی سے اس لئے بچنا کہ معاشرہ اسے برا سمجھتا ہے یا حکومت کی طرف سے گرفت کا خطرہ ہے۔ نظام اخلاق کے لئے ایک بہت ہی ناپائیدار بنیاد ہے۔ جہاں تک معاشرتی دباؤ کا تعلق ہے اس کی اخلاقی حیثیت تو ہوتی ہے، قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف حکومت کی گرفت سے بچنے کے ہزارہا طریقے ہیں۔ مثلاً امریکی ساحلی ریاست میں کیسینو (جوئے کے اڈے) کی تعمیر قانوناً جرم ہے۔ جوئے کے شائقین نے اس کا یہ حل نکالا کہ ساحل پر کھڑی بڑی بڑی کشتیوں میں کیسینو کھول لیے (یعنی زمین کے بجائے سمندر میں کیسینو کھول لئے جہاں امریکی ریاست کا قانون نہیں چلتا)۔ حکومتی گرفت سے بچنے کی ایسی متعدد مثالیں یورپ اور امریکہ کے مہذب معاشروں سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں اسلام داخلی طور پر عقیدہ توحید اور آخرت کو اور خارجی طور پر اسلامی ریاست کو قانونِ اخلاق کے لئے قوت نافذہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام ایک طاقتور رائے عامہ بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام اپنے ماننے والوں کے دل میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ ان کا معاملہ اس قادر مطلق کے ساتھ ہے جو ہر وقت ہر جگہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ دنیا بھر سے چھپ سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں

چھپ سکتے۔ وہ صرف یہی نہیں کہ ان کے ظاہری اعمال سے باخبر ہے بلکہ ان کے دلوں کا حال اور نیتوں تک سے واقف ہے، دنیا بھر کو (بشمول حکومت اور قانونی ادارے) دھوکہ دیا جا سکتا ہے مگر اللہ کی گرفت سے بچنا ممکن نہیں۔ جس کے حضور آخرت میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہی ہوگا۔ یہ عقیدہ انسان کو اندر سے ان امور کے ارتکاب سے روکتا ہے جس سے رکنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے خواہ خارجی طور پر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔

المختصر اسلام اپنا تصور کائنات اپنا معیار خیر و شر، اپنا ماخذ علم الاخلاق، اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محرکہ رکھتا ہے اور ان کے ذریعہ سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اس بناء پر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے جس کی کم از کم یہ تین اہم خصوصیات ہیں۔

(۱) پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک بلند ترین معیار فراہم کرتا ہے۔ ایک مآخذ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور زوال کی گنجائش نہیں۔ خوفِ خدا کے ذریعہ سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے خیر اور معروف کی پابندی کراتی ہے اور عقیدۂ توحید و آخرت کی صورت میں وہ قوت متحرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔[۸]

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کا انطباق انسان کی خانگی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو تک وسیع ہے۔ انسان کا انفرادی رویہ، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، مدرسہ، عدالت، پولیس، چھاؤنی، میدان

جنگ، صلح کانفرنس غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاق کو حکمران بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں، خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کے بجائے اخلاق کے ہاتھ میں ہوں۔[۹]

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو، اس کی دعوت یہی ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت نے ہمیشہ بھلا جانا ہے اسے قائم کیا جائے اور جن اوصاف کو انسانیت نے ہمیشہ برا جانا ہے اسے دبایا جائے، اس دعوت پر جنھوں نے لبیک کہا انہیں کو جمع کر کے اسلام نے ایک امت بنائی جس کا نام "مسلم" تھا۔ امت مسلمہ کے قیام کی واحد غرض یہی تھی کہ دنیا میں معروف کو قائم رکھنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لئے ایک منظم سعی کی جائے۔[۱۰]

اب ایک سوال جو باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اگر بھلائی اور برائی جانی پہچانی ہے اور دنیا ہمیشہ سے بعض امور کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو دنیا میں مختلف اخلاقی نظام کیوں پائے جاتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی اخلاقیات کا وہ طبعی اور حسّی علم جو انسانی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے، نامکمل ہے اور بعض حالات میں ناقص بھی۔ چنانچہ عقل اور وجدان[۱۱] سے غلطی ہوتی آئی ہے اور بعض حالات میں وراثتی اور ماحولیاتی اختلافات، وجدانی اور عقلی فیصلوں میں اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔ اسی اختلاف نظر کی وجہ سے دنیا میں مختلف اخلاقی نظام پائے جاتے ہیں۔

عقل اور وجدان کے ناقص یا نامکمل ہونے کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک وقت میں ایک انسان ایک عمل کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے لیکن جوں جوں اس کی عقل ترقی کرتی ہے اور وہ فکر اور تدبر کی منازل طے کرتا ہے تو اس کا وجدان اس کے پہلے عمل کو (جو پہلے اس کے نزدیک درست تھا) غلط سمجھنے لگتا ہے۔

اسی طرح سے بعض افراد کا وجدان (مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے) بعض افراد کے مقابلے میں کمزور ہوتا ہے۔ انسان کے دوسرے قویٰ اور ملکات کی طرح وجدان کے لئے بھی یہ ممکن ہے کہ تربیت کے ذریعے اس کی نشو ونما ہو اور تربیت نہ ہونے کی صورت میں اس میں کمزوری اور اضمحلال پیدا ہو جائے۔ مثلاً ہمارا وجدان ہمیں ایک کام کرنے کا حکم دیتا ہے، مگر ہم اس کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ سخت اذیت و ملال محسوس کرتا ہے، جب ہم دوسری بار اس کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ نسبتاً کم اذیت اور ملال محسوس کرتا ہے۔ بار بار کی حکم عدولی سے بالآخر ہمارے وجدان کا احساسِ اذیت ختم ہو جاتا ہے اور وجدان کمزور پڑ جاتا ہے۔

ظاہر ہے ایک قوی وجدان والے شخص اور ایک ضعیف وجدان والے شخص کے نظریات خصوصاً معیارِ حسن و قبح میں واضح فرق ہوگا۔ یہی فرق دنیا میں مختلف اخلاقی نظاموں کے آغاز کا باعث بنتے ہیں۔

ہر دور میں اخلاقیات کی تدوین اور تشریح کے لئے خارج سے بندوبست کیا گیا ہے۔ بعض اوقات یہ بندوبست انسان نے اپنے طور پر کیا ہے جس کے نتیجے میں حکماء اور دانشور پیدا ہوئے اور بعض اوقات یہ بندو بست خالقِ کائنات کی طرف سے ہوا ہے، جس کے نتیجے میں انبیاء اور رسل مبعوث کیے گئے۔ ان دونوں گروہوں نے اخلاقیات کی جو تدوین اور تشریح کی اس کے فرق کی وجہ سے بھی دنیا میں مختلف اخلاقی نظام ہمارے سامنے آئے۔

انبیاء جو کہ مامور من اللہ ہوتے ہیں اور جن کی تعلیمات کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوتی ہے، ان کا وضع کردہ نظامِ اخلاق اور ہوتا ہے جبکہ حکماء کے نظریات کی بنیاد ان کا تجربہ، عقلی شعور اور وجدان ہوتا ہے لہٰذا ان کا وضع کردہ اخلاقی نظام کچھ اور ہوتا ہے۔[12] بعض معاملات میں ان دونوں میں اتفاقِ رائے بھی ہوسکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اختلافِ رائے کی گنجائش بھی موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مظلوم کی مدد کرنا خدا کا حکم بھی ہے اور انسانی ضمیر کا فیصلہ بھی یہی ہوسکتا ہے لیکن نماز پڑھنا ایک کے نزدیک خدا کا حکم ہے لہٰذا ضروری ہے، مگر بعض حکماء کی عقل اسے محض وقت کا زیاں سمجھتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

۱. القیامہ:۲۔
۲. القیامہ:۱۴-۱۵۔
۳. مودودی، سید ابوالاعلیٰ، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی**، ص ۱۴۹-۱۵۰، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
۴. ایضاً، ص ۱۵۰-۱۵۱۔
۵. مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، **اسلامی نظام زندگی**، ص ۴۴، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔
۶. مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، **اسلام کا اخلاقی نظام**، ص ۸۱، مقالہ در اسلامی تہذیب وثقافت، پٹنہ، ۱۹۹۹۔
۷. **اسلام کا اخلاقی نظام**، ص ۸۲۔
۸. ایضاً، ص ۸۳۔
۹. ایضاً۔
۱۰. ایضاً۔
۱۱. وجدان یا ضمیر (concious) انسان کی ایک نفسی قوت کا نام ہے جو اس کو برے کام سے اس وقت روکتی ہے جب اسے برے کام کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اگر پھر بھی انسان وہ برا کام کرلے تو کرب اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح یہ قوت اس کو واجب اور ضروری اعمال کرنے پر ابھارتی ہے اور جب انسان وہ کام کرلیتا ہے تو اطمینان اور راحت حاصل کرتا ہے۔
۱۲. ندوی، سیّد سلیمان، **سیرۃ النبی**، جلد ۶، ص ۲۲، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۵ء۔

بیسواں باب:

اسلام کا معاشرتی نظام

معاشرہ یا معاشرت کے لغوی معنی ہیں مل جل کر زندگی بسر کرنا۔ اصطلاحاً معاشرہ اس اجتماعِ افراد کو کہتے ہیں جس کے سامنے زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور مقاصد ہوں۔ ہر معاشرہ مخصوص عقائد و نظریات کا حامل ہوتا ہے جس کے تحت وہاں کے لوگ خانگی اور شہری تعلقات قائم کرتے ہیں۔ وہ معاشرہ جو اسلامی اصولوں پر کاربند ہو، اسلامی معاشرہ کہلائے گا۔

انسان ہمیشہ سے مدنی الطبع رہا ہے اور اپنی فطرت میں جماعتی اور معاشرتی زندگی کا محتاج ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک معاشرے کا محتاج ہے۔ دنیا میں آتے ہی ایک بچہ پرورش کے لئے اپنے ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو خاندان، برادری اور بستی کے حوالے سے ایک شہری یا قومی نظامِ تمدن سے واسطہ پڑتا ہے، جس کا وہ خود بھی حصہ ہوتا ہے۔

معاشرے میں بے شمار روابط ہیں جو ایک انسان کو دوسرے سے باندھے جوڑے رکھتے ہیں۔ ان روابط کی درستگی کا انحصار معاملات میں عدل اور توازن پر ہے۔ یعنی معاشرے کے ہر فرد کو ٹھیک ٹھیک عادلانہ طور پر اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ بعینہٖ یہ اس کا حق ہے کہ اس کے فرائض بھی ادا کیے جائیں۔ ان حقوق و فرائض کا تعین کہاں سے ہو؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ انسانی عقل کی بنیاد پر ماہرین عمرانیات تمدنی روابط کے لئے اصول و ضوابط متعین کرتے

ہیں، لیکن اس میں وہی مسئلہ آجاتا ہے کہ انسانی عقل کی بالآخر ایک حد ہے اور ماہرین کا علم اور تجربہ ناقص بھی ہوسکتے ہیں۔ نیز نفسانی خواہشات اور ذاتی مفادات بھی مثالی رَوابط وضوابط اور ان کے اصولوں کی تشکیل میں مانع ہوسکتے ہیں۔ البتہ وہ معاشرے جو ''وحی الٰہی'' کی روشنی میں اپنے اصول اور مقاصد متعین کرتے ہیں وہ زیادہ مکمل اور عدل کے قریب ترین ہوتے ہیں۔ اسلام بھی اپنا ایک مضبوط اور پائیدار نظامِ معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول وضوابط مستقل اور محکم ہیں اور جس کا مزاج عادلانہ ہے۔

عرب کے جاہلی معاشرے میں اسلام کی دعوت ایک فکری اور ذہنی انقلاب کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ درحقیقت عالمی نظام (World Order) تھا جس کے لئے ایک جماعت کی تیاری تیرہ سال مکہ میں کی گئی۔ یہ سابقون الاولون[1] کی جماعت تھی جنہیں سخت آزمائشوں سے گزارا گیا، انہوں نے جان، مال اور جاہ و منصب کے حوالے سے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ ان کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کو ایک ایسی جماعت دستیاب ہوگئی جو فکر، عقائد اور ایمانیات کے حوالے سے بہت مضبوط تھی۔ ان کا یقین پختہ تھا، رسول اللہ ﷺ کی سربراہی نے انہیں وہ نظم وضبط، قوت ایمانی اور مقصد کے ساتھ غیر مشروط وابستگی عطا کردی تھی، کہ وہ اسلام کے پیش کردہ عالمی نظام کے قیام میں مدد کرسکتے تھے۔

اس عالمی نظام کے نفاذ کا آغاز مدینہ میں ہوا جہاں ایک اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کا قیام پہلو بہ پہلو کیا گیا۔ ریاست اور معاشرے میں تقدم کے حوالے سے دانشوروں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے تاکہ صالح افراد تیار کرکے سیاسی اداروں میں بھیجے جاسکیں، اسلامی معاشرہ ہی نہیں ہوگا تو اسلامی ریاست کیسے قائم کی جاسکے گی؟ جبکہ دانشوروں کے دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اسلامی ریاست قائم کرکے معاشرہ کو اسلامی اقدار کا پابند کیا جاسکے گا اور مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ دونوں کام پہلو بہ پہلو کیے۔ یہ درست ہے کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے مکہ میں تیرہ سال تک افراد کی ایک جماعت کو تیار کیا جاتا رہا، یہ بھی

درست ہے کہ مدینہ ہجرت سے قبل وہاں مسلم داعی بھیجے گئے جنہوں نے یثرب کے معاشرہ میں کم از کم اسلام کی قبولیت کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کر دیا تھا، لیکن کمیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مکہ سے مدینہ، ہجرت کرنے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی یہ گویا بہت بڑی جماعت نہیں تھی اسی طرح اسلام سے روشناسی کا عمل یثرب میں ہجرت سے فقط دو برس قبل ہی شروع کیا گیا تھا، اور یہ کوئی بہت طویل عرصہ نہیں تھا لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ایک معاشرتی انقلاب اور ایک اسلامی ریاست کا قیام پہلو بہ پہلو کیا۔

قرآن نے اسلامی تہذیب کے قیام کے لئے جو فکری بنیادیں (یعنی عقائد وایمانیات) دیں، اس پر مبنی مدینہ میں جو اسلامی معاشرہ قائم کیا گیا، وہ دیگر نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس، ایک فکری اور نظریاتی معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں ابتدا سے ہی مسلمانوں کو ان لوگوں سے سابقہ پیش آیا جو نظریاتی اعتبار سے مسلمانوں سے بُعد مشرقین رکھتے تھے، یعنی مشرکین اور یہود و نصاریٰ وغیرہ۔ مسلمانوں نے ان کو اپنے معاشرتی نظام میں ایک عادلانہ مقام دیا، ایسا کرنا مسلمانوں کے لئے یوں آسان ہوگیا کیونکہ قرآن نسلی وحدت کا تصور دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

> یا ایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحده و خلق منها زوجها وبث منهما رجالاً کثیراً و نساءً (النساء:۱)
>
> [اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک وجود سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔]

اس آیت سے یہ اصول وضع ہوتا ہے کہ تمام انسان جنس واحد سے پیدا ہوئے لہٰذا ان میں ایک نسلی وحدت ہے۔ اللہ نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا (آدم وحوا) پیدا کیا، پھر اسی جوڑے سے وہ اربوں افراد پیدا ہوئے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتداء میں حضرت آدم اور بی بی حوا کی اولاد ایک امت کی حیثیت رکھتی تھی جن میں ہر طرح کی نسلی، لسانی اور دینی وحدت تھی،

پھر جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین کے مختلف خطوں میں پھیلتے چلے گئے، ان کی ابتدائی ہجرتوں کا بڑا سبب معاشی رہا ہوگا، اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کی بولیوں میں فرق پڑا، ان کے لباس اور رہن سہن کے طریقے مختلف ہو گئے۔ جغرافیائی عامل نے اپنا کردار ادا کیا اور ان کے رنگ روپ اور خدو خال تک بدل گئے، اور یوں وہ مختلف نسلوں، گروہوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئے۔ صدیوں میں ہونے والے یہ اختلافات فطری اور واقعاتی ہیں اس لئے اسلام ان کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرتا ہے اور ان کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ ان اختلافات کو شناخت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ و جعلنکم شعوباً وّ قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقکم . (الحجرات:۱۳)

[اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔]

یعنی نسلی، قومی یا شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف اور شناخت کے لئے ہے۔ ایک دوسرے پر فخر کرنے یا ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے نہیں ہے، انسان کو اپنی اصل نہیں بھولنی چاہئے اور انسان کی اصل یہی ہے کہ وہ اولادِ آدم ہے اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ فتح مکہ کے دوسرے دن رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ دیا، اس میں فرمایا:

''اے قریش! جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباء واجداد پر فخر وغرور کو اپنے سے دور کر دو۔ کیونکہ تمام انسانوں کے باپ آدم تھے اور آدم مٹی سے بنے تھے۔''[۲]

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اے لوگو! تمہارا رب ایک، تمہارا مورثِ اعلیٰ ایک، تم سب آدم کی اولاد سے ہو اور آدم کا خمیر مٹی سے اٹھا تھا۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، کسی عربی کو کسی عجمی[۳] پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ فوقیت ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔''[۴]

انسانوں میں نسل، رنگ، قومیت، وطنیت اور زبان کے حوالے سے پیدا ہونے والے تعصّبات اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں، اسلام انسانوں کے مابین پیدائش کی بنیاد پر اونچ نیچ یا نسب کی بنیاد پر طبقاتی تفریق کو رد کرتا ہے اور تمام انسانوں کو نسلی اعتبار سے ایک مانتا ہے۔

اسلام کے پیش کردہ اس عالمگیر تصورِ انسانیت میں صرف ایک فرق کو مانا جاسکتا ہے اور وہ ہے فکری تفاوت جسے عقائد یا ایمانیات بھی کہا جاسکتا ہے۔ یعنی انسانوں کے مابین اگر کوئی فرق ہوسکتا ہے تو وہ نسل، رنگ، وطن یا زبان کا نہیں بلکہ فکر و نظریات کا ہوسکتا ہے۔ ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے اعتبار سے ایک ہوسکتے ہیں لیکن اگر زندگی کے بارے میں ان کے نظریات مختلف ہیں تو ان کے اخلاق اور تہذیبی رویے میں زمین و آسمان کا فرق آسکتا ہے اور فی الواقع وہ دو مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرنے والے ہوں گے۔ اس کے برعکس مشرق و مغرب کے انتہائی فاصلوں پر رہنے والے دو انسان اگرچہ نسلی، وطنی اور قومی اعتبار سے ایک دوسرے کے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، اگر ان کے نظریات یکساں ہیں تو وہ ایک فکری وحدت بنائیں گے، جسے اسلام ''امت'' کا نام دیتا ہے۔

اس نظریے کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری اور نظریاتی معاشرہ کا تصور دیتا ہے جس میں انسانوں کے باہم ملنے کی بنیاد نسل یا وطن یا قوم نہیں بلکہ اس کے عقائد و نظریات ہیں، ہر وہ شخص جو توحید، رسالت اور آخرت پر یقین رکھتا ہو، اس معاشرہ میں شامل ہوسکتا ہے خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، کالا ہو یا گورا، آزاد ہو یا غلام۔ اسلام ان سب کو یکساں حقوق عطا کرتا ہے اور انہیں ایک ہی معاشرتی مرتبے پر فائز کرتا ہے، لہٰذا اسلامی معاشروں میں طبقات کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ اس معاشرہ میں اگر کسی کو برتری یا تفوق حاصل ہوسکتا ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ مدینہ میں جب رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے نتیجے میں ایک اسلامی معاشرہ ابھرا تو وہ انہی خصوصیات کا حامل تھا، رسول اللہ ﷺ نے حتمی طور پر یہ اعلان فرمادیا تھا کہ حسب نسب اب کسی کے کام نہیں آسکیں گے، اصل چیز تقویٰ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلی عصبیت اور آباء پر فخر کا طریقہ ختم کردیا ہے۔

اب یا تو کوئی متقی مومن ہوگا یا فاجر شقی، تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، بجز تقویٰ کے۔"[۵]

رسول اللہ ﷺ اپنے خاندان اور قبیلہ پر بھی اس معاملہ میں سخت تھے کہ مبادا رسول اللہ ﷺ سے نسبت ان میں بے جا فخر و غرور کے جذبات پیدا کر دے اور وہ اسلامی مساوات کے اس راستے سے ہٹ جائیں جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ایک موقع پر اپنے افراد خانہ کو مخاطب کر کے آپؐ نے فرمایا تھا "اے آل محمد! ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس نیک اعمال لے کر آئیں اور تم حسب نسب لے کر آؤ، تم عمل کرو، میں تمہیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔"[۶]

قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے ان بیانات کی روشنی میں یہ اصول متعین کیا جا سکتا ہے کہ اسلام تمام مسلمانوں کے درمیان معاشرتی مساوات کا قائل ہے۔وہ مسلمانوں کو طبقات میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا بلکہ انہیں "امت واحدہ" کے طور پر دیکھتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن ان کے بارے میں کیا کہتا ہے جو نظریاتی طور پر مختلف ہیں (یعنی غیر مسلم ہیں)؟ اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے یہاں پر وضاحت کی جاتی ہے کہ اسلام ان کے ساتھ انسانی برادری کے حوالے سے تعلقات قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق عطا کرنے پر زور دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایک ماں کے دو بچے اگر اپنے خیالات و نظریات میں مختلف ہیں تو ان کے طریق زندگی میں تو بہر حال فرق آئے گا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح اولادِ آدم میں اگر نظریاتی تفریق نے انہیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے آدمیت اور انسانیت کے تعلقات منقطع ہو گئے ہوں۔اسوۂ نبوی سے اس کی مثال میثاق مدینہ کی دی جا سکتی ہے جس کے ذریعہ آپ نے یہود مدینہ کے ساتھ شہریت میں اشتراک کیا۔

اسلامی معاشرے کی پہلی خصوصیت مساوات ہے، جس کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا۔ اس کی دوسری خصوصیت اخوت ہے۔دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔

إِنَّمَا المومنونَ إِخْوةٌ۔(الحجرات:١٠)

[بے شک ایمان لانے والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔]

سورۃ توبہ میں مسلمانوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے۔

رحمآءُ بینھم۔[یعنی وہ ایک دوسرے کے لئے باعث رحمت ہوتے ہیں۔]

ایک حدیث میں آتا ہے: تم اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھو گے جیسے ایک بدن کہ اگر ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضاء کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں میں اخوت قائم کرنے کے لئے بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی بڑی اہمیت آئی ہے۔مثلاً رسول اللہ ﷺ کی ہدایت ہے کہ مسلمان آپس میں سلام کریں، مریض کی عیادت کریں، جنازے میں شرکت کریں، ایک دوسرے کی دعوتوں کو قبول کریں، آپس میں تحائف کا لین دین کریں، یہاں تک کہ چھینک کا بھی جواب دیں۔ ہر وہ بات جس سے دوسرے کا دل خراب ہو، اسلام اس کی ممانعت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مذاق مذاق میں بھی ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارنے کو بھی منع کیا گیا ہے۔

سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے۔ ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں۔ اور عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔'' (الحجرات:١١)

کئی احادیث مسلمانوں کے درمیان خوبصورت معاشرتی تعلقات قائم کرنے کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

☆ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

☆ مسلمان کبھی طعنہ دینے والا اور بکنے جھکنے والا نہیں ہوسکتا۔

☆ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

☆ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ

ناراض رہے۔

☆ آپس میں حسد نہ کرو، قیمت بڑھانے کے لئے بولی نہ لگاؤ، آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، کسی کے سودے پر سودا نہ کرو، اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

اسلام کے معاشرتی نظام کی تیسری بڑی خوبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول ہے۔ اسلامی معاشرے کے ہر فرد کو ذمہ دار اور مسئول بنایا گیا ہے۔ قرآن انہیں تاکید کرتا ہے کہ وہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور برائی کے کاموں سے ایک دوسرے کو روکیں۔

وتعاونوا على البر والتقوىٰ. ولا تعاونوا على الاثم والعدوان ۔

(المائدہ:۲)

[بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور گناہ کی باتوں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔]

اسلام معاشرے کی عام فضاء کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے اور ہر شخص پر یہ بھائی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ دامے، درمے، قدمے، سخنے برائیوں کو مٹائے اور بھلائیوں کو فروغ دے، لیکن یہ کام وہ صرف اور صرف اپنے دائرۂ عمل میں رہ کر ہی کرسکتا ہے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ دوسروں کی عملداری میں انجام دیا جائے گا تو معاشرے میں فلاح کے بجائے فساد پھیل جائے گا۔ یہی ہمارا آج کا ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث میں بھی دائرۂ عمل کی شرط رکھی گئی ہے۔

حدیث یہ ہے: ''تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ امام حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ ہر شخص اپنے اہل وعیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

اس طرح سے اسلام جو معاشرہ تشکیل دیتا ہے اس کی اصلاح کا کام بھی اسی معاشرے کے افراد سے لیتا ہے، یوں تزکیہ اور تطہیر کا کام رکتا نہیں اور معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ہوتا رہتا ہے۔

اسلامی معاشرے کے اہم ادارے:

ہر انسانی معاشرہ چند اداروں پر قائم ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ہم اداروں میں خاندان، برادری، پڑوس (محلّہ) وغیرہ شامل ہیں۔

اسلامی معاشرت میں سب سے بنیادی اور اہم ادارہ ''خاندان'' ہے۔ یہ ادارہ تمدنِ انسانی کی بقا اور نشو ونما کا ضامن ہے۔ قرآن اس ادارہ کی اہمیت کے پیش نظر ''خاندانی نظام'' کے بارے میں بڑے واضح اصول متعین کرتا ہے۔ مثلاً

خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کے ملنے سے پڑتی ہے۔ مرد اور عورت کے مابین اس تعلق کی صرف ایک صورت اسلام کے نزدیک جائز ہے اور وہ نکاح ہے۔ یہ ایک ایسا ذمہ دارانہ تعلق ہے جسے اسلام محض جائز ہی نہیں بلکہ ایک نیکی، ایک کارثواب اور ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ سنِ بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام رہبانیت کو نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فطرت سے بغاوت قرار دیتا ہے۔ نکاح کے علاوہ مرد وزن کے تعلق (زنا) کو حرام اور قانونی جرم قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے سخت سزا تجویز کرتا ہے تا کہ معاشرہ میں ایسے تمدن کش تعلقات فروغ نہ پا سکیں بلکہ وہ معاشرے سے ان محرکات کا بھی خاتمہ کر دینا چاہتا ہے جو اس ناجائز تعلق کا سبب بن سکیں، یا اس کے مواقع پیدا کرتے ہوں۔ ۷ پردے کے احکام ۸ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور گانا بجانا ۹ مخلوط مجالس اور دیگر فواحش کی روک تھام کے پیچھے یہی بنیادی مقصد کارفرما ہے کہ اسلام، خاندان کے ادارہ کو محفوظ اور مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے اور اسے اپنی رعیت (یعنی

بیوی، بچوں اور جو اس کی کفالت میں ہیں) کا ذمہ دار بنایا ہے۔ یہ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاندان کی معاشی ضروریات بھی پوری کرے اور خاندانی نظام میں انضباط پیدا کرے، اور اپنے اہل خانہ کی بہترین تعلیم و تربیت اور حفاظت کرے۔[۱۰] عورت (بیوی) کو ایک طرف شوہر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے دوسری طرف مرد کی غیر موجودگی میں اس کے گھر اور اہل کفالت افراد کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اس سلسلہ میں حقوق و فرائض کا تعین کر دیا گیا ہے تا کہ خاندانی نظام انتشار کا شکار نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے:

> ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ سو جو عورتیں نیک ہیں، اطاعت کرتی ہیں۔ مردوں کی عدم موجودگی میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔'' (النساء:۳۴)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن نے شخصی اعتبار سے مرد اور عورت کا ذکر مساویانہ حیثیت سے کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۃ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تشریح کر دی گئی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی حیثیت رکھتے ہیں۔

> للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن
> (النساء:۳۲)
>
> [مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔]

تاہم جب مرد اور عورت میں نکاح کے ذریعہ ایک تعلق قائم ہوتا ہے، اور ایک خاندان کی بنیاد پڑتی ہے تو مرد کو اس کی فطری موزونیت کی وجہ سے ناظم کی حیثیت دیتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر حکمران بنا دیا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے

اس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت اور رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لئے استعمال کرے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حق دیتا ہے اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیارات عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہو۔[۱۱] تاہم رسول اللہ ﷺ کے نزدیک طلاق ''البغض المباحات'' یعنی مباح امور میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''خاندان'' کو اسلام میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

خاندان کے بعد قرابت داروں اور رشتہ داروں پر مبنی برادری کا ادارہ اہم ہے۔ جو لوگ خونی یا صہری تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، اسلام ان کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد دیکھنا چاہتا ہے، لہٰذا قرآن میں جگہ جگہ ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی صلہٗ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔

اسلامی معاشرت میں ''ہمسائیگی'' کے تعلق کی حفاظت کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ رشتہ دار ہمسایہ۔
۲۔ اجنبی ہمسایہ۔
۳۔ عارضی ہمسایہ۔

جو ہمسایہ رشتہ دار بھی ہو ظاہر ہے اس کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے، لیکن اجنبی ہمسایہ کے علاوہ ان لوگوں کے ساتھ بھی اسلام حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے جن سے تھوڑی دیر کے لئے ہمسائیگی رہتی ہے، مثلاً دورانِ سفر، انتظار گاہوں میں، اسکول، مدرسہ، یا مارکیٹ میں کسی کے ساتھ تھوڑی دیر کی ہمسائیگی کو بھی نبھانے کی تاکید آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے ہمسایوں کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی ہے کہ میں

خیال کرنے لگا کہ شاید اب انہیں وراثت میں بھی حصہ دار بنا دیا جائے گا۔ آپؐ کے فرمان کے مطابق وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا ''وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کھائے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔'' خیال خاطر احباب کی انتہا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ اگر اپنے بچوں کے لئے پھل لاؤ تو یا ہمسائے کے گھر بھی بھیجو ورنہ کم از کم چھلکے باہر نہ پھینکو تاکہ غریب ہمسائے کا دل نہ دکھے۔ الغرض پڑوسیوں کے مابین اسلام ایسی حسنِ معاشرت کی تاکید کرتا ہے کہ پڑوسی ایک دوسرے کے ضامن اور مددگار بن جائیں، ایک دوسرے کے پہلو میں اپنے جان و مال، عزت و آبرو کو محفوظ سمجھیں۔

پڑوس اور محلّہ کے بعد ملک اور ملت وسیع تر معاشرتی دائرے میں آتے ہیں۔ قرآن ان اجتماعی معاشرت کے لئے بڑے واضح اصول متعین کرتا ہے۔ یہ اصول قرآن میں جا بجا موجود ہیں۔ سورۃ الحجرات میں اسلام کی پیش کردہ معاشرتی تعلیمات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سورۃ میں مسلمانوں کو ان برائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جو اجتماعی و معاشرتی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کی دو سورتوں یعنی سورۃ الانعام اور سورۃ بنی اسرائیل میں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کیے گئے ہیں جن پر اسلام معاشرتی نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ سورۃ الانعام مکی زندگی کے اواخر میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس کی روایت ہے کہ یہ پوری سورۃ مکہ میں بیک وقت نازل ہوئی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کو اسلام کی طرف دعوت دیتے بارہ سال گزر چکے تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھی اور مدینہ میں بھی اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی۔ ہجرتِ مدینہ سے ذرا پہلے سورۃ الانعام نازل ہوئی۔[۱۲] جس میں ان بڑے بڑے اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے جن پر اسلام، ایک معاشرہ کی بنیاد اٹھانا چاہتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

"اے محمد! ان سے کہو آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: (۱) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ (۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔[۱۳] (۳) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔ (۴) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ (۵) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔[۱۴] یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ (۶) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے۔ (۷) اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔ (۸) اور جب بات کہو، انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ (۹) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرلو۔ (۱۰) نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ، یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کردیں گے۔ یہ ہے ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔" (الانعام:۱۵۱-۱۵۳)

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل بھی قریب قریب اسی زمانے میں نازل ہوئی جب سورۃ الانعام نازل ہوئی تھی۔ سورۃ بنی اسرائیل معراج کے موقع پر نازل ہوئی۔ معراج کا واقعہ حدیث اور سیرت کی اکثر روایات کے مطابق ہجرتِ مدینہ سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا گویا سورۃ الانعام کی طرح سورۃ بنی اسرائیل بھی مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اسلام کی دعوت دیتے بارہ برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور مدینہ میں اوس وخزرج کے طاقتور قبیلوں میں ایک بڑی تعداد رسول اللہ ﷺ کی حامی بن چکی تھی۔ ہجرتِ مدینہ کا وقت قریب آرہا

تھا، جو مدینہ میں ایک اسلامی ریاست اور ایک اسلامی معاشر کے قیام کا اہم ترین وقت تھا، اس سورۃ میں ایک بار پھر اسلامی فکر (عقائد و ایمانیات) کے لئے دلائل دیئے گئے ہیں، نیز وہ بڑے بڑے تمدنی اور معاشرتی اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر آگے چل کر ایک اسلامی معاشرہ کو قائم کرنا مقصود تھا یہ گویا اسلامی ریاست و معاشرت کا ایک منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال قبل اہل عرب کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ قرآن کہتا ہے:

''تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ (۱) تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو۔ نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو ''پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔'' تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے، اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لئے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ (۳) رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ (۴) فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ (۵) اگر ان سے (یعنی ضرورت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بناء پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو تو انہیں نرم جواب دے دو۔ (۶) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ (۷) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ

کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ (۸) زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔ (۹) قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو، جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ پس چاہیئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔ (۱۰) مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ (۱۱) عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جوابدہی کرنی ہوگی۔ (۱۲) پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے اور بہ لحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔ (۱۳) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی سے باز پرس ہونی ہے۔ (۱۴) زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔"

(بنی اسرائیل: ۲۳-۳۹)

اسلام معاشرتی نظام کی بہتر ترقی کے لئے حقوق و فرائض کا ایک باقاعدہ نظام دیتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اس کا تحفظ کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کی دو اہم خصوصیات ہیں۔

۱۔ عدل۔

۲۔ احسان۔

عدل سے مراد ہے توازن اور تناسب، ایک اسلامی معاشرہ عادلانہ معاشرہ ہوگا، جہاں لوگوں کے درمیان حقوق و فرائض میں توازن او ر تناسب ہوگا۔ انسانوں کے ذاتی معاملات سے لے کر اجتماعی معاملات تک ہر معاملہ میں عدل پیش نظر رکھا جائے گا۔ یہ کم از کم

مطلوبہ معیار ہے۔

اس سے اگلا درجہ احسان کا ہے یعنی حقدار کو اس کے حق سے زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہوجانا، یہ فیاضیانہ معاملہ ہی احسان ہے۔ عدل اگر معاشرے کی بنیاد ہے تو احسان اس کا جمال اور کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرنیاں پیدا کرتا ہے، کوئی انسانی معاشرہ صرف اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر دیکھتا رہے کہ اس کا حق کیا ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے، اسے بس اتنا ہی دے دے، ایسے ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی مگر وہ محبت، شکرگذاری، عالی ظرفی، ایثار، اخلاص اور خیر خواہی کی قدروں سے بھی محروم رہے گا۔ [۱۵]

قرآن کہتا ہے:

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان (النحل: ۹۰)

[بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔]

اگر دیکھا جائے تو مطلوبہ اسلامی معاشرہ انہی اصولوں پر قائم ہوسکتا ہے۔ یہ صرف دل خوش کن نظریات نہیں ہیں جو کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفاء نے فی الواقع ایسا معاشرہ قائم کر کے بھی دکھایا۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ ''سابقون الاولون'' مسلمانوں کا وہ گروہ تھا جو رسول اللہ ﷺ پر ابتداء ہی میں ایمان لے آیا تاہم بعض مورخین اس دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے انصار ومہاجرین پر اس اصطلاح کا اطلاق کرتے ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ وہ ابتدائی مسلمان ہیں جو جنگ بدر میں شریک ہوئے اور بعض کے خیال میں سابقون الاولون وہ ہیں جو بیعت الرضوان میں شامل تھے۔ (ابن عبدالبر، الاستیعاب، جلد۱، ص۲، ۳، ۱۰، ۱۳، ۱۴، دارالجیل، بیروت، ۱۹۹۴ء)۔

۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد۲، ص۱۴۳، دارصادر بیروت، ۱۹۸۵ء۔

ابوجعفر محمد ابن جریر طبری، تاریخ الرسل و الملوک، جلد۳، ص۱۶ (طبری لکھتا ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الحجرات کی تیرہویں آیت کی تلاوت کی تھی)، دار المعارف، مصر، ۹-۱۸۶۱ء۔

۳۔ ''عجمی'' کے لغوی معنی کندزبان یا گونگے کے ہیں، کیونکہ غیر ممالک کے لوگ عرب میں جا کر وہاں کی زبان نہیں بول سکتے تھے، اس کی وجہ سے عرب انہیں عجمی یعنی گونگے کہا کرتے تھے، علاوہ ازیں یہ لفظ وہ کم شائستہ اور اجنبی آدمی کے لئے بھی بولتے تھے۔ ''عُجمہ'' عربی لفظ ''فصاحت'' کی ضد ہے۔ عہدِ جاہلیت میں چونکہ عربوں میں غیر عربوں کے مقابلے میں احساسِ تفاخر اور احساسِ برتری بہت بڑھا ہوا تھا، لہٰذا لفظ عجمی حقارت کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔

۴۔ جاحظ، ابوعثمان عمرو بن بحر، البیان و التبیین، جلد۲، ص۱۵-۱۶، مطبعۃ الفتوح الادبیہ، مصر، ۱۳۳۲ھ۔

۵۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، جلد۵، ص۱۵۵۔

۶۔ امام بخاری، صحیح بخاری، باب۱۹، کتاب الوصایا، (ھل ید خل النساء و الولد فی الارقاب)، ص۴۶، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

۷۔ تفصیلی احکامات کے لئے دیکھئے سورۃ النور۔

۸۔ پردے کے تفصیلی احکامات کے لئے رجوع کیجئے سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب۔

۹۔ لقمان: ۶۔

۱۰۔ قرآن سربراہ خاندان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی، بچوں کی ایسی تعلیم و تربیت کا بندو

بست کرے جو انہیں صالح افراد بنانے میں معاون ہو، اس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہئے کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوشحال ہوں بلکہ اس سے بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہئے کہ آخرت میں ان کی نجات ہو سکے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے معاملہ میں جوابدہ ہے۔ حکمران راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے، مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔'' (مودودی، سیّد ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ٦، ص ٣٠)۔

١١ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، **اسلامی نظام زندگی**، ص ١٠٦، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔

١٢ سورۃ الانعام ایک تفصیلی سورۃ ہے جس کے مضامین کو کم از کم سات بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے، انہی میں ایک وہ ضابطہ اخلاق ہے جسے اسلام، اسلامی معاشرت کی بنیادوں کے طور پر پیش کرتا ہے۔

١٣ یہ بات قابل غور ہے کہ والدین کے حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان کیا گیا ہے جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بعد، بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق کسی انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

١٤ یعنی انسانی جان جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھہرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ، اب رہا یہ سوال کہ ''حق کے ساتھ'' کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔

١۔ انسان کسی دوسرے انسان کے قتلِ عمد کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

٢۔ دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو، اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ ہو۔

٣۔ اسلامی حکومت کا باغی ہو۔

مزید دو صورتیں احادیث میں ارشاد ہوئیں ہیں یعنی یہ کہ ٤۔ شادی شدہ زانی ہو یا ٥۔ مرتد ہو۔

١٥ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، جلد ٢، ص ٥٦٤۔

اکیسواں باب:

اسلام کا اقتصادی نظام

لغت کی زبان میں قصد اور اقتصاد ''میانہ روی'' اور ''اچھے چلن'' کا نام ہے مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی ''دریافت'' کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت و بربادی کے ''حقیقی اسباب'' بتاسکیں، اس لئے ''علم الاقتصاد'' اس علم کا نام ہے جو ان وسائل سے بحث کرتا ہے اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہو۔ [1]

اقتصادیات کا مترادف معاشیات ہے۔ علمی دنیا کے قدیم و جدید مفکرین اور علماء نے اقتصادی مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، معاشیات کے حوالے سے نت نئے نظریات پیش کرنے اور تجربات کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون [2] (Plato) سے لے کر کارل مارکس [3] تک معاشیات کے حوالے سے کاوشیں ہوئی ہیں، جن کی حیثیت صرف علمی نظریات کی نہیں بلکہ ان پر تجربات کر کے ان کا عملی پہلو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ خصوصاً کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت (Socialism) نے اپنے عملی پروگرام کے ذریعہ سے دنیا میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ کہیں اسے قبولیت عام حاصل ہوئی اور کہیں اسے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک طویل تجربہ کے بعد بالآخر اربابِ دانش نے یہ جان لیا کہ جس طرح سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) انسانوں کے دکھ بڑھانے کا باعث بنا ہے اسی طرح اشتراکیت بھی انسانوں

کی حالت میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں لا سکی۔ یہ دونوں نظام عام انسانوں میں خوشحالی اور معاشی عدل و انصاف کی فراہمی میں ناکام رہے، اور سب سے زیادہ ناکامی اخلاقی حوالے سے آئی۔ ان دونوں معاشی نظریات اور عملی تجربات نے انسانی اخلاق کو تباہ کیا اور خالق و مخلوق کے رشتے کو کمزور سے کمزور تر کیا، جس کے نتیجے میں دنیا میں فساد بڑھا اور امن و سلامتی کو سخت نقصان پہنچا۔ گویا نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں نظام ہائے معاشیات ''فاسد معاشی نظام'' ثابت ہوئے۔

افلاطون اپنی شہرۂ آفاق کتاب جمہوریہ (Republic) میں اقتصادی حیثیت سے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کی دعوت دیتا ہے اور زیر دستوں پر زبردستوں کی چیرہ دستی کے لئے راہ ہموار کرتا ہے، ایک طرف صنفی تعلقات میں انارکی پیدا کر کے وہ معاشرتی نظام کو برباد کرتا ہے دوسری طرف معاشیات میں عوام و خواص کی تقسیم کو بڑی حد تک باقی رکھ کر معاشی عدل کا راستہ روکتا ہے۔ یورپ کی جمہوریت (Democracy) بھی اس دیو استبداد[؟] کی دوسری شکل ہے۔ جمہوریت میں بھی عام رفاہیت اور خوشحال کے بجائے مخصوص مالدار طبقوں کا فائدہ ہوتا ہے، یہ عجب کرشمہ ہے کہ جمہوریت میں جس چیز کو عدل و انصاف کا نام دیا جاتا ہے وہ درحقیقت معاشی ظلم و استبداد ہے اور یہ بات جمہوریت (Democracy) کے طویل تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔

اسلام سے قبل یونان، روما اور فارس کا پُرشوکت تمدن اور اس کی خوش آئند حضارت، انسانیت کو مطمئن تو کیا کرتے، خود اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب افراد کے لئے بھی دعوتِ عدل اور پیغام رفاہیت (خوشحالی) نہ دے سکے اور جو کچھ بھی کیا اس کا فائدہ طبقۂ امراء و سلاطین تک ہی محدود رہا۔ خصوصاً فارس کا وہ نظام تو قابل ذکر بھی نہیں جو مزدک[۵] کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوا۔ اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں نے اگرچہ عام خوشحالی اور رفاہیت کا پیغامبر بننے کی بہت کوشش کی مگر یہ دونوں سطحوں پر ناکام ہوئے۔

اوّلاً دونوں نظاموں کا تعلق ''اخلاقیات'' سے نہیں ہے، دونوں نے ایک طرف خدا سے بغاوت کر کے خالق و مخلوق کے رشتہ کو کمزور کیا اور دوسری طرف معاشرہ کو خود غرضی،

مادیت پرستی اور بداخلاقی میں مبتلا کیا۔

ثانیاً دونوں کے عملی تجربے نے معاشرے میں طبقاتی نظام کو جنم دیا، سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داروں کا استحصالی طبقہ وجود میں آتا ہے اور اشتراکیت میں مزدور طبقے کی حکمرانی نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس اسلام کا معاشی نظام ایک ایسے ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جو عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے اور دنیائے انسانی کی صرف معاشی صلاح و فلاح کا ہی خواہشمند نہیں ہے بلکہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی رشد و ہدایت کا علمبردار ہے، اور ایک مکمل نظام حیات کا مدعی ہے۔ اس کی فکر یہ ہے کہ انسان کا منتہائے مقصود صرف دنیوی ترقی و کمال ہی نہیں ہے بلکہ سعادتِ ابدی اور رضائے الٰہی اصل مقصود ہے۔ اس لئے وہ ہر شعبۂ زندگی کے لئے ایک ''صالح نظامِ اجتماعی'' پیش کرتا ہے، اس کا ایک شعبہ ''صالح معاشی نظام'' کا بھی ہے۔ ؎

چونکہ اسلام کا پیش کردہ ''معاشی نظام'' اسلامی اخلاقیات سے گندھا ہوا ہے، اسی لئے اسے بجا طور پر ''صالح معاشی نظام'' کہا جاسکتا ہے کہ اس نظام کے تجربے کی صورت میں معاشرہ میں انسانوں کی نہ صرف معاشی حالت سدھرتی ہے بلکہ اخلاقی حالت میں بھی بہتری آتی ہے۔ اسلام فرد و جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں اور ''تجارت تو بس تجارت ہے''۔ قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

> ''مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم چاہتے ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہوجائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (الجمعہ: ۹-۱۰)

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو ''فضل اللہ'' کہا گیا ہے، اور اس سے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی

زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو بناتا ہے۔ ناپ تول میں کمی اللہ کے نزدیک اتنا بڑا گناہ ہے جس کی وجہ سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو عذابِ الٰہی کے نتیجے میں تباہ و برباد کردیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے اسلامی معاشیات کا انداز (Approach) اخلاقی اور قدر شناسانہ (Normative) ہے[8]۔ ہر نظام کسی نہ کسی فکر کے تابع ہوتا ہے، اگر فکر صالح ہے تو ایک صالح نظام وجود میں آئے گا جو انسانیت کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ اگر فاسد ہے تو نتیجہ میں جو نظام سامنے آئے گا وہ بھی فاسد ہوگا اور اس کے عملی تجربے سے انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

اسلام کے پیش کردہ معاشی اصول:

قرآن میں ایسے معاشی اصول ملتے ہیں جن کی بنیاد پر کسی بھی زمانے میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک معاشی نظام تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ وہ اہم بنیادی اصول یہ ہیں۔

ا۔ حقِ معیشت میں مساوات:

یعنی ہر فرد کو معاشرے میں معاشی جد و جہد کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اسلام کے پیش کردہ معاشی نظام کا پہلا اساسی اصول یہ ہے کہ اس نے حق معیشت میں تمام افراد کو مساوی رکھا ہے۔ ہر فرد کو اس بات کا یکساں حق ہے کہ وہ اپنے اور اپنے زیر کفالت لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور حصول معاش کے لئے جد و جہد کرے۔ اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لئے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلقِ خدا کی فارغ البالی کے لئے زیادہ سے زیادہ جد و جہد کرے معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (Maximization of Production) کی پالیسی بھی کہہ سکتے ہیں۔[9] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لئے سامانِ معاش پیدا کیے۔'' (الاعراف: ۱۰)

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت، معاشی جد و جہد اور حصولِ رزق کی کوششوں پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لئے سرگرم عمل کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو۔'' (کنز العمال) بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا، اس پر سخت وعید سنائی گئی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمہارے لئے کام کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لیے ہوئے آؤ۔'' (ابوداؤد)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

''جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل وعیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ اٹھے گا تو اس کا چہرہ ودھویں کے چاند کی مانند روشن ہوگا۔'' [10]

قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے:

''اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔'' (القصص: ۷۷)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''حلال معیشت کا طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے فریضہ عبادت کے بعد (سب سے بڑا) فریضہ ہے۔'' (کنز العمال)

رسول اللہ ﷺ نے اسے بعض گناہوں کا کفارہ بھی بتایا ہے۔ فرمایا:

''بعض گناہوں میں ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف طلبِ معیشت کی فکر اور جد و جہد میں کاوش ہی سے ہوسکتا ہے۔'' [11]

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص بھی طلبِ رزق کی جد و جہد میں پست ہمت ہو کر نہ بیٹھ جائے۔'' [12]

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جدو جہد کو فرضِ عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے۔ الغرض اسلامی معاشیات کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ تمام انسانوں کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں۔ قدرت نے جو وسائل ودیعت کیے ہیں ان کو ترقی دی جائے۔ پیداوار کو امکانی حدتک بڑھایا جائے کہ دوسروں پر اس کے دروازے بند ہو جائیں۔

گویا معیشت اور اسبابِ معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانہ عامرہ کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جاندار کو برابر کا حق ہے اور یہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کے حقِ معیشت کی نگرانی کرے، اس کے دائرہ حکومت میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو حقِ معیشت سے محروم کر دیا گیا ہو۔

۲۔ درجاتِ معیشت میں تفاوت:

اسلامی معاشی نظام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں اور معیشت میں درجات کا یہ تفاوت (فرق) ایک حد تک فطری ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لئے سامان معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لئے۔

تاہم اسلام تقاضا کرتا ہے کہ درجات کا یہ تفاوت حد اعتدال میں رہنا چاہئے اور کسی حالت میں بھی لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہیں بننا چاہئے، یعنی معاشرے میں تفاوتِ درجات تو ہو لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ انسانوں کو اس طرح دائمی طبقات میں تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسرے کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے۔

قرآن کریم نے اس تفاوتِ درجات کو اس طرح بیان کیا ہے:

"دنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو بعض پر درجۂ معیشت میں بلندی حاصل ہے۔" (الزخرف:۳۲)

یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

''اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی ڈال دیتا ہے۔'' (الرعد:۲۶)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات نے ایسا کیوں کیا کہ دنیا میں بعض کو امارت عطا کی اور بعض کو غربت۔ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے۔

''اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا، اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے، تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔'' (الانعام:۱۶۵)

اس سے ثابت ہوسکتا ہے کہ درجاتِ معیشت میں تفاوت بغرض آزمائش ہے، امیروں کی آزمائش ان کی دولت وثروت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی صاحبِ ثروت کو دولت اس لئے عطا نہیں کی کہ وہ غریبوں کی غربت میں اضافہ کا باعث بنے، بلکہ اس کی دولت اللہ تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیرِ فرماں، غرباء، مساکین کی غربت کو کم یا ختم کرنے کے لئے استعمال ہونی چاہئے اسی طرح اسلامی معاشرے میں صاحبِ ثروت کی دولت، غرباء و مساکین کے لئے عین راحت و رحمت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفالت پورا کرنا فرض کردیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے محض اس لئے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے باز پرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔[۱۳]

قرآن کہتا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی، پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ رزق دیا گیا ہے وہ اپنی روزی سے اپنے زیردستوں کو لوٹا دے حالانکہ اس (روزی) میں سب برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہورہے؟'' (النحل:۷۵)

گویا درجاتِ معیشت میں تفاوت کی مصلحت دراصل بندوں کی آزمائش ہے، بعض کو اللہ تعالیٰ

دولت دے کر آزماتا ہے اور بعض کو غربت دے کر آزماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف صاحب ثروت افراد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو محض ذاتی ملکیت نہ سمجھیں بلکہ اس میں معاشرے کے مساکین کا حق ہے جو جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اجتماعی حقوق عائد ہوں گے پس وہ صرف اپنے لئے نہیں کماتا بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لئے بھی کماتا ہے۔ دوسری جانب اسلام غرباء سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ متمول افراد کی دولت وثروت کو دیکھ کر خدا کے ساتھ ناشکری اور کفر کا رویہ اختیار نہ کریں اور نہ حسد اور بغض کو دل میں جگہ دیں بلکہ جو کچھ انہیں حاصل ہے اس پر قناعت کریں اور اللہ کے شکر گذار بندے بنے رہیں اور اگر ان میں صلاحیت ہے تو پھر عملی جد و جہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوقِ معیشت سے فائدہ اٹھائیں اور اگر خوشحال ہو جائیں تو اسے اپنی محنت سے زیادہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے دوسرے افرادِ معاشرہ کے حقوق کو اسی طرح ادا کریں جو اسلام کا اہل ثروت سے تقاضا ہے۔

۳۔ احتکار و اکتناز کی حرمت:

اسلام کا ایک اہم معاشی اصول یہ ہے کہ وہ احتکار و اکتناز کو حرام قرار دیتا۔ ''احتکار'' کا مطلب ناجائز وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا اور ''اکتناز'' سے مراد ہے اجتماعی حقوق کو نظر انداز کر کے دولت کو خزانہ کرنا۔

جہاں تک احتکار کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کا صرف یہی حکم نہیں ہے کہ رزق حلال کمایا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ حلال ذرائع سے کمایا جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تجارت ایک جائز ذریعہ معاش ہے لیکن شراب و منشیات کی تجارت حرام ہے۔ کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ایک فریق (تاجر) کا فائدہ، دوسرے فریق (خریدنے یا استعمال کرنے والے) کے یقینی نقصان پر مبنی ہے۔ یہی معاملہ جوا، سٹہ اور لاٹری کا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

> ''یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار کے متعلق دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے ان دونوں باتوں میں گناہ ہے۔'' (البقرہ:۲۱۹)

اسی طرح دولت کو سمیٹ سمیٹ کر خزانہ بنانے کی بھی سخت ممانعت آئی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود نہ ہو جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو اور گردش کرے۔

''اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں سو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی، پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا، اور چکھو مزا اپنے گاڑنے کا۔'' (التوبہ: ۳۴-۳۵)

قرآن، خرچ کرنے کی حکمت یہ بتاتا ہے:

''فقراء، مساکین، قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو خرچ کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے اس لئے ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔'' (الحشر: ۷)

قرآن بار بار خرچ کرنے کی تاکید کرتا ہے:

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' (البقرہ: ۱۹۵)

ان آیات میں مال کو جمع کر کے رکھنا سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اس کی جگہ خرچ کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ خرچ کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، زکوٰۃ، صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی مد میں رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ قانونِ وراثت بھی اسی حکمت پر مبنی ہے کہ دولت ایک جگہ جمع ہونے کے بجائے تقسیم ہو اور پھیلے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد کو فیض پہنچ سکے۔ زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو اسلامی حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکامِ ریاست، قیامِ انصاف اور فلاحِ عامہ کے لئے خرچ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''بے شک مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق

(حق سوئی زکوٰۃ) ہے۔" (ترمذی)

۴۔ سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن:

اسلام، محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح اور عادلانہ توازن قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک کو دوسرے کے جبر و استبداد سے بچایا جاسکے۔ مزدور سے بیگار نہ لی جائے اور اس کو اس کی اُجرت پوری دی جائے۔ ناپ تول میں کمی نہ کی جائے، ربوا (سود)، قمار (جوا) وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اللہ نے بیع (خرید و فروخت کے معاملات) کو حلال اور ربوا (سودی کاروبار) کو حرام کردیا ہے۔" (البقرہ: ۲۷۵)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"بے شک! شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک ہیں، کارِ شیطان ہیں، بس ان سے بچو۔" (المائدہ: ۹۰)

ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

"خرابی ہے کمی کرنے والوں کے لئے، جب ماپ کرلیں تو لوگوں سے پورا پورا بھر لیں اور جب ان کو ماپ کریا تول کردیں تو گھٹا دیں۔" (المطفّفین: ۱-۳)

دراصل اسلام معاشی معاملات میں "باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل" کا خواہش مند ہے اور یہ تعاون ایسے صحیح اور صالح طریقوں پر مبنی ہونا چاہئے کہ اس سے نظامِ تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے اور اس کا فائدہ دوسرے کے نقصان پر موقوف نہ ہو جیسا کہ جوا (قمار) یا اس کی جدید اور "مہذب" طریقوں مثلاً سٹہ اور لاٹری وغیرہ میں ہوتا ہے۔ نیز اسلام میں وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں جن میں اگرچہ باہمی رضامندی نظر آتی ہے لیکن اس کی تہہ میں زبردستی کے سوا اور کچھ نہ ہو مثلاً ربوا (یعنی سودی لین دین) جو سب سے بڑا معاشی ظلم ہے اور ایسے تمام معاملات جن میں ایک جانب سرمایہ دار کا سرمایہ ہے اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی اضطراری ضرورت۔ سرمایہ دار، مفلس کے افلاس اور اس کی اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا

ہے اور اجارہ رہن اور دوسرے معاملاتِ لین دین میں اس سے ایسی شرائط منظور کرا لیتا ہے جو کسی طرح بھی عادلانہ نہیں، مگر مفلس کے افلاس اور ضرورت مند کی ضرورت نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس قسم کے معاملات اگرچہ باہمی رضامندی سے ہی طے پائیں، اسلام کے نزدیک ظلم ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے معاملات کا آخری نتیجہ عوام کی فلاکت و افلاس اور ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے اسلام کے معاشی نظام میں مہاجنی سودی کاروبار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، سودی بینکوں کا نظام بھی ناقابل قبول ہے۔ نیز اس کے نزدیک تاجروں کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں جن میں اجیر (مزدور، محنتی) کے جائز اور عادلانہ اُجرت و حقوق کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو۔ وہیں دوسری طرف اجیر کی وہ خیانت بھی ناجائز ہے جس سے صاحبِ سرمایہ کو ناحق نقصان پہنچایا جائے۔[۱۴]

۵۔ حلال وحرام کی تمیز:

اسلام اس بات کی پابندی کراتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو، وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزقِ حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوششیں ہوں گی اور ان تمام ذرائع کا کلی انسداد کیا جائے گا جو حرام ہیں اور جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔ اسلام افراد کو پابند کرتا ہے کہ وہ جو کمائے وہ ''حلال ہو اور دوسرے یہ کہ جن طریقوں سے حاصل کیا جائے وہ ''طیّب'' ہوں۔

قرآن کہتا ہے:

''اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال اور طیّب کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' (البقرہ:۱۶۸)

ایک اور جگہ فرمایا:

''پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال، طیّب کھاؤ۔''

(المائدہ:۸۸)

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل نا آشنا ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی اشیاء حرام ہیں اور کونسی حلال، نیز طیب ذرائع کیا ہیں اور خبیث ذرائع کیا ہیں۔قرآن نے حرام وحلال اشیاء کا تذکرہ کر دیا ہے، جیسے سود، شراب، جوا، قمار، سٹہ، بت اور پانسے وغیرہ۔ نیز ہر وہ مال بھی حرام ہے جو کسی کا حق مار کر حاصل کیا گیا ہو، اسی طرح ہر وہ ذریعہ (Source) بھی خبیث ہوگا جس میں ظلم کا شائبہ بھی ہو۔اسلام نے جن چیزوں کو حرام کہا ہے اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد اور معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو مجروح کرتی ہیں اور یا انسانوں کے مابین معاشی تعاون، اور خیر خواہانہ فضا کو مسموم کرتی ہیں۔اس کی ایک مثال سود ہے۔اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے، سود مفرد ہو یا سود مرکب، ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے اور اس کے لینے والے کو خدا اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

''اے ایمان والو! سود کے کئی کئی حصے بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔'' (آل عمران:۱۳۰)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے پر، سودی دستاویزات لکھنے والوں پر اور سودی کاروبار کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور سب کو برابر قرار دیا ہے۔ (صحیح مسلم) اسلام میں سود کی مخالفت محض اخلاقی بنیادوں ہی پر نہیں ہے بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی، سماجی اور سیاسی مضمرات بھی ہیں۔سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا سبب بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معیشت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملکی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدو جہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

٦۔ صَرف میں میانہ روی:

کسبِ معاش کے بعد دوسرا مسئلہ صرف وخرچ کا ہے، یعنی کہ جو مال حلال وطیب ذرائع سے کمایا ہے وہ کس پر اور اس قدر خرچ کیا جائے۔ اس کے لئے قرآن ''میانہ روی'' اور ''اعتدال'' کا اصول دیتا ہے۔ یعنی خرج کرتے ہوئے اسراف وتبذیر سے بھی بچا جائے اور بخل اور کنجوسی سے بھی۔ کسی جائز کام میں حد سے زیادہ خرچ کرنا ''اسراف'' ہے، مثلاً شادی بیاہ یا دیگر تہواروں پر بے دریغ خرچ کرنا اسراف ہے۔ ''تبذیر'' یہ ہے کہ لہو ولعب اور لغویات میں رقم اڑائی جائے۔ اور بخل یہ ہے کہ جہاں خرچ کرنے کی ضرورت ہے وہاں بھی خرچ نہ کیا جائے۔

البتہ یہاں ایک باریکی ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''مجاہد کہتے ہیں کہ اگر شخص نے ''حق'' کی خاطر سب کچھ خرچ ڈالا تو یہ اسراف نہیں ہے اور اگر اپنا تھوڑا مال بھی ''ناحق'' (یعنی باطل پر) خرچ کر ڈالا تو یہ تبذیر ہے۔ قتادہ کہتے ہیں ''تبذیر'' نام ہے مال کو اللہ کی نافرمانی، ناحق اور فساد کے موقع پر صَرف کرنے کا۔ ۱۵ اس کی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ جنگ تبوک کے موقع پر لشکر کی تیاری کے لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا سارا مال رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا۔ اسے ''اسراف'' نہیں کہا جائے گا کیونکہ حق کے لئے کل مال بھی خرچ کر دیا جائے تو اسراف نہیں ہے۔ اسی طرح لہو ولعب یا معصیت کے کاموں میں معمولی سی رقم کا خرچ کرنا بھی ''تبذیر'' ہے۔ اسی طرح بخل سے بھی روکا گیا ہے اور بخیل کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

''اور اپنے ہاتھ کو نہ اپنی گردن کے ساتھ ہی باندھ لو (یعنی بخل نہ کرو) اور نہ بالکل ہی کھول دو (یعنی اسراف نہ کرو)۔'' (بنی اسرائیل:۲۹)

گویا خرچ کرنے میں پسندیدہ راستہ میانہ روی اور اعتدال کا ہے لیکن خاص حالات میں ''ایثار علی النفس'' اولیٰ اور افضل ہے یعنی اگر انسان ضبطِ نفس اور صبر واستقامت کے درجہ کمال پر فائز ہے تو انفاق فی سبیل اللہ میں تمام مال کو صرف کر دینا محبوب ہے، تاہم اس کا مطالبہ ہر شخص سے نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر شخص ایمان کے اس درجہ کمال پر نہیں ہوتا کہ اپنا سب کچھ راہِ حق میں

لٹا دے۔اس کے لئے پھر میانہ روی ہی بہتر ہے۔ایک مالدار شخص کے اس سوال پر کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں بذریعہ وصیت دینا چاہتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اپنے ورثا کو صاحب مال چھوڑ نا اس سے بہتر ہے کہ وہ محتاج رہ جائیں اور بھیک مانگتے پھریں۔" [۱۶]

۷۔ عدل اجتماعی کی ضمانت:

اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ سماجی فلاح کی ایک اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے، معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قائم کرتی ہے۔جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارث ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں، اس کی ریاست ولی ہے۔ ناداروں، اپاہجوں اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے۔

السلطان ولی من لا ولی له. (صحیح بخاری)

[حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔]

ایک اور حدیث میں ہے:

من ترک کلا فالینا. (بخاری، مسلم)

[جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ)
چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔]

حضرت عمرؓ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں سے حصہ پہنچے گا اور اس کے لئے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

اور یہ کہا:

''خدا کی قسم! اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لئے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔''

حضرت علیؓ نے اس بات کو اس طرح ادا کیا:

''اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لئے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے، ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہی اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ ان امرا سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا۔''

ان احکام کے مطابق جو نظام قائم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگ دستی ختم ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! صدقہ دو کیونکہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ لیے لیے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اسے قبول کرے (یعنی اس کا حاجت مند ہو)۔''

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام، اور درحقیقت انسانیت کی نجات انہی اصولوں میں مضمر ہے۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف، آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔[17]

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، **اسلام کا اقتصادی نظام**، ص ۱۸، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۴ء۔

۲۔ یونان کا مشہور فلسفی جس نے اپنی مشہور تصنیف "جمہوریہ" (*Republic*) میں بعض معاشی اصول بیان کیے ہیں، اس کتاب کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳۔ مارکسی کمیونزم کا بانی کارل مارکس (*Karl Marx*) ۵ر مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی میں پیدا ہوا، اس کا خاندان متوسط یہودی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا تاہم اس کے باپ پائن رک مارکس نے یہودیت ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ کارل مارکس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بون یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں برلن یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مارکس ایک اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔ اس دوران اس کی ملاقات فریڈرک اینگلز سے ہوئی۔ دونوں کے نظریات میں کافی ہم آہنگی تھی۔ دونوں نے مل کر کمیونسٹ تحریک منظم کی مگر حکومت نے انہیں جلا وطن کر دیا۔ یہ ۱۸۴۹ء کا سال تھا، چنانچہ کارل مارکس لندن آ گیا، جلاوطنی کے دوران اس نے کمیونزم کا وہ منشور (*Manifesto*) تیار کیا جو بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا۔ کارل مارکس نے کمیونسٹ مزدوروں کی پہلی جماعت قائم کی۔ وہ واپس جرمنی آ کر مختلف اخباروں میں مضامین لکھ کر گزر بسر کرتا رہا۔ اسی اثناء میں اس کے دو کم عمر بچے فوت ہو گئے اور وہ ان کے لئے کفن دفن کا انتظام بھی نہ کر سکا بالآخر فریڈرک اینگلز نے اس کی مالی مدد کرنی شروع کر دی۔ مسلسل غربت و افلاس اور ناکامیوں کے باعث وہ سرمایہ داروں کا شدید مخالف ہو گیا۔

۱۴ر ستمبر ۱۸۶۷ء کو کارل مارکس کی مشہور کتاب "داس کیپٹل" (*Das Capital*) شائع ہوئی۔ کارل مارکس کی یہ کتاب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک فرد جرم تھی جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی طریقوں کی اصلیت آشکار کی گئی تھی۔ مارکس نے اس کتاب میں ایک ایسے معاشرے کے خدوخال مرتب کیے جہاں ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کیا جائے، اس کتاب نے دنیا پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۱۷ء کا انقلابِ روس اس کتاب کی عملی تفسیر تھا۔

۱۸۸۱ء میں کارل مارکس کی بیوی سرطان میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ ایک ماہ بعد اس کی بڑی بیٹی بھی چل بسی، ۱۴؍ مارچ ۱۸۸۳ء کو کارل خود انتقال کر گیا، لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں دفن ہوا۔ فریڈرک اینگلز نے کارل کی نامکمل کتابوں کی تکمیل کی۔

۴۔ علامہ اقبال، جمہوریت (Democracy) کو استبداد (ظلم) کا دیو کہتے ہیں ؎

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب	تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

۵۔ مزدک کی اقتصادی تعلیمات کے لئے دیکھئے اسی کتاب کا باب پنجم ''ایرانی تہذیب''۔

۶۔ اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۱۹۔

۷۔ ایضاً، ۲۴۔

۸۔ خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۵۰، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

۹۔ ایضاً، ص ۴۵۱۔

۱۰۔ اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۵۳۔

۱۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۶۳، (بحوالہ الاوسط، از طبرانی والحلیہ از نعیم)

۱۲۔ ایضاً، (بحوالہ احیاء العلوم، جلد ۲، ص ۵۷)۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۱۵۔ ابن کثیر، حافظ عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، جلد ۶، ص ۶۳۔

۱۶۔ اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۷۰ (بحوالہ بخاری، کتاب الوصایا)۔

۱۷۔ اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۶۳۔

بائیسواں باب:

اسلام کا سیاسی نظام

قرآن کریم کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والا اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن ہر اہم شعبہ ہائے حیات کے لئے ایک نظامِ اقدار و اصول (*Value System*) متعارف کراتا ہے۔ وہ انسان کو اپنے معاملاتِ زندگی طے کرنے کے لئے ایسا ضابطہ ہدایت و اخلاق پیش کرتا ہے، جس کی بنیاد پر قانون سازی کر کے، زمان و مکان کے کسی بھی مرحلہ پر اپنے لئے ایک نظام (*System*) بنایا جاسکتا ہے۔ یہی اسلامی شریعت کی ہمہ گیریت ہے۔

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی تربیت وتہذیب کے لئے جو ادارے قائم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعہ سے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنے اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں اور اسے قوتِ قاہرہ اور قوتِ نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ [1]

اجتماعی زندگی کے لئے ریاست کا وجود ناگزیر ہے، انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لئے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے اداروں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات، معاشی لین دین اور دیگر تمدنی معاملات کی استواری کا نگران و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشو و ارتقاء کے لئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن امان قائم ہو اور دوسری طرف وہ

فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کردے جو وہ خود حاصل نہیں کرسکتا۔ دفاع، قیامِ نظم و قانون، حصول عدل اور تعلیم وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ [۲]

قرآن اس اہم ادارے کے لئے واضح ہدایات دیتا ہے اور اس حوالے سے ایک ایسا ضابطہ اخلاق فراہم کرتا ہے، جس کی بنیاد پر کسی بھی عہد اور کسی بھی مقام کے لئے قانون سازی کی گنجائش ہے۔

ایک اہم قدر جو اس حوالے سے قرآن متعارف کراتا ہے وہ سیاست کا اخلاقیات سے تعلق ہے۔ اسلام اخلاق اور سیاست کے مابین تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست دو جدا چیزیں نہیں ہیں۔ [۳] لہٰذا بعض پیغمبرانِ اسلام نے وسیع ریاستیں قائم کیں اور ان ریاستوں میں اسلامی شریعت کو نافذ کیا، ایسے پیغمبروں میں حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام نامی شامل ہیں جنہوں نے اپنے وقتوں میں نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست قائم کی بلکہ برسہا برس اسے عادلانہ انداز میں چلایا بھی۔

اسلام کا اپنا ایک معاشرتی، سماجی اور تہذیبی نظامِ اقدار (*Value System*) ہے، اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے، وہ دفاع، تجارت اور معاملات کے لئے قانونی ہدایات دیتا ہے اگر اسے حکومت، اقتدار حاصل نہ ہوں تو اس کی شریعت کیسے نافذ ہوسکتی ہے، شریعت کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ ریاست و اقتدار حاصل ہو۔ علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کردیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔'' [۴]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دین کے لئے ریاست اور ریاست کے لئے دین کی اہمیت کو سمجھتے تھے، ان کو جو دعائیں سکھائی گئی، ان میں ایک اہم دعا یہ تھی:

> ''اور (اے نبی) دعا کرو، اے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال، سچائی کے ساتھ نکال اور اپنے طرف سے

ایک سلطان (حکومت، اقتدار) کو میرا مددگار بنادے۔" (بنی اسرائیل: ۸۰)

یہ آیت ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی، اس تاریخی حوالہ سے اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومتِ الٰہیہ کا قیام بھی تھا کیونکہ حکومت کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین اور حدود کے اجراء کے بغیر، معاشرے میں مثبت اور نتیجہ خیز تبدیلی ممکن ہی نہیں۔ وہ نظامِ اقدار جو اسلام متعارف کرانا چاہتا ہے، اس کے نفاذ کے لئے جس قوتِ نافذہ کی ضرورت ہے وہ ریاست ہی پورا کرسکتی ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کا پابند کیا ہے۔

"یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحبِ اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجامِ کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔" (الحج: ۴۱)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امتِ مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گی ہے کہ:

"جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان میں سے سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران: ۱۱۰)

اسی سورۃ میں مزید تاکید کی گئی ہے:

"تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔" (آل عمران: ۱۰۴)

حکم اسی صورت میں دیا جاسکتا ہے جب کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار حاصل ہو، باپ اپنے بیٹے کو حکم دے سکتا ہے، مالک اپنے ملازم کو حکم دے سکتا ہے، ریاست اپنے باشندوں کو حکم دے سکتی ہے۔ اس اہم فریضہ کی بجا آوری کے لئے کسی نہ کسی درجہ کا اقتدار از بسکہ ضروری ہے۔

صحیحین کی مشہور حدیث ہے:

''تم میں سے جو شخص بدی دیکھے اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔''

ظاہر ہے ہاتھ سے بدی کو نیکی میں بدل دینے کے لئے قوت اور اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لئے بھی کسی قدر قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے، تیسری صورت میں ایمان کے کمزور درجہ پر قناعت کرنی پڑے گی، جو دینِ اسلام کا مطلوب و مقصود نہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کو ممکن بنایا جائے۔

فقہ کا ایک بنیادی مسئلہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ ملت اسلامیہ کے لئے نصب امامت لازمی ہے، خلیفہ اور امام[۵] کا تقرر واجب ہے کیونکہ نظمِ ملت، قیام امن اور نفاذ احکام شریعت امامت وخلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

''کل اہل سنت، مرجۂ شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امامِ عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے ہیں۔''[۶]

تقریباً تمام مسلمان سیاسی مفکرین نے نصبِ خلافت کو امتِ مسلمہ پر واجب قرار دیا ہے، شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کو مقرر کرنا، واجب بالکفایہ ہے، اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔''[۷]

الغرض یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں، اختلاف اگر ہے تو تقرر اور انتخاب کی تفاصیل و جزئیات میں یا طریق و شرائط میں

ہے لیکن نصبِ امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اتنا اہم اور ضروری معاملہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے انتقال کی صورت میں، ان کی تجہیز و تکفین سے پہلے امت مسلمہ نے طے کر لیا تھا، مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں انتشار و افتراق کے چند سالوں کو چھوڑ کر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امتِ مسلمہ کسی ''خلیفہ'' کے بغیر رہی ہو۔ ۱۹۲۴ء میں الغائے خلافت کے بعد سے امت نے اس فریضہ سے غفلت برتی جس کے نتیجے میں وہ بدترین انتشار کا شکار ہے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات:

اسلامی تعلیمات پر مبنی جو ریاست قائم کی جائے گی وہ لازماً چند خصوصیات کی حامل ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں جو پہلی اسلامی ریاست قائم کی وہ انہی خصوصیات کی حامل تھی۔

(۱) نظریاتی ریاست:

دیگر ریاستوں کی طرح اسلامی ریاست کوئی قومی ریاست نہیں ہوگی۔ دیگر قومی ریاستوں کی بنیاد نسل، رنگ، زبان، وطن یا مشترکہ معاشی مفادات ہوسکتے ہیں، جبکہ اسلامی ریاست کی اصل بنیاد ''نظریہ'' ہے۔ چنانچہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی علمبردار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ انسانیت، رنگ، نسل، زبان اور محدود وطنیت کی مصنوعی پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالمگیر ریاست قائم کرے۔ جب تک یہ نصب العین حاصل نہ ہو جغرافیائی حد بندیوں کو گوارا کرنا ہوگا لیکن پوری امت کی وحدت یا کم از کم اس کی ایک دولت مشترکہ کا قیام ایسی ریاست کے پیش نظر رہے گا، اس اعتبار سے اسلامی ریاست ان ریاستوں سے مختلف ہوگی جو محض جغرافیائی قومیت پر مبنی ہیں اور جن کے پاس کوئی طاقتور نظریہ اور دعوت نہیں۔ [۸]

سورۃ النور میں ارشاد ہوتا ہے:

''تم میں جولوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ فاسق ہیں، اور (اے مسلمانو!) نماز قائم کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (النور: ۵۵-۵۶)

گویا اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا ہے، اسی لئے یہ ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہوگی۔ اسلامی ریاست میں ''نظریہ'' اور ''اصول'' کو بالادستی حاصل ہوگی اسلام کے قانون، حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے۔ قرآن، اسلامی ریاست کے ہر فرد سے اللہ، اس کے رسول اور ''اولی الامر'' کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے تا کہ نظم مملکت خوش اسلوبی سے چلایا جاسکے اور بلا وجہ محاذ آرائی پیدا نہ کی جائے۔ قرآن کہتا ہے:

''اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں ''اولی الامر'' ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔'' (النساء: ۵۹)

ضروری ہے کہ یہاں ''اولی الامر'' کی وضاحت کردی جائے۔ اولی الامر سے مراد وہ صاحب اقتدار ہیں جنہیں حکومت سازی و سیاست کاری میں فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی حکمتِ عملی (*State Poilicy*) بنانے والے ہوں۔ سورۃ النساء کی درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا ہے کہ یہ ''اولی الامر'' مسلمانوں میں ہی سے ہونے چاہئیں۔ ''منکم'' (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست

میں حکومت کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔

اس نکتہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح تو غیر مسلموں کے ساتھ ایک امتیازی رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اعتراض برائے اعتراض ہے کیونکہ جب یہ طے کر دیا گیا کہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہوگی اور اس حکومت کے قیام کا مقصد اس ''نظریہ'' کا تحفظ ہوگا، تو ایسی نظریاتی ریاست اپنا سربراہ یا کلیدی مناصب پر ایسے افراد کا تقرر نہیں کر سکتی جو اس نظریے کے ماننے والے نہ ہوں۔ یہ بات ایسی ہی ہے کہ ''اشتراکیت'' ایک نظریہ ہے، اس نظریہ پر قائم ہونے والی اشتراکی حکومت کا سربراہ یا کلیدی مناصب رکھنے والے غیر اشتراکی نہیں ہو سکتے۔ ایک سرمایہ دارانہ سوچ رکھنے والے ملک کا سربراہ اشتراکی نہیں ہو سکتا، آج کل سیاسی طور پر جمہوریت کا چلن ہے، لہٰذا جمہوری ممالک اس سوچ کی طرف جا رہے ہیں کہ کیا ان حضرات کو جو جمہوریت پر یقین نہ رکھتے ہوں برسر اقتدار لایا جا سکتا ہے؟[9]

مغربی ممالک کے دساتیر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی وہ مذہبی اور نسلی بنیادوں پر اپنے شہریوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ انگلستان میں سربراہِ ملک کے لئے پروٹسٹنٹ فرقہ میں بھی انگریزی کلیسا کا عیسائی ہونا ضروری ہے۔ آئرلینڈ کے صدر کے لئے کیتھولک ہونا ضروری ہے، ارجنٹائن کے دستور کی رو سے صدر یا نائب صدر صرف کیتھولک عیسائی ہی ہو سکتا ہے، ناروے اور ڈنمارک میں بادشاہ کے لئے صرف عیسائی ہی نہیں بلکہ ایونجلیکل چرچ (ایک خاص فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ یہی قانون سویڈن کا بھی ہے بلکہ وہاں بادشاہ کے علاوہ اسٹیٹ کونسل کے اراکین کے لئے بھی ایونجلیکل ہونا ضروری ہے۔ یونان میں بادشاہ کے لئے مشرقی مسیحی کلیسا کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ اسپین میں صدر مملکت کے لئے رومن کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ تھائی لینڈ کے دستور میں صراحت ہے کہ اس کا سربراہ لازماً بدھ مت کا پیروکار ہو...... سوال یہ ہے کہ اگر وہ ریاستیں جو بظاہر نظریاتی ریاستیں نہیں ہیں اور اپنے کو لادینی (Secular) کہتی ہیں ''اولی الامر'' کے لئے ایک خاص مذہب (حتیٰ کہ فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست جو ہے ہی ایک نظریاتی ریاست، یہ کیسے گوارا

کر سکتی ہے کہ اس کے کلیدی مناصب پر وہ لوگ فائز ہوں جو اس نظریہ ہی کو نا مانتے ہوں۔ [۱۰]

المختصر ''اولی الامر'' کے حوالے سے یہ چند باتیں طے شدہ ہیں۔

اوّلاً یہ کہ وہ مسلمانوں میں سے ہی ہونے چاہئیں۔

ثانیاً اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرمانبرداری مسلمانوں پر لازم کی گئی ہے تا کہ زندگی کا نظام بہ حسن وخوبی چلتا رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہو۔

ثالثاً اولی الامر کی اطاعت اللہ، اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہو، اگر اولی الامر یعنی صاحبِ اقتدار اپنی رعایا کو ایسے احکامات دیں جو قرآن وسنت کے منافی ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، بلکہ حسبِ اطاعت اس کی نشاندہی کر کے اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا واضح حکم موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر، تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناپسندیدگی کیا وہ بری الذمہ ہوا، اور جس نے ان کو ناپسند کیا، وہ بھی بچ گیا، مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا، وہ ماخوذ ہوگا۔'' (صحیح مسلم)

(۲) شورائیت:

اسلامی ریاست کی دوسری اہم خصوصیت اس کا جمہوری اور شورائی مزاج ہے، ریاست کے تمام شہری برابر ہیں، ان کے حقوق وفرائض متعین ہیں، حکومت ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت (Dictatorship) کو برداشت کر سکتا ہے اور نہ موروثی بادشاہت پسندیدہ ہے، اس کا مزاج شورائی اور جمہوری ہے۔ رسول اللہ ﷺ معاملات مشورے سے طے کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وشاورهم في الامر (آل عمران:۱۵۹)

[اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔]

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، ''میں نے نبی ﷺ سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ

کرنے والا نہیں دیکھا۔" (بخاری و ترمذی)

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

و امرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ: ۳۸)

[اور ان کے امور آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں۔]

خطیب بغدادی حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ، آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو، اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟" آپؐ نے فرمایا "میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لئے رکھ دو، اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔" (روح المعانی)

آپ ﷺ کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرہ کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں، اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے پاتے ہوں۔" (صحاح)

اس لئے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملہ کے لئے ہے۔ اس کی شکل کیا ہو؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا، لیکن اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل الرائے اور اربابِ حل وعقد ہوں، فہم وبصیرت رکھتے ہوں، اور انہیں لوگوں کا اعتماد بھی حاصل ہو۔ اسلامی ریاست کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تمام اہم معاملات مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کر سکے۔ کوئی معاملہ جن لوگوں سے متعلق ہو، ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔ مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ امور پیش نظر رکھے جائیں، تو شوریٰ کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

(۳) فلاحی ریاست:

اسلامی ریاست کی ایک تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک فلاحی ریاست (Welfare State) ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کا کام صرف یہی نہیں کہ امن و امان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمت انجام دے۔ ان امور کے ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ریاست کی حدود میں بسنے والے ہر شہری کو ان کے حقوق عطا کرے، ان کے درمیان مساویانہ رویہ رکھے، اپنے تمام شہریوں کو خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، بنیادی ضرورویات کی فراہمی کی ضمانت دے، اگر ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس اور ظلم و جور ہے تو اس کا تدارک کرے اور اپنی تمام قوتیں اور وسائل، انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے وقف کردے۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی نگران اور سرپرست ہوتی ہے، وہ اپنے ان شہریوں کی کفالت کا بندوبست بھی کرتی ہے جو مجبوراً، اپاہج، لاچار اور رزق سے محروم ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

۱۔ ''جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور اگر وہ مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔'' (ابوداؤد)

۲۔ ''جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پسماندگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے تو وہ میرے پاس آئے، میں ان کا سرپرست ہوں۔'' (ابوداؤد)

۳۔ ''جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے، اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔'' (بخاری و مسلم)

اس میں مسلم، غیر مسلم کی تخصیص نہیں تھی، حضرت خالد بن ولید نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بہ صراحت یہ موجود تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔''[۱]

فلاحی ریاست ایسی ریاست ہوتی ہے جہاں صرف بنیادی حقوق ہی حاصل نہ ہوں، بلکہ بہت سے اضافی حقوق بھی حاصل ہوں، یعنی معاملہ صرف ''عدل'' کا ہی نہ ہو بلکہ ''احسان'' کا ہو۔ عدل تو یہ ہے کہ ہر شخص کو وہ ملے جو اس کا حق ہے اور احسان یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے حق سے تھوڑا زائد مل جائے، حکومت اور عوام کے درمیان یہ ایک ایسا خیر خواہانہ معاملہ ہے جو دونوں کے تعلقات میں خوشگواری کے جذبات لاتا ہے، ایسی حالت میں عوام، حکومت کے لئے دعا گو ہوتے ہیں اور یہ مثالی صورت حال ہے۔ اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت اپنی عوام سے نفرت کرے اور عوام حکومت سے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

> ''تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں، تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں، اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں، وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔'' (مسلم)

اب مختصراً ان سیاسی نظاموں کا ایک جائزہ پیش کیا جائے گا، جن کا تجربہ کیا جاچکا ہے یا کیا جارہا ہے، یعنی لادینیت، تھیا کریسی اور جمہوریت وغیرہ۔

(۱) لادینی ریاست (Secular State):

لادینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات چلانے کے لئے مذہب اور الہامی ہدایت پر عمل نہیں کرتی بلکہ اپنی عقل اور مصلحت پر انحصار کرتی ہے۔ وہ کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی، ایسی ریاست مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی۔

مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے، مغرب میں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کرلی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے

سے جن مظالم کو سندِ جواز دی گئی تھی انہوں نے ایک ردعمل پیدا کیا، عیسائیت کی مخالفت نے مذہب سے بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور بغاوت اور ردعمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لادینی ریاست کے تصور سے جڑ گئے، ایسی ریاست جو مذہبی احکامات کی پابند نہ ہو۔

سیکولرازم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب جیکب ہولیگ نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کے مسلک کا پرچار شروع کیا، جلد ہی اس مسلک کو مخصوص پس منظر کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوگئی اور لوگوں میں یہ خیالات عام ہونے لگے کہ مذہب ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے لہٰذا مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہیئے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملہ میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی، لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت اور جارحانہ مادیت یا اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب کے پاس لادینیت کا ڈیڑھ سو سالہ تجربہ ہے۔ جس نے مغرب کو اخلاقی روحانی طور پر شدید نقصان پہنچایا، سیکولرزم نے اہل مغرب میں تشکیک اور ذہنی پراگندگی پیدا کی۔ اسی ذہنی اور فکری انتشار نے اشتراکیت (Socialism) اور فسطائیت (Fascism) جیسی تحریکوں کو جنم دیا۔ آر۔ این۔ کریوہنٹ لکھتا ہے:

> ''اشتراکیت ان نظریات کے مجموعے کا نام ہے جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلا کو پُر کیا ہے، جسے منظّم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبے کا لازمی نتیجہ تھا'' [۱۲]

اور جو لوگ اشتراکیت کی طرف نہیں گئے، وہ فکری پراگندگی، روحانی اضطراب اور مادہ پرستی کا شکار ہوگئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ لادینیت (Secularism) نے جس فسطائیت (Fascism) کو جنم دیا وہ دو عظیم جنگوں کا باعث بنی جس میں لاکھوں افراد ہلاک اور معذور ہوئے اور انسانیت شدید بے چارگی اور جبر کا شکار ہوئی۔ لادینیت نے جس مادہ پرستی کو جنم دیا وہ

انسان کو حقیقی مسرت سے بہت دور لے گیا، آرنلڈ ٹائن بی، سیکولرازم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

''اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد حیات بنایا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے۔ ہاں یہ قابل فہم ہے اگر سیکولرازم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجے سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے۔''[۱۳]

(۲) تھیاکریسی (Theocracy):[۱۴]

تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں حکمرانی کے اختیارات خدا کو ہوں اور مذہبی پروہتوں کا طبقہ اس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ کام انجام دے۔ روائسٹون پائک ''مذہب اور مذاہب کی قاموس'' میں اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

''حکومت کی ایک ایسی قسم ہے جس میں اقتدار اعلیٰ مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے، حقیقی حکمران پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور قوانین کو حکومت خداوندی سمجھا جائے۔''[۱۵]

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں وغیرہ میں ملتی ہیں۔ دیکھا جائے تو اسلامی ریاست بھی خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہے، لیکن یہ تھیاکریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور وجوہ اختلاف مختصراً یہ ہیں:

ا۔ تھیاکریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے، جس کی رائے قانون ہوتی ہے، جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا، جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اسلام میں ایسے کسی مستقبل طبقے کا کوئی وجود نہیں۔ بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لئے یہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں بلکہ ان سے واقفیت ہر

مسلمان کا فرض بھی ہے۔ سیاست میں بھی نظام حکومت چلانے والے، خدا اور امت دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے اصحاب امر کے لئے کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے حصول کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

۲۔ اسلامی تاریخ میں ہمیں کبھی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آتی جیسی یورپ یا ہندوستان، جاپان اور تبت میں ملتی ہے۔ ہمارے یہاں علماء حق کے علم بردار اور آزادی کے محافظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ خود ظلم و ستم اور استبداد کا نشانہ بنے ہیں، ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جدد جہد کے سرخیل علماء رہے ہیں اور عالم بننے کا راستہ ہر شخص کے لئے کھلا رہا ہے۔ نیز عام سیاسی تاریخ میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے ''مذہبی دیوانوں'' کی طرح عوام کو نشانہ ستم بناتی ہو۔ اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں کہ مذہبی حکومت کے سلسلے میں یورپ کا تجربہ اور عالم اسلامی کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

> ''مشرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیا کریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ ہم یہاں ظلمت پسندی، خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لئے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے۔''[۱۶]

۳۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھیا کریسی میں نام تو خدا کا تھا لیکن چونکہ ان کے پاس زندگی کے ہمہ جہتی مسائل کے لئے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی اس لئے پادریوں اور پروہتوں نے خدا کے نام پر اپنی رائے پیش کی اور خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلایا جو ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلودہ تھا جن سے انسانی قانون، خصوصیت سے جب وہ ایک طبقے کے مفاد کا محافظ بھی ہو، ہوا کرتا ہے، اسی لئے مذہبی طبقے کو تنقید سے بالاقرار دیا گیا تا کہ اس کی ہر بات بے چوں و چرا تسلیم کر لی جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے اور جس میں ایک شوشے کا تغیر بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا۔ اولی الامر سے اختلاف کی پوری پوری گنجائش ہے بلکہ ان پر تنقید اور محاسبہ فرض کیے گئے ہیں تا کہ وہ راہ صواب سے نہ ہٹیں۔

ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیا کریسی سے بالکل مختلف کر دیتی ہے۔

۴۔ تھیا کریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن بے حد اہم فرق پایا جاتا ہے۔ تھیا کریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ یہ دنیا ایک بُری چیز ہے، اس کی زندگی ہمیں گناہ کی پاداش میں اختیار کرنی پڑی ہے، اس کی حیثیت ایک ''دارالعذاب'' کی سی ہے اور تمام انسانوں کو اس سزا کو برداشت کرنا چاہئے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جدوجہد کرنا ایک غیر مطلوب شے بن جاتے ہیں اور انسان ''تسلیم و رضا'' کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ زندگی کی نعمتیں اس کے لئے فراہم کی گئی ہیں اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنا ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ اسی طرح جو نفسیاتی رویہ یہاں پیدا ہوتا ہے وہ تھیا کریسی کی بالکل ضد ہے۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظام تھیا کریسی سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری یہ بحث ہمیں اس نتیجے پر لاتی ہے کہ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی، مقصدی اور نظریاتی ریاست ہے جو لادینیت اور تھیا کریسی دونوں سے مختلف ہے۔

(۳) اشتراکیت اور جمہوریت:

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اشتراکی امریت اور مغربی طرز کی جمہوریت دونوں سے مختلف ہے۔

۱۔ اشتراکیت مذہب کی نفی پر مبنی ہے اور اسلامی ریاست خدا کے قانون کی تابع اور اسے قائم کرنے والی ہے۔

۲۔ اشتراکیت فرد کی مستقل اور جداگانہ شخصیت کو نہیں مانتی اور اسے طبقے میں ضم کر دیتی ہے اور ریاست کو ایک طبقے کا آلہ کار بنا دیتی ہے۔ اسلام ان میں سے کسی چیز کو بھی درست نہیں مانتا۔ وہ فرد کو بنیاد مانتا ہے اور اس کی شخصیت کو مستحکم کرنے اور نشو و ارتقا دینے کے

مواقع فراہم کرتا ہے۔ وہ طبقات کی نفی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے۔

۳۔ اشتراکیت کا نظام آمرانہ ہے جبکہ اسلام کا نظام شورائی ہے۔ اس میں تمام امور لوگوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتے ہیں، ان پر اوپر سے تھوپے نہیں جاتے۔

۴۔ اشتراکیت ریاست کے اختیارات کو غیر محدود کر دیتی ہے اور شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی حقیقی ضمانت نہیں دیتی۔ اسلام ریاست کے اختیارات کو ایک خاص دائرے میں محدود کر دیتا ہے اور معصیت میں اطاعت کو یا حقوق انسانی کے بلاحق شرعی ختم کیے جانے کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ حکومت کو مسئول بناتا ہے اور اسے عوام کے مشورے کا پابند کرتا ہے۔ نیز شخصی اور سیاسی آزادی کی حقیقی ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی ریاست ہمہ گیر تو ضرور ہے لیکن اشتراکیت کی طرح کلیت پسند نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اسلامی ریاست اشتراکی آمریت سے بالکل مختلف ہے۔

پھر اسلامی ریاست خود مغربی جمہوریت سے بھی مختلف ہے۔ اسلام کو جمہوری کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلاء سے کچھ زیادہ ہی شد و مد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہئے اور قانون کی حکمرانی کے اصول پر عمل ہونا چاہئے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جاننے اور اس کو موثر بنانے کے لئے جو نظام اور جو ڈھانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں۔ اسلام جن چیزوں میں مغربی جمہوریت سے اختلاف رکھتا ہے، یہ ہیں:

۱۔ حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے۔ بنیادی قانون قرآن وسنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی

نہیں ہوسکتی۔ اگر صد فی صد افراد خدا کے قانون کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اس کا اختیار نہیں۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے۔ یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے ان میں عوام اور ان کے نمائندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی وعمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے ان میں تفصیلات طے کریں۔ اس طرح جمہور کی قانون سازی کے اختیارِ مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے محدود اختیار کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں۔ ہمارے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور ہم اپنے معاملات اس کے مطابق ہی طے کرتے ہیں۔

۲۔ جمہوریت میں ہر لحظہ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا رہتی ہے اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا، وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے، وہ یہ ہے:

وتعاونوا علی البر و التقویٰ و لا تعاونوا علی الاثم والعدوان.

(المائدہ:۲)

[نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کرو۔]

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

۳۔ اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لئے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیئے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ حضورﷺ کا ارشاد ہے:

''بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔'' (بخاری ومسلم)

''ہمارے نزدیک تم میں سے سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود حکومت کے

کسی عہدہ و منصب کا طالب ہو۔" (ابوداؤد)

اس طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب امر کے لئے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی۔

۴۔ جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے جب کہ اسلامی ریاست اصولی اور نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالمگیر ہے۔

الغرض اسلامی ریاست کا مزاج لادینیت، تھیاکریسی، جمہوریت اور اشتراکیت سب سے جدا ہے۔ مسلمانوں نے اس اسلامی نظام کا "خلافت" کی صورت میں ایک طویل تجربہ کیا ہے، مسلمانوں میں خلافت کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں یقیناً سب کچھ اچھا نہیں رہا، بہت سے امور اصلاح طلب سامنے آئے، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب تجربہ تھا، جسے زیادہ بہتر بنیادوں پر دہرایا جانا چاہئے۔ بہتر ہوگا کہ خلافت کے بارے میں بعض اہم تفصیلات فراہم کی جائیں۔

خلافت:

"خلافت" عربی کا ایک مصدر ہے اس کا مادہ "خَلَفَ" ہے، خلیفہ کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، قرآنی اصطلاح میں خلافت اور "استخلاف فی الارض" اور "وراثت و تمکن فی الارض" سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ قرآن کریم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے۔ جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافتِ ارضی کا اہم مقصد یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی ہدایت و سعادت کے لئے خاص ذمہ دار لوگوں کی حکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے زمین کو پاک کرے اور امن و سکون کی فضا کو عام کرے اور عدلِ اجتماعی قائم کرے۔[۱]

پہلا انسان، جس کی تخلیق کی گئی یعنی حضرت آدم علیہ السلام، وہ اس زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ ہی تھے۔ اس پہلے انسان ہی کو ایسے اختیارات (ریاستی قوت) حاصل تھے جس کی بنیاد

پر انہوں نے اولین گروہِ انسانی کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا اور زمین میں اللہ کی عبادت کا نظام قائم کیا۔ اس کے بعد زمین کی یہ وراثت و خلافت یکے بعد دیگرے مختلف اقوام کے سپرد ہوتی رہیں۔ مختلف آیاتِ قرآنی میں اسی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

''اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو، جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ (اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو) میرا پروردگار تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔'' (ھود: ۵۷)

سورۃ یونس میں فرماتا ہے:

''پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو ان کی جگہ دی تا کہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔'' (یونس: ۱۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔'' (ص: ۲۶)

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے تعبیر کیا گیا۔

''اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں ہی کو وراثت میں آئے گی۔'' (الانبیاء: ۱۰۵)

''اس طرح ہم نے اس سرزمین (مصر) میں یوسفؑ کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی۔'' (یوسف: ۵۶)

اور اسی خلافت کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا:

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیئے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دے گا، ٹھیک اسی طرح جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے۔ ان کے لئے ان کے پاس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے

اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔'' (النور:۵۵)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی، قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کی حالت کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے حملوں کے خدشات کا یہ حال تھا کہ کسی بھی وقت مسلمان، ہتھیار اپنے جسم سے اتارتے نہیں تھے۔ اس وقت بعض مسلمانوں نے کہا ''ایک دن ہم پر ایسا نہیں گزرا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح و شام بسر کرتے اور ہتھیار اپنے جسم سے الگ کر سکتے۔'' ابو العالیہ راوی ہیں کہ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہ ہوں، ایمان اور عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا۔ مظلومی و بے چارگی کی جگہ کامرانی اور فرمانروائی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آجائے گی۔ ۱۸

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک خلافت فی الارض زمین کی حکومت اور تسلط ہے، پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک بموجب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار اسے حاصل نہ ہو، وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جس کے لئے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معنوں میں سلطنت و فرمانروائی ہے۔ ۱۹

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں کے قبضہ اقتدار میں آچکا تھا، رومیوں کے مقابلے کے لئے اسلامی لشکر ترتیب دیا جا چکا تھا، تب ''خلیفہ رسول اللہ'' کے طور پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت ہوئی اور خلافت کا وہ سلسلہ چلا جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد اور تسلسل کے اعتبار سے طویل ترین تھا۔ اس سلسلۂ خلافت اسلامیہ کو اپنی خصوصیات و نتائج کے اعتبار سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں دے دی تھی۔ اس بارے میں جو احادیث مذکور ہیں وہ کثرت وطرق، سیرت متن اور قبولِ طبقات کی بناء پر حد تواتر تک پہنچ

چکی ہیں۔ اس کے حوالے سے خلافت کا پہلا دور خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) کا تھا جسے "خلافت علی منہاج النبوۃ" بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ صحیح اور کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریقِ کار ٹھیک طریق کے مطابق تھا۔ یہ دور تقریباً تیس برسوں پر محیط تھا۔

خلافت کا دوسرا دور جو اس کے بعد شروع ہوا وہ منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و بادشاہت کا تھا جبکہ سابقہ جاہلیت، خالص اسلامی و عربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کر رہی تھی۔ یہ خلافت (یعنی اموی خلافت) بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں خلافتِ راشدہ سے قریب تر تھی لیکن موروثی نظام نے اس میں ایسی استبدادیت پیدا کر دی کہ خلافتِ راشدہ کے حقیقی خصائص کمزور پڑنا شروع ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ حکمران "خلیفہ" ہی کہلاتے تھے، "بادشاہ" نہیں۔ خلافتِ بنو امیہ سے لے کر ۱۹۲۴ء تک جو سلسلہ خلافتِ اسلامیہ جاری رہا وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ پہلے دور کو "خلافتِ خاصہ" اور دوسرے دور کو "خلافتِ عامہ" کہا جاسکتا ہے۔[۲۰] مشہور حدیث کے مطابق "**الخلافة بعدی ثلثون عاماً ثم ملک بعد ذٰلک**" یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میرے بعد تیس سال تک خلافت ہے پھر بادشاہت۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ "**الخلافة بالمدینة و الملک بالشّام**" یعنی خلافت مدینہ میں اور بادشاہت شام میں ہوگی۔ ایک اور حدیث میں بالترتیب تین ادوار بتائے گئے ہیں۔

۱۔ عہد نبوت و رحمت (یہ دور رسول اللہ ﷺ کی وفات پر ختم ہو گیا۔)

۲۔ عہد خلافت و رحمت (یہ دور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حضرت علیؓ تک رہا۔)

۳۔ عہد بادشاہی و فرمانروائی (یہ عہد خلافت بنو امیہ سے شروع ہوا اور خاتمہ خلافت تک رہا۔)

یہ بات اہم ہے کہ احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اول سے مشابہہ ہوگا اور جس کا حال یہ ہوگا کہ "لایدری اولها خیراً ام اخرها" یعنی نہیں کہا جاسکتا کہ امت کی ابتداء زیادہ کامیاب تھی یا

اس کا اختتام؟ یہی وہ زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں میں پورا ہو کر رہے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

''یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پھیلا کر رہے گا، خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو، وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے، خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

(الصّف: ۸-۹)

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دنیا میں اسلامی نظامِ سیاست کاری قائم ہو۔ نظام خلافت کے خاتمے کے بعد امتِ مسلمہ آج انتشار و افتراق کا شکار ہے، لیکن قرآن، احادیث بعض امکانات کی طرف اشارہ کررہے ہیں، جن کے لئے امت مسلمہ کو مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔

❦ ♦ ❦

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۶۶۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ اسی بنیاد پر علامہ اقبال کہتے ہیں ع......

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

۴۔ ان اللہ لیزع بالسطان مالا یزع بالقراٰن (تفسیر ابن کثیر)

۵۔ یہاں خلافت اور امامت معنی ومفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں۔

۶۔ ابن حزم، الفصل بین الملل و النحل، جلد ۴، ص ۸۷۔

۷۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، فصل اول، حصہ اول۔

۸ اسلامی نظریہ حیات، ص۴۷۴، ۴۸۳۔

۹ اسلامی نظریہ حیات، ص۴۷۸، (حاشیہ)۔

۱۰ ایضاً۔

۱۱ اسلامی نظریہ حیات، ص۴۹۷، (بحوالہ کتاب الخراج ص۸۵، از امام ابوسف)۔

۱۲ آر۔این۔کریوہنٹ، تھیوری اینڈ پریکٹس آف کمیونزم، ص۶، لندن، ۱۹۵۱ء۔

۱۳ آرنلڈ، جے، ٹائن، *Christianity among the religions of the world*، ص ۵۶۔

۱۴ یہ متن پروفیسر خورشید احمد کی کتاب اسلامی نظریہ حیات، ص۴۸۳ تا ۴۸۶ لیا گیا ہے۔

۱۵ F. Royston Pike, *Encyclopaedia of Religions*, Meridion Library, 1958, p. 347.

۱۶ Robert Briffault, *The Making of Humanity*, p 113.

۱۷ آزاد، ابوالکلام، مسئلہ خلافت، ص۵-۷، لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۱۸ مسئلہ خلافت، ص۸-۹ (بحوالہ تفسیر طبری، جلد ۱۸، ص۱۲۲)

۱۹ ایضاً، ص۱۰۔

۲۰ ابوالکلام آزاد نے مسئلہ خلافت، ص۱۲-۱۳ پر خلافتِ خاصہ اور خلافتِ ملوکی کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

تیئسواں باب:

اسلام کا عدالتی نظام

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ عدل و انصاف کے بغیر نہ ترقی کر سکتا ہے نہ قائم ہی رہ سکتا ہے۔ وہ بڑی بڑی انسانی تہذیبیں جو نیست و نابود ہوگئیں، ان کے اسبابِ زوال میں سرِ فہرست عدل و انصاف کے تقاضوں کا پورا نہ ہونا رہا ہے۔ ظلم، زیادتی اور بے انصافی نے بہت سی سلطنتوں کو زوال سے ہمکنار کیا۔

انسانی فطرت جن خوبیوں کو عالمی سچائی کے طور پر مانتی ہے ان میں بھی سرفہرست عدل و انصاف ہے۔ ایسا دین جو انسانی فطرت سے قریب ترین ہو، اس کے پاس عدل و انصاف کے لئے تعلیمات اور احکامات ہونے چاہئیں۔ لہٰذا قرآنی تعلیمات میں بڑے واضح احکامات اس حوالے سے ملتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں قبائلی نظام تھا۔ ان کے یہاں کسی منظّم دستوری حکومت کا پتا نہیں چلتا۔ قبیلہ ایک اکائی تھا اور شیخ قبیلہ اپنے قبیلے کے تمام معاملات کا نگران ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اپنے علاقے کی روایات اور عرف کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں کسی تشریعی قوت کا وجود نہ تھا۔ تاہم بعثت نبوی سے قبل قصّی بن کلاب کی قائم کردہ چودہ عہدوں پر مشتمل ایک حکومت کا پتا چلتا ہے۔

عہدِ جاہلیت میں ایسے رسوم و رواج تھے جن کی عموماً پابندی کی جاتی تھی۔ عرب اپنے مقدمات فیصل کرانے کے لئے کاہنوں اور عرّافین کے پاس بھی جاتے تھے۔ کاہن سے متعلق

عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کے تابع کوئی نہ کوئی جن ہوتا ہے جو اسے ہر چیز سے مطلع کرتا رہتا ہے۔عراف (قیافہ شناس) وہ شخص ہوتا تھا جو اپنی فراست اور قرائن کی مدد سے معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ ان میں فصل خصومات کے لئے قرعہ اندازی کا ایک طریقہ بھی جاری تھا۔عربِ جاہلیہ نے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے بعض اوقات معاہدے بھی کیے اور حلف یا عہد و پیمان بھی کیے۔اس میں ''حلف الفضول'' سب سے مشہور معاہدہ ہے۔جس میں رسول اللہ ﷺ بھی شریک ہوئے (یہ بعثتِ نبوی سے قبل کا واقعہ ہے)اس کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔

عاص بن وائل سہمی اور قبیلۂ زبید کے ایک شخص کے درمیان ایک نزاع تھی۔ عاص نے اس سے کچھ سامان خریدا تھا اور قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ جب اس شخص کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اُس نے خانہ کعبہ میں جا کر چیخ و پکار کی اور یہ اشعار پڑھے۔

یا للرجال لمظلومٍ بضاعتهٗ　　ببطن مكه نائی الحی و النفر

ان الحرام لمن تمت مكارمة　　و الاحرام لثوب الفاجر الغدر [1]

[اے لوگو! ایک ایسے مظلوم کی مدد کے لئے آؤ جس کا سامانِ تجارت مکہ کی وادی میں (لوٹ لیا گیا) اور وہ اپنے ہم قبیلہ اور ساتھیوں سے دور ہے۔

احترام اس شخص کا کیا جاتا ہے جو اپنے اخلاق میں کامل ہو، غدّار اور فاجر کے لئے کوئی اعزاز و احترام نہیں۔]

قریش نے اس پر مثبت ردعمل کا مظاہرہ کیا، وہ عبداللہ بن جدعان کے گھر پر جمع ہوئے جہاں انہوں نے مشترکہ طور پر حلف اٹھایا کہ ظالموں کے خلاف مظلوموں کی مدد کی جائے گی۔اس معاہدہ کو ''حلف الفضول'' کہتے ہیں۔

بعثتِ محمدی کے بعد عدل و انصاف کے حوالے سے واضح قرآنی احکامات نازل ہوئے۔ ان قرآنی تعلیمات اور اسوۂ محمدی سے اسلام کے عدالتی نظام کے چند بنیادی اصول متعین کیے جا سکتے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

ان اللہ یأ مر بالعدل و الاحسان (النحل:۹۰)

[اللہ تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔]

اللہ تعالیٰ نہ ظلم کرتا ہے نہ ظلم برداشت کرتا ہے۔

انہٗ لا یحب المعتدین (الاعراف:۵۵)

[بے شک وہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔]

یہی نہیں بلکہ قرآن ظالموں کو ملعون قرار دیتا ہے۔

اَنْ لَّعنۃُ اللہِ علی الظّٰلمین. (الاعراف:۴۴)

[ظالموں پر اللہ کی پھٹکار (لعنت) ہے۔]

قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس میں عدل و انصاف کو فوق الکل اہمیت حاصل ہے۔ایک موقع پر ارشاد ہوا۔

قل امر ربی بالقسط (الاعراف:۲۹)

[کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے انصاف کا حکم دیا ہے۔]

اس بات کو تکرار کے ساتھ کہا گیا ہے۔

وَ اُمِرْتُ لِاَعْدل بینکم (الشوریٰ:۱۵)

[اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔]

لہٰذا آپؐ نے تمام زندگی ظلم اور جہالت کو مٹانے اور عدل و انصاف کے قیام کے لئے جد و جہد جاری رکھی اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے اس کردار کو نبھایا خصوصاً خلافتِ راشدہ اس اعتبار سے ایک مثالی دورِ حکومت ہے جو ظلم و زیادتی اور بے انصافی سے پاک رہا۔ آپؐ نے حکماً ظلم سے روک دیا۔فرمایا:

اُنصر اخاک ظالماً او مظلوماً (البخاری،۲:۸۹)

[اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔]

مظلوم کی مدد کرنا تو واضح ہے لیکن ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ جب یہ سوال صحابہ کرام

کی طرف سے ہوا تو آپؐ نے تشریح فرمائی کہ ظالم کی مدد، اُس کو ظلم سے روک کر کی جائے۔

آپ جن لوگوں کو مختلف علاقوں پر عامل بنا کر بھیجتے تھے انہیں مظلوم کی فریاد سے بچنے کی تاکید کرتے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا:

اتق دعوة المظلوم فانه لیس بینها و بین الله حجاب (بخاری، باب وجوب الزکاة)

[مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے مابین کوئی پردہ نہیں ہوتا۔]

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ عدل و انصاف بے لاگ ہونا چاہئے جس میں کسی قسم کا تعصب اور جانب داری کا شائبہ تک نہ ہو۔

یا ایها الذین اٰمنوا کونو قوامین لله شهداء بالقسط و لا یجرِ منکم شنان قوم علی انْ لّا تعدلوا ط اِعْدِلوا هوا اقرب للتقویٰ (المائدہ:۸)

[مومنو! اللہ کے لئے گواہ بن کر انصاف کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے ناانصافی کرو۔ ہر صورت میں انصاف کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔]

لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے بے لاگ انصاف کیا، با اثر لوگوں کے خلاف فیصلہ کرنے میں آپ کو کبھی تامل نہیں ہوا۔ فاطمہ مخزومیہ کا واقعہ اس کی واضح مثال ہے بنو مخزوم قریش کا ایک بہت معزز قبیلہ تھا، اس قبیلے کی ایک خاتون فاطمہ نے چوری کی، قبیلے کے لوگوں نے بے عزتی کے خوف سے حضرت اُسامہ بن زید سے، جو رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھے، سفارش کروائی۔ حضرت اُسامہ نے سفارش کے لئے جونہی بات شروع کی تو آپ کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور ان سے کہا "اے اُسامہ! کیا اللہ کے حق میں تم سفارش کرتے ہو؟" پھر آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا "تم سے پہلے لوگ اسی بناء پر ہلاک ہو گئے کہ جب قوم کا کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو وہ اُسے چھوڑ دیتے، اور

جب کوئی کمزور شخص اس کا مرتکب ہوتا تو اس کو سزا دیتے۔ بخدا اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس پر بھی حد جاری کر دیتا۔'' پھر آپؐ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ ۲

مدینہ میں تین یہودی قبائل آباد تھے۔ یہ تینوں طاقت اور قوت کے اعتبار سے یکساں نہ تھے۔ لہٰذا ان کے خون بہا کے معاملات میں بھی فرق تھا، بنونضیر، بنوقریظہ سے زیادہ طاقتور تھے، لہٰذا اگر کوئی نضیری کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو اس کو نصف دیت ادا کی جاتی، اور اگر کوئی قریظی کسی نضیری کو ہلاک کر دیتا تو اس کو پوری دیت ادا کرنی پڑتی۔ آپؐ نے اس ناانصافی کو ختم کیا اور یہودی قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ کے خون بہا میں معادلت (یعنی برابری) قائم فرمائی۔ ۳

اس زمانے کے یہودیوں نے یہ ظلم اور ناانصافی کئی معاملات میں روا رکھی ہوئی تھی۔ اگر ان کا کوئی معزز آدمی زنا کرتا تو اُسے معمولی سزا دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا اور غریب پر حد جاری کی جاتی تھی۔ آپؐ نے اس عدم مساوات کو بھی ختم کیا۔ ۴

آپ کا انصاف بے لاگ ہوتا۔ انصاف کرتے ہوئے آپ کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم، اپنے اور بیگانے میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ کئی مرتبہ آپ نے مسلمان کے خلاف غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دیا۔ ایک یہودی کا ایک مسلمان پر قرض تھا۔ غزوۂ خیبر کے دوران اس نے تقاضا شروع کر دیا۔ مسلمان نے مہلت مانگی مگر یہودی نے مہلت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپؐ نے مقروض کو فوری ادائیگی کا حکم دیا اور تعمیل نہ ہونے کی صورت میں قرض خواہ کو اس کے بعض کپڑے لے جانے کی بھی اجازت دے دی۔ ۵

واقدی لکھتے ہیں کہ فتح خیبر کے بعد آپ نے کھیتی باڑی کا سارا کام یہودیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے چونکہ یہ علاقہ بزور فتح کیا تھا لہٰذا وہ اس پر اپنا حق سمجھتے ہوئے وہاں سے پھل اور سبزی وغیرہ لے لیتے تھے۔ اس کی یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی۔ اس پر آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ معاہدہ قوم کا مال مسلمانوں کے لئے حلال نہیں۔ اس کے بعد مسلمان سبزی اور پھل وغیرہ کی قیمت ادا کرنے لگے۔

(۳) کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں۔ یہ تیسرا اہم اصول ہے۔ لہٰذا عدل وانصاف

کی حکمرانی کے لئے آپ خود بھی ہمیشہ جواب دہی کے لئے تیار رہتے۔ کیونکہ قرآنی احکامات کی روح یہ تھی کہ کسی کو بھی قانون سے بالاتر نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا نادانستہ طور پر بھی اگر کسی کو آپ سے ایذا پہنچتی تو آپ اسے بدلہ لینے کی فراخ دلانہ پیش کش فرماتے۔ سیرتِ رسول میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے دوران ایک شخص کے چہرے پر، جو اپنا حصہ لینے کے لئے آپ پر جھک آیا تھا۔ آپ کے نیزے کا زخم لگ گیا۔ آپؐ نے فوراً اُسے بدلہ لینے کی پیش کش کی، مگر اس نے معاف کردیا۔[6]

ایک موقع پر آپؐ نے ایک شخص کو کمر پر ٹھوکا دیا، جو لوگوں کو ادھر ادھر کی باتیں کرکے ہنسا رہا تھا، جس پر اُس نے بدلہ لینے کی خواہش ظاہر کی، آپؐ نے اپنی کمر آگے کردی۔ اُس نے کہا میں برہنہ تن تھا، جبکہ آپ نے تو قمیض پہنی ہوئی ہے۔ آپ نے اپنی قمیض اٹھادی تا کہ وہ اپنا بدلہ لے لے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر مہرِ نبوت کو چوما اور کہا ''میں تو بس یہی چاہتا تھا۔''[7]

اسی طرح ایک یہودی زید بن سعید نے نہ صرف قبل از وقت اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا بلکہ نہایت سختی اور درشتی سے آپ کے خاندان کی بھی ہتک کی۔ حضرت عمر نے اس کو سزا دینی چاہی مگر آپ نے فرمایا ''اے عمرؓ تمہیں چاہیئے تھا کہ اسے حسنِ تقاضا کی تلقین کرتے اور مجھے حسنِ ادا کی۔'' پھر اس کو نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کے حصے سے زیادہ اسے معاوضہ عنایت فرمایا۔[8]

انتقال سے چند روز قبل آپ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ جس کا مجھ پر کوئی حق ہو یا تو وہ وصول کرلے اور یا معاف کردے۔ ایک شخص نے چند درہموں کا مطالبہ کیا جو فوراً ادا کردیئے گئے۔[9]

الغرض ان عدالتی اصولوں کے مطابق عہدِ رسالت میں مقدمات فیصل کیے جاتے۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے اور اھ کو تمام اہل مدینہ کی شراکت سے ''میثاقِ مدینہ'' طے پایا تو اُس کی ایک شق یہ تھی کہ ''اس معاہدے پر دستخط کرنے والوں کے درمیان اگر کوئی قضیہ اٹھ کھڑا ہو تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کریں گے۔''[10]

لہٰذا آپ کی حیات تک لوگوں کے مقدمات کے فیصلے آپؐ خود کیا کرتے تھے، البتہ مدینہ سے باہر جھگڑے طے کرانے کے لئے آپؐ، صحابہ کو مامور کردیا کرتے تھے۔ آپؐ کے

آخری برسوں میں جب مکہ اور یمن وغیرہ فتح ہو گئے تو آپ نے اپنے عمال ان علاقوں میں بھیجے جو صرف منتظم ہی نہ ہوتے تھے بلکہ اپنے علاقے کے لئے بمنزلہ قاضی بھی ہوتے تھے، اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں کتاب اللہ، سنت اور اجتہاد کے مطابق لوگوں کے جھگڑے فیصل کرنے کی اجازت دی۔ حضرت معاذ بن جبل کا واقعہ اس سلسلہ میں مشہور ہے۔

یہ عدالتی نظام جو عہد رسالت میں اپنی ابتدائی شکل میں کارفرما تھا۔ عہدِ خلافت راشدہ میں انہی اصولوں پر بروئے کار لایا گیا بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا وہ کمزوروں کے حقوق کے تحفظ کا ہی منشور تھا۔ اس خطبے کو عام طور پر زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ آپؓ نے فرمایا:

> ''تمہارا کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اُسے اس کا حق نہ دلادوں اور تمہارا طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے (کمزور کا) حق نہ لے لوں۔''[۱۱]

یہ ایک طرح سے ان کا *Policy Statement* تھا۔ اپنے دورِ خلافت میں انہوں نے قضاء کے فرائض حضرت عمرؓ بن خطاب کے سپرد کیے، ان کی سخت گیری اور حزم و احتیاط سے سب ہی واقف تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس تک حضرت عمر کی خدمت میں کوئی مقدمہ نہیں آیا۔ حضرت عمرؓ قضاء کے ذمہ دار تو تھے لیکن اس وقت قاضی کے لقب سے ملقب نہیں کیے گئے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ عربوں کے تعلقات غیر عرب اقوام سے قائم ہوئے، نت نئے تمدنی مسائل نے سر اٹھایا، لہٰذا حضرت عمرؓ نے تشریعی نظام پر بہت توجہ دی اور مختلف صوبوں اور علاقوں میں قضاۃ مقرر کیے۔

حضرت عمرؓ نے ان قضاۃ کے لئے ایک دستور بنا دیا تھا جس کی روشنی میں وہ اپنے فیصلے کرتے۔ حضرت عمرؓ کے اس دستور العمل کے اصول اور قاعدے آج کے جدید عدالتی نظاموں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری (جن کا نام عبداللہ بن قیس تھا) کو لکھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی جانب سے عبداللہ بن قیس کے لئے۔ آپ پر سلامتی ہو۔ اما بعد، عدالت فرضِ محکم اور سنتِ رسول ہے۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے آئے تو اس کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔ کسی (فیصلے کا) اعلان جس کا نفاذ نہ ہوسکے بے معنی ہے۔ لوگوں کو اپنی مجلس میں مساوی رکھو تا کہ جو اعلیٰ ہو وہ تمہاری رعایت کا امیدوار اور جو ادنیٰ ہے وہ تمہارے عدل سے ناامید نہ ہوجائے۔ جو شخص دعویٰ کرتا ہے بارِ ثبوت اسی پر ہے۔ جو شخص انکار کرے اس پر قسم ہے۔ مسلمانوں کے درمیان مصالحت جائز ہے لیکن ایسی کہ جس سے حلال حرام اور حرام حلال نہ ہونے پائے۔ جو فیصلہ تم نے کل کیا اگر آج غور کرنے سے حق کے خلاف نظر آئے تو اس سے رجوع کرلو کہ حق و صداقت ہی اصل چیز ہے۔ باطل میں پڑے رہنے سے حق کی طرف لوٹ آنا بہتر ہے۔ جس معاملہ میں خلجان ہو اور وہ کتاب و سنت میں نہ ملے تو غور کرو، اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں کو دیکھو اور پھر انہیں نظائر پر قیاس کرلو۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک معیاد مقرر کردو، اگر وہ اس مقررہ وقت کے اندر اندر ثبوت لے آئے تو اس کا حق دلا دو۔ ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کرو۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کی صحت و صداقت اندھوں کو بھی نظر آسکتی ہے اور جس کے اختیار کرنے کے بعد کسی کو کسی قسم کے عذر کا موقع باقی نہیں رہ جاتا۔ تمام مسلمان ایک دوسرے پر شہادت کے لئے قابل اعتبار ہیں بجز ان لوگوں کے جنہوں نے حدّ شرعی میں درّے کھائے ہوں یا جھوٹی شہادت میں ان کا تجربہ ہو چکا ہو یا ولاء اور وراثت کے معاملہ میں ان پر شبہ ہو۔ پوشیدہ امور کا علم صرف خداوند تعالیٰ کو ہے، تمہارا کام ثبوت و شواہد کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ اظہارِ حق کے مواقع پر مخاصمین کی باتوں سے ہیجان میں نہ آجاؤ، غصہ کو راہ نہ دو، دلگیر نہ ہو اور نہ ان کی جانب سے اپنے اندر نفرت کے جذبات پیدا ہونے دو کہ (سادہ طریقہ پر) حق کا

پہنچا دینا ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا اجر رکھتا ہے اور بڑی نیکی کا باعث ہوتا ہے۔
پس خواہ خود اپنے نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جو شخص اپنی نیت کو خالص رکھتا ہے، خدائے تعالیٰ اس کو لوگوں کے شر سے بچا لیتا ہے۔ لیکن جو شخص حق کو چھوڑ کر لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے، خداوند تعالیٰ اسے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔'' ۱۲

یہ وہ اصول ہیں جو عین اسلامی روح کے مطابق ہیں۔ جن پر پورا اسلامی نظامِ عدل استوار ہے۔ اُس وقت قانون بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اسلام کا قانون قرآن کی صورت میں موجود تھا۔ تاہم چونکہ اس میں جزئیات کا احاطہ نہیں ہے اس لئے حدیث (سنت) اور اجماع و قیاس سے مدد لینے کی گنجائش نکالی گئی۔ حضرت عمرؓ نے قضاۃ کو خاص طور پر اس کی ہدایت لکھی۔ کوفہ کے قاضی شُریح کے ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات میں اوّل قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو۔ قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث، اور اگر حدیث میں نہ پاؤ تو اجماع (کثرتِ رائے) کے مطابق اور اگر اجماع بھی نہ ملے تو خود اجتہاد کرو۔ ۱۳

قضاۃ کے انتخاب میں حضرت عمرؓ نے نہایت احتیاط اور غور و فکر سے کام لیا اور جن لوگوں کا انتخاب کیا وہ بے مثال تھے مثلاً:

☆ پایہ تخت یعنی مدینہ منورہ کے قاضی زید بن ثابت تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کاتبِ وحی رہے تھے۔ وہ سریانی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے۔ اور خصوصاً علمِ فرائض میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔

☆ بصرہ کے قاضی کعب بن سورازدی تھے۔ بہت بڑے معاملہ فہم اور نکتہ شناس تھے۔ امام ابن سیرین نے ان کے بہت سے فیصلے اور احکام نقل کیے ہیں۔ ۱۴

☆ فلسطین کے قاضی عبادہ بن صامت تھے، جو ان پانچ اشخاص میں سے ایک ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پورا قرآن حفظ کیا تھا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اہل صفہ کی تعلیم سپرد کی تھی۔ حضرت عمرؓ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت امیر معاویہ نے ان کی مخالفت کی تو حضرت عمرؓ نے ان کو امیر

معاویہ کی ماتحتی سے الگ کر دیا۔

☆ کوفہ کے قاضی عبداللہ بن مسعود تھے جن کا فضل و کمال محتاجِ بیان نہیں۔ فقۂ حنفی کے مورثِ اوّل وہی ہیں۔ عبداللہ بن مسعود کے بعد ۱۹ھ میں قاضی شریح مقرر ہوئے۔ تابعی تھے اور حضرت علیؓ ان کو ''اقضی العرب'' کہا کرتے تھے۔

ان کے علاوہ جمیل بن معمر جمحی، ابو مریم حنفی، سلمان ربیعۃ الباہلی، عبدالرحمٰن بن ربیعہ، ابو قرۃ الکندی، عمران بن حصین، جو حضرت عمرؓ کے زمانے کے قاضی ہیں، ان کا تقویٰ، علمی مرتبہ اور سماجی حیثیت قابلِ ذکر تھی۔

حضرت عمرؓ نے قاضیوں کی تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں، یہ قاعدہ بھی مقرر کیا کہ جو شخص صاحبِ حیثیت (مالدار) اور معزز نہ ہو، قاضی مقرر نہ کیا جائے۔ ابو موسیٰ اشعری، گورنر کو مذکورہ فرمان لکھا اس میں اس کی وجہ یہ لکھی،

''دولت مند رشوت کی طرف راغب نہ ہوگا اور معزز آدمی پر فیصلہ کرنے میں کسی کے رعب و داب کا اثر نہ ہوگا۔''۱۵؎

اس کے علاوہ کسی قاضی کو تجارت اور خرید و فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی، یہ وہ اصول ہے جو مدتوں کے تجربے کے بعد ترقی یافتہ ممالک میں اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح ماہرینِ فن کا opinion لینا بھی حضرت عمرؓ نے متعارف کرایا۔ محکمۂ افتاء کا قیام بھی اسلامی عدالتی نظام سے وابستہ ہے۔ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں۔ (Ignorance of law is not an excuse.) یہ قاعدہ جو آج بھی لاگو ہے، ہر شخص کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ قانون سے واقف ہوگا۔ ہر شخص کو قانون سے واقف کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں محکمہ افتاء کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ وہ طریقِ کار تھا جس پر یورپ میں صدیوں بعد کام شروع ہوا۔

حواشی وحوالہ جات:

۱ حسن ابراہیم حسن، علی ابراہیم حسن، النظم الاسلامیہ، ترجمہ محمد محب اللہ لاری ندوی، کراچی، ۱۹۵۲ء۔

۲ مسلم، ج ۳، ص ۱۳۱۵، حدیث: ۱۶۸۸۔ صحیح بخاری، فضائل اصحاب النبی ﷺ، ترمذی، ج ۴، ص ۳۷۰ تا ۳۷۱، حدیث: ۱۴۳۔

۳ ابو داؤد، ج ۳، ص ۱۷، حدیث: ۳۵۹۱۔ النسائی، حدیث: ۴۷۳۔

۴ مسلم، ج ۳، ص ۱۳۲۶، حدیث: ۱۶۹۹ تا ۱۷۰۴۔

۵ احمد بن حنبل، مُسند، ج ۳، ص ۴۲۳۔

۶ ابو داؤد، ج ۳، ص ۶۳۷، حدیث: ۴۵۳۶، نسائی: ۴۷۷۴۔

۷ ابو داؤد، ج ۵، ص ۳۹۴، حدیث: ۵۲۲۴۔

۸ ابن الجوزی، ۲: ۴۲۵۔

۹ احمد بن حنبل، مسند، ج ۱، ص ۲۰۹، حدیث: ۱۷۸۴۔

۱۰ ابن ہشام، طبری۔

۱۱ دیکھئے ابن کثیر کی کتاب البدایہ و النہایہ۔

۱۲ جاحظ، البیان و التبیین، ج ۲، ص ۲۳، (شبلی، الفاروق، ص، النّظم الاسلامیہ، ص ۵۶۲)

۱۳ عربی عبارت کے لئے دیکھئے، الفاروق، ص ۳۳۶۔

۱۴ اسد الغابہ فی معرفۃ احوال الصحابہ، الاستیعاب (تذکرہ کعب بن سور ازدی)، الفاروق، ص ۳۳۷۔

۱۵ الفاروق، ص ۳۳۹۔

چوبیسواں باب:

شریعت اسلامی کے مآخذ

پچھلے باب میں بیان کیا گیا کہ عہدِ رسالت میں قانون سازی کی ضرورت نہیں پڑی۔ قرآن، مدینے میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کا آئین تھا۔ البتہ غیر معمولی فتوحات کے نتیجے میں جیسے جیسے تمدن نے ترقی کی اور نئے نئے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سامنے آئے تو مآخذ شریعت میں بھی وسعت آئی۔

شریعت: معنی و مفہوم:

شریعت کے لغوی معنی ''کھلے ہوئے، روشن، سیدھے اور صاف راستہ'' کے ہیں، لیکن مذہبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ قوانین اور احکام ہیں جو ایک رسول، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی بندگی، اور فرمانبرداری کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجاً (المائدہ: ۴۸)

[ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔]

یعنی تمام انبیاء اور تمام سابقہ کتب الٰہیہ کا دین تو یہی اسلام تھا، لیکن شریعت، یعنی عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول، باہمی معاملات اور تعلقات کے قوانین، حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے حدود وغیرہ امور سے متعلق تفصیلات میں فرق رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے پاس مختلف شریعتیں بھیجی

تھیں، اور جب تک تمدن اور اجتماعی زندگی کے وہ سارے وسائل پیدا نہیں کر لیے کہ ساری دنیا کو ایک رسول اور ایک شریعت پر جمع کیا جا سکے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں میں رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا جو اپنی اپنی قوم کو، الگ الگ شائستگی اور تہذیب و اخلاق کی تعلیم و تربیت دیتے رہے، چنانچہ بسا اوقات ایک ہی زمانے میں ایک سے زائد انبیاء مختلف علاقوں میں دعوتِ حق دیتے رہے۔ جب ان انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور بیدار ہوگیا اور انسانی معاشرہ اور تمدن کے مادی وسائل اتنے ترقی کر چکے کہ اب ساری دنیا کے لئے ایک ہی رسول و نبی کی بعثت کا وقت آ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپؐ کے ذریعہ ساری انسانیت کو وہ مکمل نظامِ زندگی عطا فرمایا جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور حالات وضروریات کے مطابق ہے۔ اور اس طرح گویا پرانی شریعتیں منسوخ کر دی گئیں۔ [1]

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شریعت اور فقہ خالص اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہیں، کیونکہ فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے امر و حکم پر مبنی ہوتے ہیں اور شریعت سے ماخوذ و مستنبط ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرہ بحث میں عموماً فروعی معاملات آتے ہیں۔ تاہم اس باریک فرق کے باوجود عوامی تفہیم کے لئے فقہ اور شریعت کو مترادف سمجھا جا سکتا ہے۔

شریعت کا مآخذ اوّل: القرآن

شریعت یعنی اسلامی قانون کا پہلا ماخذ "الکتاب" یعنی قرآن کریم ہے، جو اللہ کا کلام ہے۔

"یہ کتاب یقیناً خدائے رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔" (السجدہ:۲)

"(یہ کتاب) زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی نازل کردہ ہے۔" (طٰہٰ:۱۴)

"بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھائے۔" (النساء:۱۰۵)

قرآن کی آیات اسلامی معاشرے کے حالات کے تقاضوں کے مطابق وقتاً فوقتاً

نازل ہوئیں۔ اسی لئے یہ حالات اسباب نزول (شانِ نزول) کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزول کی عمومی مدت بائیس سال سے کچھ زیادہ ہے جس میں سے ساڑھے بارہ سال مکے کے اور باقی مدت مدینہ میں قرآن نازل ہوا۔ مکی آیات عموماً چھوٹی ہیں اور ان میں عقائد کے مجمل احکام بیان کیے گئے ہیں۔ مکی آیات چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہیں جن کی زبان نہایت پُر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

جبکہ مدنی آیات طویل ہیں اور ان میں زیادہ تر شریعت کے تفصیلی احکامات ہیں۔ ہجرت کے بعد حالات کا نقشہ بدل گیا تھا۔ مسلمان باقاعدہ ایک امت کی شکل اختیار کر گئے جو ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کے قیام میں کامیاب ہو گئے۔ جس کے تفصیلی احکامات نازل کیے گئے۔

غرض اس طرح دعوت و اصلاح کے ادوار کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تئیس سال کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔[۲]

کتابت وحفاظت:

یہ بات صرف قرآن ہی سے مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی بعینہٖ اسی طرح محفوظ کر دی گئی۔ حالانکہ اس سے قبل آسمانی کتابیں تحریفات ونسیان کا شکار ہو گئیں۔ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔

''قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے۔''

(السجدہ:۴۲)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُونَ (الحجر:۹)

[بے شک ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔]

قرآن کی کتابت وحفاظت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ پیر، ربیع

الاوّل ۴ نبوی کو دوسری وحی نازل ہوئی اور اعلانیہ تبلیغ کا حکم ہوا۔ جمعرات کو خالد بن سعید مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے کتابت شروع کروائی۔ اس طرح (دوسری) نزولِ وحی کے چوتھے دن سے کتابت شروع ہوگئی جو نزولِ قرآن کے اختتام تک برابر جاری رہی۔ بیک وقت کئی کاتبین وحی تھے۔ مورخین نے ان کی تعداد بیالیس (۴۲) تک بتائی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نزولِ قرآن کے وقت ایک نہ ملے تو دوسرا اس کام کو انجام دے دے۔ مزید احتیاط یہ تھی کہ کاتب کے لکھ لینے کے بعد آپؐ پڑھوا کر سنتے تھے، تاکہ اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے تو اس کو درست کرلیا جائے۔

حضرت زید بن ثابت کے الفاظ ہیں "جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضورؐ مجھ کو بلاتے تھے۔ میں تختی اور دوات لے کر حاضر ہوتا۔ آپ لکھاتے، لکھا کر پھر سنتے، اگر کوئی غلطی ہوتی تو درست کرادیتے۔"[۳]

قرآن کی کتابت جن چیزوں پر کی گئی وہ بڑی دیرپا تھیں۔ اس زمانے میں کاغذ پر لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ قرآن کی کتابت زیادہ تر رقاع (چمڑے کے ٹکڑے)، لِخاف (پتھر کی سفید پتلی تختیاں)، کتف (اونٹ کے مونڈھے/ شانے کی گول ہڈی)، عسیب (کھجور کی شاخوں کا کشادہ اور عریض حصہ)، ادیم (باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا) قتب (جمع قتاب = اونٹ کے کجاوے کے جوڑے اور پتلے تختوں کے ٹکڑے) یہ چیزیں ایک طویل مدت تک آفات وحوادث سے محفوظ رہتی تھیں۔

آج قرآن جس ترتیب پر ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد جب جنگ یمامہ میں ستّر حفّاظ شہید ہوگئے تو حضرات ابوبکرؓ اور عمرؓ کو سخت تشویش لاحق ہوگئی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے بار بار کے تقاضے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کو ایک جگہ جمع کروایا اور ایک نسخہ تیار ہوا، جو ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس محفوظ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس نسخہ سے متعدد نسخے لکھوائے اور ممالک محروسہ میں بھجوائے۔ حضرت عثمانؓ کو "جامع القرآن" اس بنا پر کہا جاتا تھا کہ انہوں نے قرآن کو، جو سات

مختلف قرأتوں میں پڑھا جاتا تھا، قریش کی قرأت پر جمع کیا۔

قرآن لوگوں کی اصلاح کے لئے نازل کیا گیا تھا لہٰذا اس میں لوگوں کے لئے تین باتوں کی رعایت رکھی گئی ہے۔

۱۔ عدم الحرج: یعنی اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ لوگوں پر تنگی نہ ہو۔

۲۔ تقلیل التکالیف: یعنی یہ کہ تکلیف کم سے کم ہو۔

۳۔ تدریج: یعنی کوئی حکم دفعتاً نازل نہ کیا جائے بلکہ اس میں تدریج کا پہلو ہو۔ ۴؎

عدم الحرج:

عربی زبان میں ''حرج'' کے لغوی معنی تنگی کے ہیں اس بات کی بے شمار دلیلیں ہیں کہ شریعت محمدی تنگی رفع کرنے کے اصول پر مبنی ہے۔

☆ لا یکلف اللہ نفساً الا وُسعھا (البقرۃ)

[اور اللہ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اس کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو۔]

☆ یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر (البقرۃ)

[اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا۔]

☆ وما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج)

[اور تم پر دین کے احکام میں کسی قسم کی تنگی نہیں۔]

حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ملتا ہے ''میں سیدھی اور آسان شریعت دے کر بھیجا گیا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ جب بھی آپ کو دو جائز باتوں میں سے کسی ایک بات کا اختیار دیا جاتا تو آپ آسان راستہ اختیار کرتے۔ اسی وجہ سے فقہا نے اسے شریعت کا بنیادی اصول قرار دیا ہے اور اس سے بہت سے احکام مستنبط کیے ہیں مثلاً مسافر کے لئے افطار کی اجازت، شدید ضرورت کے وقت حرام چیز کا حلال ہو جانا، پانی کی عدم موجودگی میں تیمم کی اجازت وغیرہ۔ ۵؎

تقلیل التکالیف:

یہ ''عدم الحرج'' کا لازمی نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے جب تنگی نہیں ہوگی تو تکلیف میں بھی کمی ہوگی۔ اس اصول کی طرف مندرجہ ذیل آیت سے راہنمائی ملتی ہے۔

''اے ایمان والو! ایسی فضول باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے منع فرمایا ہے جنہیں ابھی تک حرام قرار نہیں دیا گیا ہے اور فرمایا کہ ہوسکتا ہے تمہارا سوال ان کے حرام ہونے کا سبب بن جائے۔ اور اگر تم نہ پوچھو تو تمہیں کام کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا حج کرنا ہر سال واجب ہے یا ایک مرتبہ کرنے سے ادا ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں اس وقت ''ہاں'' کہہ دیتا تو حج ہر شخص پر ہر سال واجب ہو جاتا۔ پھر فرمایا کہ جن چیزوں کا بیان میں خود نہ کروں اس کے بارے میں زیادہ سوال نہ کیا کرو۔ سابقہ امتوں کی تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ سوال زیادہ کیا کرتے تھے اور اپنے انبیاء سے اختلاف کرتے تھے۔ یعنی زیادہ سوال کرنے پر جب کوئی چیز حرام یا واجب کردی جاتی تو وہ اپنے انبیاء سے اختلاف کرتے اور جھگڑتے۔

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا جرم اس شخص کا ہے جس نے کسی مباح چیز کے بارے میں سوال کیا، اور اس کے سوال کی بناء پر وہ چیز مسلمانوں پر حرام ہوگئی۔

ایک اور جگہ آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں تم انہیں ضائع نہ کرو۔ اور کچھ حدود مقرر فرمائے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور بعض چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا ہے جس کی جگہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شے کا حکم بھول گئے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد صرف شفقت اور رحمت ہے، اس لئے تم ان چیزوں کی جستجو میں نہ پڑو۔''[۶]

تدریج:

جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو اہلِ عرب بعض بہت بُری عادتوں میں مبتلا تھے، مثلاً شراب خور تھے، قمار بازی عام تھی، یہ بد عادتیں ان میں بہت راسخ تھی۔ لہٰذا ان کو چھڑانے کے لئے حکمت کو پیشِ نظر رکھا گیا، ان چیزوں کی حرمت کے لئے یک دم اور دفعتاً کوئی حکم نہیں نازل کیا گیا بلکہ بتدریج انہیں اس سے باز رکھا گیا۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ سے شراب اور قمار کے بارے میں سوال کیا گیا۔ قرآن نے جواب دیا۔

"لوگ آپ سے شراب اور قمار کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے ان دونوں کے استعمال میں نقصان بھی ہے اور فائدے بھی ہیں۔ البتہ اس کے نقصان فوائد سے زیادہ ہیں۔"

پھر شراب کے حوالے سے دوسرا حکم نازل ہوا۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم بکاریٰ۔

[اے مومنو! نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔]

اور تیسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے شراب کی ممانعت فرما دی۔ سوۃ المائدہ (جو مدنی سورۃ ہے) میں ارشاد ہوتا ہے۔

[اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور قرعے (پانسے) کے تیر، یہ سب گندی باتیں ہیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ ہوتا کہ تم تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو چاہتا ہی ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان بغض وعداوت ڈال دے اور نماز سے تم کو باز رکھے، تو کیا تم باز رہنے والے ہو۔]

قرآن کریم میں بندوں کو مختلف قسم کے احکام کا مکلّف کیا گیا ہے۔

۱۔ پہلی قسم کے احکام، عبادات سے متعلق ہیں اور یہ خدا اور بندے کا معاملہ ہے۔

۲۔ دوسری قسم کے احکام، معاملات سے متعلق ہیں جو انسانوں کا باہمی معاملہ ہے۔

۳۔ تیسری قسم عقوبات سے متعلق ہیں یہ تعزیزی احکام ہیں جن میں قصاص اور حدود کے احکام شامل ہیں۔ یہ فرد اور ریاست کے مابین معاملہ ہے۔

مآخذ دوم: السنۃ

سنت کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں۔ اصطلاحاً سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کا وہ ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بارہا عمل کیا۔ محدثین کی اصطلاح میں آ کر لفظ ''سنت'' کے مفہوم کا دائرہ اور پھیل گیا اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر (وہ کام جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا گیا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا) ہے۔ لفظ ''سنت''، ''حدیث'' کا مترادف ہے۔

قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا مآخذ ہے۔ سنت اپنی اصل حیثیت میں قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے۔ حدیث اور سنت کی حجیت اور ان کے دینی سند ہونے سے متعلق قرآن کی اندرونی شہادت بھی موجود ہے اور خارجی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ النحل: ۴۴ میں فرمایا۔

''ہم نے آپ کی طرف الذکر (قرآن) نازل کیا ہے تا کہ لوگوں کے سامنے آپ اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔''

سورۃ النساء: ٦٢ میں کہا گیا۔

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔''

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر ''اطیعو اللہ و اطیعوا الرسول'' جیسے جملوں کے ذریعہ اطاعتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسول کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نہ صرف رسولوں کی اطاعت کا حکم ہے بلکہ رسول کے اتباع کا بھی حکم ہے۔

''(مسلمانوں) تمہاری پیروی کے لئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ

ہے۔'' (الاحزاب:۲۱)

اس کے علاوہ بھی متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں جو''سنت'' کی حجیت اور سند پر دلیل ہیں۔

خارجی شہادتوں کے طور پر (۱) سب سے پہلے صحابۂ کرام کا طریقہ دیکھا جائے گا۔ تاریخی طور پر یہ بات معلوم ومشہور ہے کہ صحابہ کرام ہر معاملہ میں یہ دیکھتے تھے کہ آپ کا طریقہ کیا رہا ہے اور ہر موقع پر رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے یہی کہا کہ''میری اطاعت کرو اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں۔ اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی سنت سے انحراف کروں تو نہ میری اطاعت ہے نہ تقلید۔''

(۲) صحابہ کرام کے علاوہ محدیث وفقہا اور آئمہ مجتہدین نے حدیث وسنت کو دینی سند تسلیم کیا ہے اور قرآن کے بعد سنت اور حدیث کو اسلامی قانون کا مستقل مآخذ قرار دیا ہے۔ اور اسی پر تمام فیصلے کیے گئے ہیں۔

(۳) عقلی طور پر بھی اطاعت واتباعِ رسول کا معاملہ قابل قبول ہے کیونکہ اگر صرف پیغام ہی اللہ کو نازل کرنا ہوتا تو کسی فرشتہ کے ذریعہ ایک کتاب اُتار دیتا لیکن ایسی صورت میں اختلافات کا طوفان کھڑا ہو جاتا۔ لہٰذا ایک ایسی ہستی کا وجود ضروری تھا جو احکامِ الٰہی پر عمل کر کے دکھائے، اور اختلافِ امت کو دور کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی تاکید ہے کہ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ ایک کتاب اللہ، دوسری میری سنت۔''

حدیث کی کتابت، حفاظت اور تدوین:

مسلمان مورخین ومحدثین کی وجہ سے''حدیث'' کا سرمایہ سند کے ساتھ جمع کیا گیا۔ جہاں تک حدیث کی کتابت کا تعلق ہے، مستشرقین جن میں اگناز گولڈزیہر (I. Goldzihr) اور مارگولیتھ پیش پیش ہیں، کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حدیث کے مجموعے تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئے، یا بہت سے بہت ابن شہاب زہری سے سلسلہ ملا دیا جاتا ہے جو اموی عہد میں تھے لیکن یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے۔ حدیث کی تدوین رسول اللہ ﷺ

کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی۔ اس حوالے سے ایک تو صحابہ کرام کا حافظہ تھا۔ دوسری طرف بہت سا سرمایہ تحریری طور پر بھی جمع کرلیا گیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے فوراً بعد ہی "پہلا تحریری دستور مملکت" سے لے کر سینکڑوں خطوط و سرکاری دستاویزات کا ثبوت تو موجود ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہزاروں حدیثیں جو عادات، معاملات اور عقوبات سے متعلق تھیں، صحابہ کرام نے لکھیں۔

اگرچہ چند ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے سوا کچھ بھی لکھنے کی حوصلہ شکنی کی، لیکن اس کا تعلق ابتدائے اسلام کے زمانے سے تھا۔ اور اس احتیاط کی وجہ سے تھا کہ کہیں لوگ قرآن کو قولِ رسول سے گڈمڈ نہ کردیں۔ بعد میں آپؐ نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ مثلاً ایک انصاری صحابی نے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا "اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو" (یعنی لکھ لو)۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص، رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے ان کی باتیں لکھا کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے انہیں منع کیا کہ رسول اللہ بھی آخر ایک بشر ہیں، کبھی خوشی اور کبھی ناراضگی کی حالت میں ہوسکتے ہیں، اس لئے آپ کی ہر بات لکھ لینا مناسب نہیں۔ عبداللہ بن عمرو نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے پوچھی اور دریافت کیا کہ "کیا رضامندی اور غضب ہر حالت میں آپ جو کہیں، میں لکھ لوں؟" تو آپؐ نے فرمایا "ہاں! بخدا اس (منہ سے) جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہوتا ہے۔" چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک ہزار حدیثوں کا مجموعہ مرتب کرلیا تھا، جس کا نام "صادقہ" رکھا تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت سعد بن ربیعؓ، حضرت سمرہ بن جندبؓ، حضرت عبداللہ بن ربیعہؓ، اور حضرت موسیٰ اشعریؓ وغیرہ نے حدیثیں لکھیں اور مجموعے مرتب کیے۔

حدیث کی حفاظت کے لئے محدثین کی خدمات گرانبہا ہیں، درست حدیث کی چھان بین کے لئے علم جرح و تعدیل، وجود میں آیا۔ اسی طرح راویانِ حدیث کی پرکھ کے لئے اسماء الرجال نے باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کرلی۔ اس قسم کا علم دنیا کے کسی مذہبی لٹریچر میں نہیں ہے۔

غرض حدیث کی کتابت، اس کی حفاظت اور جمع و تدوین کا آغاز رسول اللہ ﷺ کے

زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ جسے صحابہ کرام نے وسعت دی اور تابعین نے اضافے کیے تاہم صحاح ستہ کے مرتبین نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ جو حدیث کے صحیح ترین ذخائر ہیں۔

مآخذ سوم: اجماع

جمہور فقہاء کے نزدیک کتاب و سنت کے بعد اسلامی قانون کا تیسرا مآخذ "اجماع" کہلاتا ہے۔ کسی حکمِ شرعی پر کسی زمانے میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔ (*Unanimous consent of the mujtahidin*)۔

حجیت اور سند کے لئے دلیل:

فقہا نے اجماع کو دلیل شرعی ثابت کرنے کے لئے قرآن و سنت کے دلائل اور براہین عقلیہ سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ دلیل قرآنی:

(۱) (یعنی) "جو شخص سیدھا راستہ ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایسی راہ اختیار کرے جو مسلمانوں کی نہیں، تو ہم اسے متوجہ رکھیں گے اسی طرف جس طرف وہ متوجہ ہوا ہے، اور داخل کریں گے اسے جہنم میں جو بہت برا ٹھکانا ہے۔" (النساء: ۱۱۵)

(۲) "اے مومنو! اللہ، اس کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو، اور اگر کسی مسئلہ میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔" (النساء: ۵۹)

اس کے علاوہ بھی قرآنی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے بعد اجماع ہی مسلمانوں کا راستہ ہونا چاہیے۔

احادیث کی شہادت:

کئی احادیث ایسی ہیں جن سے "اجماع" کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے "میری امت ضلالت یا گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔" اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ید اللہ مع الجماعۃ یعنی "جماعت کے ساتھ اللہ کی تائید ہوتی ہے۔" (ترمذی)

دلیل عقلی:

ایک عقلی دلیل یہ ہے کہ کسی زمانے کے تمام علمائے مجتہدین کا کسی غلط فیصلے پر جمع ہوجانا عادتاً اور عقلاً ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنی غلطی کا احساس نہ ہو۔

المختصر جن مسائل کے متعلق قرآن وسنت میں یا تو سرے سے کوئی حکم موجود نہ ہو یا ہو تو صریح نہ ہو۔ ایسے مسائل میں تغیرات زمانہ اور فقہائے مجتہدین کی آراء کے زیر اثر اجماع اسلامی قانون سازی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ بعض مستشرقین نے 'اجماع' اور 'اجتہاد' کو ایک ہی مانا ہے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ کوشش اگر فرد واحد کی ہوگی تو اسے "اجتہاد" کہا جائے گا، یہ کوشش اجتماعی طور پر بہت سے علماء کی ہوگی تو "اجماع" کہلائے گا۔

ماٰخذ چہارم: قیاس

جب فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ وسیع ہوا، نئی اقوام، مملکتِ اسلامیہ کی رعایا بنیں تو طرح طرح کے تمدنی اور سیاسی مسائل پیدا ہونے شروع ہوئے جن کے متعلق نہ تو قرآن میں کوئی حکم موجود تھا نہ حدیث میں نہ ہی اس بارے میں اجماع صحابہ کی کوئی نظیر تھی، چنانچہ ان کا حل تلاش کرنے کے لئے فقہا عقل اور رائے کو کام میں لانے پر مجبور ہوئے۔ تاہم اس بارے میں وہ بالکل آزاد نہیں تھے۔

قیاس میں کسی ایک چیز کے حکم کو دوسرے کے لئے قیاس کرتے ہیں۔ مثلاً شراب قرآن کی رو سے حرام ہے، اور اس کی حرمت کا سبب نشہ ہے۔ اب اگر کوئی ایسا مشروب بناتا ہے جس میں نشہ ہو (جو عقل کو ضبط کردے) تو شراب پر قیاس کرکے اس کی حرمت کا حکم بھی لگایا جاسکتا ہے۔

قیاس کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، شیعہ امامیہ اور داؤد ظاہری قیاس کو تسلیم نہیں کرتے البتہ جمہور فقہا اور شیعہ زیدیہ کے نزدیک قیاس قابلِ قبول ہے۔

مخالفین اور موافقینِ قیاس نے اس کے دلیل شرعی ہونے یا نہ ہونے پر لمبے چوڑے دلائل دیئے ہیں تاہم اس وقت اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے قیاس سے کام لیا۔ مثلاً قبیلہ جہینہ کی ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا، میری ماں نے حج کی منت مانی تھی مگر حج کرنے سے پہلے اس کی وفات ہوگئی کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ''ہاں! اس کی طرف سے حج کرو۔ ذرا سوچو اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتیں؟ پس اللہ کا قرضہ بھی ادا کرو کیونکہ اللہ کے قرضے کی ادائیگی سب سے مقدم ہے۔''

اس حدیث سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فریضۂ حج کو ادائیگی قرض کے فریضہ پر قیاس فرمایا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک شرابی کی سزا کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تو حضرت علیؓ نے کہا ''شرابی کو تہمت لگانے والے کی سزا دیجئے، یعنی ۸۰ کوڑے، کیونکہ جب اس نے شراب پی تو اس کو نشہ ہوگا، اور جب نشہ ہوگا تو بیہودہ بکے گا، اور جب بیہودہ کہا تو تہمت لگائی۔'' یہاں شراب پینے کو تہمت لگانے پر قیاس کیا گیا۔

قیاس ہر شخص نہیں کرسکتا، آزادانہ قیاس کی گنجائش نہیں۔ فقہا نے اس کی شرائط بیان کی ہیں۔

مآخذ پنجم: اجتہاد

اسلامی شریعت کے اصل مآخذ قرآن وسنت ہی ہیں، اس کے بعد اجماع صحابہ اور قیاس کو بھی دلائل شرعیہ مانا گیا ہے۔ اجتہاد کی حیثیت ایک ضمنی مآخذ کی ہے جو اول الذکر چاروں مآخذ کے تابع اور ان کی حدود میں رہتے ہوئے راہنمائی کا کام کرتا ہے اور جس کی مدد سے ہر دور میں شریعت کے حقیقی منشا کو سمجھنے اور متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

''اجتہاد'' کے لغوی معنی پوری کوشش (Utmost Struggle) کرنے کے ہیں لیکن اصطلاحاً اس سے مراد وہ کوشش ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لئے کی جائے۔یعنی دین کے سرچشموں سے احکام کے استنباط کی کوشش کرنا۔

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب **الاحکام فی اصول الاحکام** میں اجتہاد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ''اربابِ اصول کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے۔اس انتہائی کوشش کے لئے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان غالب حاصل کرنے کے لئے صرف کی جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔'' (جلد۴،ص ۲۱۸)

امام شاطبی **الموافقات** میں اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں ''اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لئے انتہائی کوشش کا۔'' (جلد۴،ص ۸۹)

حضرت معاذ بن جبل والی مشہور حدیث ہے''......اگر کتاب و سنت سے کوئی واضح احکام نہ ملے تو میں کوشش کر کے اپنی رائے متعین کرنے کی کوشش کروں گا اور اس سعی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔''

یعنی یہ نہیں کروں گا کہ جو خیال دماغ میں آیا اس کے مطابق معاملات کا فیصلہ کر دوں بلکہ اپنے امکان کی حد تک جد و جہد کروں گا،حق کی تلاش کی کوشش کروں گا پھر فیصلہ دوں گا۔ حضرت معاذ کے الفاظ ان لوگوں کے لئے تنبیہ ہیں جو نہ قرآن و حدیث پر عبور رکھتے ہیں، نہ زبانِ عربی پر،لیکن اس کے باوجود اپنے خیالات، مجتہدانہ شان سے پیش کرتے ہیں۔

مجتہد کی شرائط ہیں، ان پر پورا اترنے والا ہی اجتہاد کرے تو بہتر ہے۔نویں صدی عیسوی/تیسری صدی ہجری تک اجتہاد کا دورِ دورہ رہا، اسی کے نتیجے میں مختلف مسالک سامنے آئے، جن میں اختلافات بھی چلتے رہے۔دولتِ عباسیہ کے آخری دور میں اجتہاد کا یہ جوش و خروش کم ہوگیا حتیٰ کہ چھٹی صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوطِ بغداد کے بعد علمائے اہل سنت نے مذہب میں بے جا قطع و برید کے خوف سے باتفاقِ رائے اجتہاد موقوف کرنے اور صرف چار مذاہب کا اتباع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اجتہاد کی ضرورت مسلّم ہے کیونکہ انسانی زندگی برابر نت نئے مسائل سے دو چار ہو رہی ہے۔

❧◆☙

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ خورشید احمد، اسلامی نظریۂ حیات، ص ۳۱۹۔
۲۔ صبحی محمصانی، فلسفۂ شریعتِ اسلام، ص ۱۴۰۔
۳۔ خورشید احمد، اسلامی نظریۂ حیات، ص ۳۲۴۔
۴۔ بک، محمد خضری، تاریخِ فقۂ اسلامی، ص ۳۳۔
۵۔ ایضاً۔
۶۔ ایضاً۔
۷۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب سیاسی و ثیقہ جات نہایت اہم ہے۔

❧◆☙

کتابیات

۱۔ ابن خلدون، مقدمہ، مترجم سعد خان یوسفی، کراچی (سنہ ندارد)۔

۲۔ ابن قیم، علامہ، حافظ، زاد المعاد، مترجم رئیس احمد جعفری، ندوی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء۔

۳۔ ارسطو، سیاسیات، انگریزی سے اردو ترجمہ سیّد نذیر نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء۔

۴۔ آرنلڈ، ٹی، دی لگیسی آف اسلام، اردو ترجمہ میراث اسلام، مترجم عبدالمجید سالک، ترقی اردو ادب، لاہور (سنہ ندارد)۔

۵۔ اصلاحی، صدرالدین، اسلام ایک نظر میں، اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۶۔ اقبال، ڈاکٹر محمد، فلسفۂ عجم، مترجم میر حسن الدین، کراچی ۱۹۶۹ء۔

۷۔ امام بخاری، صحیح بخاری، مترجم امجد العلی و دیگر، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

۸۔ اے۔ جے۔ آربری، میراث ایران، مترجم سیّد عابد علی عابد، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۹۔ بدخشانی، مقبول بیگ، تاریخ ایران (دو جلدیں)، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

۱۰۔ پلوٹارک، مشاہیر یونان و روما، مترجم سیّد علی ہاشمی، ۱۹۱۶ء۔

۱۱۔ ٹائن بی، آرنلڈ، جے، مطالعہ تاریخ (A Study of History) تلخیص ڈی۔ سی۔ سومرویل، مترجم غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء۔

۱۲۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ، کراچ، ۱۹۷۳ء۔

۱۳۔ حتی، فلپ، تاریخ شام، مترجم غلام رسول مہر، طبع اول، ۱۹۶۲ء۔

۱۴۔ دین محمد شفیع، عہدی پوری، فلسفۂ ہندوستان، لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۱۵۔ دیانند سرسوتی، ستیاتھ پر کاش (مستند اردو ترجمہ)، لاہور، ۱۹۲۷ء۔

۱۶۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور، پہلا ایڈیشن۔

۱۷۔ ________، اسلام کا اقتصادی نظام، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۱۸۔ شاہین مکاریوس، تاریخ ایران، مصر، ۱۸۹۰ء۔

۱۹۔ صدیقی، عبدالمجید، عقیدہ ختم النبوت کے چند عمرانی پہلو، طبع اوّل، مرکز مطبوعات اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۴ء۔

۲۰۔ صدیقی، محمد ادریس، وادئ سندہ کی تہذیب، محکمہ آثار قدیمہ، کراچی، ۱۹۵۹ء۔

۲۱۔ طبری، ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ طبری، مولوی سیّد محمد ابراہیم، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن۔

۲۲۔ عابد حسین، ڈاکٹر سیّد، قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۵۵ء۔

۲۳۔ عین الحق، قدیم مشرق، مکتبۂ فریدی، اردو کالج، کراچی، ۱۹۵۸ء۔

۲۴۔ ______، تہذیبیں، طبع اوّل، کراچی، ۱۹۶۶۔

۲۵۔ غزالی، امام محمد، کیمیائے سعادت، اردو ترجمہ، کراچی۔

۲۶۔ ______، احیاء العلوم، مترجم محمد احسن صدیقی، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

۲۷۔ گستاولیبان، تمدن ہند، مترجم سیّد علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور۔

۲۸۔ ______، تمدن عرب، مترجم سیّد علی بلگرامی، لاہور، ۱۹۶۰ء۔

۲۹۔ محمد فواد، عبدالباقی، معجم المفھرس، کراچی۔

۳۰۔ محمد قطب، شبہات حول الاسلام، ترجمہ، اسلام اور جدید ذھین کے شبہات، مترجم محمد سلیم کیانی، لاہور۔

۳۱۔ مصطفیٰ سباعی، اسلامی تہذیب کے چند درخشان پہلو، مترجم سیّد معروف شاہ شیرازی، لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۳۲۔ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، لاہور، ۱۹۶۶ء۔

۳۳۔ ______، تفھیم القرآن (۶ جلدیں)، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۳۴۔ ______، الجھاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۳۵۔ ______، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

۳۶۔ ______، تفھیمات (۴ جلدیں)، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

۳۷۔ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۶ء۔

۳۸۔ ندوی، سیّد سلیمان، خطبات مدراس، کراچی، ۱۹۶۶ء۔

۳۹۔ ________، سیرۃ النبی (جلد۴)، طبع دوئم، لاہور، ۱۹۸۱ء۔

۴۰۔ نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی (جلد۱)، طبع چہارم، اعظم گڑھ، (سنہ ندارد)۔

۴۱۔ ________، الکلام و علم الکلام (۲ جلدیں)، انوار المطابع، لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ۔

۴۲۔ ________، الفاروق، مدینہ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، کراچی۔

۴۳۔ نور احمد، مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے، مترجم رحمٰن مذنب، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۱ء۔

۴۴۔ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، مترجم خلیل احمد اسرائیلی، اسلامی اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۴۵۔ المنجد، دارالاشاعت، کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء۔

۴۶۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، طبع اوّل، لاہور ۱۹۸۹ء تا ۱۹۸۰ء۔

47. Adolf Hitler, ***Mem Kampf***, Boston.

48. Ameer Ali, S., ***Sprit of Islam***, London, 1923.

49. Bernold Girn, ***The Time Table of History***, New York, 1982.

50. Gibbon, ***Decline & Fall of the Roman Empire***, New York.

51. Hurton Hunt, ***Sociology***, 3rd Edition, New York, 1972.

52. Ibn Khaldun, ***The Muqaddimah***, translated by F. Rosenthal, London, 1967.

53. Joseph, H. Fichter, ***Sociology***, University of Chicago Press, 1971.

54. Nehru, J. Lal, ***Discovery of India***, Bombay, 1964.

55. Plato, ***The Statesman***, translated by J. B. Skemp, London, 1961.

56. Robert Bierstedt, ***The Social Order***, 4th Edition, New York, 1974.

57. ________, ***Historians History of the World***, London, 1914.

58. ________, ***Harmsworth History of the World***, London, 1908.

59. ________, ***Encyclopaedia of Social Sciences***, New York, 1951.

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے قلم سے۔۔۔

۱۔	دستِ قاتل (افسانے)	(۱۹۹۵ء)
۲۔	بارِ ہستی (افسانے)	(۲۰۰۰ء)
۳۔	جدید ترکی	(۲۰۰۱ء)
۴۔	سوادِ شام سے پہلے (شاعری)	(۲۰۰۱ء)
۵۔	دشتِ امکاں (سفرنامہ نجد و حجاز)	(۲۰۰۳ء، طبع ثانی، ۲۰۰۹ء)
۶۔	قرنِ اولیٰ کا ایک مدبر: مختار ثقفی	(۲۰۰۴ء، طبع ثانی، ۲۰۱۴ء)
۷۔	عرب اور موالی (ایوارڈ یافتہ)	(۲۰۰۶ء، طبع ثانی، زیرِ طبع)
۸۔	سیرت نگاری: آغاز و ارتقاء (سیرت ایوارڈ یافتہ)	(۲۰۱۰ء)
۹۔	شعوبیت۔ایک مطالعہ	(۲۰۱۱ء)
۱۰۔	خوارج۔ایک مطالعہ (ایوارڈ یافتہ)	(۲۰۱۲ء، طبع ثانی، ۲۰۱۵ء)
۱۱۔	ماتم یک شہر آرزو (افسانے)	(۲۰۱۵ء)
۱۲۔	اسلام میں غلامی کا تصور	(۲۰۱۶ء)
۱۳۔	اذنِ سفر دیا تھا کیوں (سفرنامہ ایران)	(۲۰۱۶ء)
۱۴۔	نقوشِ یادِ رفتگاں	(زیرِ طبع)
۱۵۔	عراق: اک لالۂ صحرائی	(زیرِ طبع)

Price: Rs. 340/-

9 789698 448714